www.KitaboSunnat.com
مختصر زاد المعاد
تالیف
شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب
رحمہ اللہ تعالیٰ
ترجمہ
سعید احمد قمر الزمان الندوی
دار السلام
پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

وزارت اسلامی امور واوقاف ودعوت وارشاد کی شائع کردہ
بتعاون موسسۃ ابراہیم بن عبدالعزیز آل ابراہیم الخیریہ

علامہ ابن القیم کی مشہور تصنیف "زاد المعاد"

مختصر زاد المعاد

تالیف

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب

رحمہ اللہ تعالیٰ

ترجمہ

سعید احمد قمر الزمان الندوی

ح وزارة الشؤون الاسلامية ، ١٤١٧هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
محمد بن عبدالوهاب بن سليمان
مختصر زاد المعاد - الرياض.
٣٩٢ ص ، . . سم ١٧×٢٤سم
ردمك ٦-١٠٠-٢٩-٩٩٦٠
(النص باللغة الأردية)
١- السيرة النبوية أ- العنوان
ديوي ٢٣٩ ١٧/٠٧٦٦

رقم الإيداع : ١٧/٠٧٦٦
ردمك : ٦-١٠٠-٢٩-٩٩٦٠

www.KitaboSunnat.com
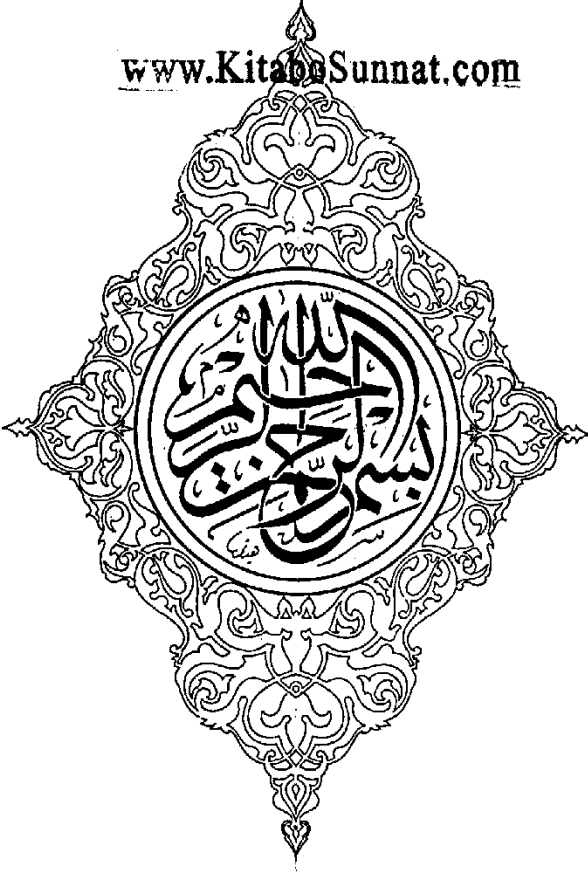
شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

فہرست مضامین

مقدمہ

سرور کائنات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ایسا سدا بہار موضوع ہے جس پر بے شمار لوگوں نے مختلف زبانوں میں لکھا ہے اور قیامت تک اس سعادت عظمیٰ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ چونکہ یہ موضوع ایسا دل آویز اور جاذب نظر ہے کہ ان گنت سیرت نگاروں کی تحریریں، مختصر اور کئی ضخیم تالیفات سامنے آچکی ہیں، اس کے باوجود کبھی مضمون کی خشکی اور عدم دلچسپی کی شکایت پیدا نہ ہو سکی اور نہ کبھی پیدا ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے اتنے گوشے ہیں اور ہر گوشے کے اتنے پہلو ہیں کہ کبھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس موضوع کا حق ادا کر دیا گیا اور اس بحر ناپیدا کنار سے سارے موتی نکال لئے گئے ہیں، چنانچہ ان خدمات و جذبات کے نتیجے میں ایسا گرانقدر ذخیرہ تیار ہو گیا، جس کی نظیر سیرت و سوانح کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس بے انتہا کثرت کے باوجود ایسی کتابیں معدودے چند ہی تھیں، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو ایسے انداز سے پیش کیا گیا ہو جو ایک مسلمان کے لئے اسوہ حسنہ و لائحہ عمل ثابت ہو، کیونکہ آپ کی ذات گرامی ہر مسلمان کے لئے اسوہ حسنہ، دلیل منزل، شمع راہ، اسلامی تعلیمات اور ہدایات کا مکمل نمونہ ہے اور جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے نہ ہو اس وقت تک نہ ہم اسلام کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ صحیح طور پر اس پر عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہی سعادت و ہدایت اور کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ خود قرآن حکیم نے اپنے اس فرمان سے اس کی نشاندہی کی ہے، ارشاد خداوندی ہے :

﴿ لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ [الأحزاب : ۲۱]

درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

اس لئے اسوہ حسنہ کے ہم اس وقت تک رمز شناس نہیں ہو سکتے جب تک آپ کی حیات طیبہ کے تمام پہلو ہمارے سامنے نہ ہوں۔

اور سیرت نبویہ علیہ الصلاۃ والسلام کے اس بحر زخار میں علامہ و امام ابن القیم رحمتہ اللہ علیہ کی تالیف "زاد المعاد فی ھدی خیر العباد" سرفہرست رکھی جانے والی عظیم الشان کتاب ہے، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو بطور اسوہ و نمونہ پیش کرنے کی قابل قدر کوشش ہے اور جس میں پوری جامعیت اور پوری تحقیق کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کی توضیح کی گئی ہے۔

چنانچہ مذکورہ کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ، اسوہ حسنہ، شب و روز کے معمولات، عادات، اخلاق، خصائل و شمائل، صفات و غزوات پر مشتمل انسائکلو پیڈیا (ENCYCLOPAEDIA) قرار دیا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا۔ اس میں قرآن کی تفسیر بھی ہے، حدیث کی تشریح بھی، اور راویان حدیث پر جرح و تعدیل بھی اور ان سے مستنبط فقہی مسائل بھی۔

اس وسیع تر معنویت، افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے زاد المعاد واقعتاً زاد المعاد ہی ہے، یعنی توشہ آخرت۔ یہ کتاب اپنے انہی مجموعی محاسن کی وجہ سے ہمیشہ اہل علم کے حلقوں میں محبوب و مقبول رہی ہے۔

پیش نظر کتاب کی اس اہمیت و افادیت کی وجہ سے ایک عرصہ سے دل میں آرزو تھی کہ اردو میں بھی کوئی ایسی ہی کتاب سیرت نبویہ پر قلمبند کی جائے جس میں داعی اسلام کی حیات طیبہ کو اس طور سے پیش کیا جائے کہ ہر پڑھنے والے کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجموعی زندگی آ جائے کیونکہ ہمارے عوام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت تو بہت زیادہ رکھتے ہیں مگر ان کی اکثریت آپ کے اسوہ حسنہ کے خصوصاً اُن پہلوؤں سے بالکل ناآشنا ہے جن کے بارے میں ایک مسلمان کو شب و روز ضرورت پڑتی ہے اور جن پر عمل کئے بغیر کوئی شخص سچا مومن نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی تلافی اس کتاب کے ترجمہ سے پوری ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اردو زبان میں اسلامی علوم و معارف کا بیش بہا خزانہ موجود ہے، لیکن اس کتاب کے ترجمہ سے ایک قابل قدر اور قیمتی سرمائے کا اضافہ ممکن ہے۔

یہ کتاب (زاد المعاد) چونکہ اپنی ضخامت و طوالت کے باعث ہر شخص کے مطالعہ میں بآسانی

نہیں آسکتی اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس کو مختصر کیا جائے اور وہ تمام مباحث نکال دیئے جائیں جو زیادہ تر علماء و محققین کے اختصاصات میں سے ہیں تاکہ براہ راست عوام بھی اس سے فیضیاب ہو سکیں۔

تاہم خوشگوار امر یہ ہے کہ اس ضرورت کو شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمتہ اللہ علیہ نے بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے پورا کر رکھا تھا' اب محض اس کو اردو میں منتقل کرنے کا مرحلہ باقی تھا' چنانچہ مَیں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرکے اس مختصر مگر جامع انتخاب جو "مختصر زادالمعاد" کے نام سے متعدد بار شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے اور محمد بن عبدالوہاب رحمتہ اللہ علیہ کے حسن انتخاب اور حسن ترتیب کے ساتھ ساتھ ان کے عقیدہ و عقیدت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ان کی محبت و اطاعت کا بے مثل شاہکار ہے نیز اصل ماخذ ہی کی طرح مقبول عام رہی ہے' پورے عزم و حوصلے اور عقیدت و محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر شروع کر دیا اور آج بحمد اللہ میں بجا طور پر فخر و مسرت کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس معرکتہ الآراء و مفید کتاب کا اُردو ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ یہ کاوش عام قارئین کے ساتھ ساتھ علمی و فکری حلقوں میں بھی قدر و عزت اور اعتراف و قبولیت کی نظروں سے دیکھی جائے گی۔

میں اپنی اس حقیر کوشش کو محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں خراج عقیدت تصور کرتا ہوں اور دلی تمنا رکھتا ہوں کہ اس کے ذریعہ سے آپ کے سوانح نگاروں کی فہرست میں کسی جگہ اس خاکسار کا نام بھی آجائے۔ "گر قبول افتد زہے عز و شرف"۔

نیز اس ذہنی کاوش اور علمی خدمت سے قوی امید رکھتا ہوں کہ یہ میرے لئے سرمایہ حیات' صدقہ جاریہ اور زادالمعاد یعنی توشہ آخرت ثابت ہو جائے گی۔

آخر میں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق ارزانی کرے اور اسے ہماری اُخروی زندگی کے لئے بہترین زاد راہ و شمع ہدایت بنائے۔ آمین!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، وَصَلَّى اللهُ عَلَى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ.

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمتہ اللہ علیہ کے مختصر حالات زندگی

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان التمیمی رحمتہ اللہ علیہ شہر عیینہ میں' جو مملکت سعودی عرب کے دارالسلطنت ریاض کے شمال کی طرف واقع ہے' ۱۱۱۵ھ میں خانوادہ علم و فضل میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے۔

آپ کے والد ماجد علم و فضل' تقویٰ و طہارت' خلق و حیا اور بے شمار صفات حسنہ سے متصف تھے اور قاضی شہر تھے۔ آپ کے دادا شیخ سلیمان علاقہ کے مفتی اعظم تھے اور ان کا شمار اکابر علماء میں ہوتا تھا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد سے حاصل کی پھر تحصیل علوم اسلامیہ کے ارادے سے مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ اور بصرہ وغیرہ کے سفر کئے اور وہاں کے علماء و مشائخ سے مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی' اس کے بعد اپنے وطن واپس آ کر دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تدریس میں پوری طرح مشغول ہو گئے۔

آپ کو بچپن ہی سے علماء سلف کی کتابوں کے مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ خاص طور پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد رشید علامہ ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ کی تصانیف کا بڑے شوق و انہماک سے مطالعہ کرتے تھے۔

عہد طفولیت ہی سے آپ پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جذبہ غالب تھا' چنانچہ آپ لوگوں کو کتاب و سنت پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کی تاکید کرتے تھے اور خاص طور پر ان بدعات اور رسومات کو چھوڑنے کی ترغیب دیتے تھے جنہیں بدعقیدہ لوگوں نے عوام میں دین کے نام سے پھیلا رکھا تھا۔

امام موصوف نے مسائل توحید اور اس زمانے میں رواج پا جانے والی شرکیہ رسوم کے متعلق علماء عصر سے مباحثے کئے' لہٰذا متعدد علماء آپ کے قائل اور ہم خیال ہوئے' اس طرح وعظ و تبلیغ اور خطبات سے عوام الناس میں دینی بیداری پیدا فرمائی اور اتباع سنت کا جذبہ پیدا کیا۔

نیز مختلف امراء اور حکام کو اصلاحی خطوط لکھے جن میں دعوت الی اللہ کی وضاحت فرمائی اور شرک و بدعات کی برائیاں بیان کیں' دلائل و براہین سے اسلام کی حقانیت کو ثابت فرمایا اور احکام شریعت کے نفاذ

کی دعوت دی۔

اس دعوت و صراحت کی وجہ سے بعض علماء و امراء آپ کے سخت مخالف ہو گئے جس کے باعث آپ اپنا وطن عیینہ ۱۱۵۷ھ میں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور مقام درعیہ کی طرف ہجرت کر گئے، جہاں محمد بن سعود کے ساتھ کتاب و سنت کے نفاذ اور اس سلسلہ میں جہاد کرنے پر معاہدہ فرمایا، اور پوری طرح دعوت و تبلیغ اور شرک و بدعت کو ختم کرنے میں مشغول ہو گئے، آپ کی ان کوششوں کے نتیجہ میں نجد کی سرزمین توحید سے منور ہوئی اور عوام توحید سے سرشار اور شرک و بدعت سے بیزار نظر آنے لگے۔

تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی دعوت کے اثرات و برکات جزیرہ العرب، یمن، مصر و شام و مراکش اور برصغیر تک پہنچ گئے۔ عام مسلمانوں میں اصلاح عقیدہ کے سلسلہ میں بیداری پیدا ہوئی اور صحیح العقیدہ لوگ آپ ہی کی طرف منسوب کئے جانے لگے۔

آپ نے بہت سی مفید کتابیں تالیف کیں، جن میں اکثر و بیشتر توحید کی دعوت اور شرک کی تردید پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں سے چند مشہور تصانیف یہ ہیں :

۱ - کتاب التوحید۔
۲ - مختصر سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔
۳ - مختصر زاد المعاد (پیشِ نظر کتاب)۔
۴ - الاصول الثلاثۃ وادلتھا۔
۵ - مسائل الجاھلیتہ۔
۶ - کشف الشبہات۔
۷ - الخطب المنبریہ۔
۸ - عقیدہ الفرقتہ الناجیہ۔
۹ - اوثق عری الایمان۔
۱۰ - تفسیر آیات القرآن الکریم۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد کتابیں اور رسائل و فتاوی ہیں، جو شائع ہو چکے ہیں۔

آپ کی وفات سعودی عرب کے شہر ریاض کے قریب مقام درعیہ میں ۱۲۰۶ھ میں ہوئی۔

علامہ ابن القیم رحمتہ اللہ علیہ کا مختصر تعارف

علامہ و امام ابن القیم کی سوانح عمری یا تعارف کے لئے چند اوراق ناکافی ہیں' تاہم یہاں طوالت سے صرف نظر کرتے ہوئے مختصراً آپ کی حیات مبارکہ کے چند اہم اور روشن اوراق پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آپ کا پورا نام محمد بن ابوبکر بن ایوب بن سعد حریز الزرعی الدمشقی شمس الدین المعروف بابن القیم الجوزی ہے' جوزیہ ایک مدرسہ کا نام تھا' جو امام جوزی کا قائم کردہ تھا' اس میں آپ کے والد ماجد قیم یعنی نگران اور ناظم تھے اور علامہ ابن القیم بھی اس سے ایک عرصہ منسلک رہے۔

علامہ ابن القیم ۶۹۱ ھ میں پیدا ہوئے اور علم و فضل اور ادب و اخلاق کے گھوارے میں پرورش پائی' آپ نے مذکورہ مدرسہ میں علوم و فنون کی تعلیم و تربیت حاصل کی' نیز دوسرے علماء سے استفادہ کیا جن میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا نام گرامی سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر ہے۔ ان کے شاگرد رشید کی حیثیت سے زندگی بھر رفیق صادق' قید خانہ کے ساتھی' میدان جہاد میں ان کے دوش بدوش اور استاذ کے بعد ان کے علوم کو نہایت قیمتی اضافہ کے ساتھ بہترین اسلوب پر شائع کرنے والے تھے۔

متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بعد ابن القیم کے پائے کا کوئی محقق نہیں گذرا' آپ فن تفسیر میں اپنا جواب آپ تھے' اصول دین کے رمز شناس تھے' حدیث و فقہ میں نہایت گہری نظر رکھتے تھے' استنباط و استخراج مسائل میں یکتائے روزگار تھے' آداب سحر گاہی سے آشنا اور نہایت عبادت گذار تھے' مصیبتوں اور ابتلاؤں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے' صبر و شکر کے زیور سے آراستہ و پیراستہ تھے' شعر و ادب کا اعلیٰ اور عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ آپ ایک ماہر طبیب بھی تھے۔

علماء طب کا بیان ہے کہ علامہ موصوف نے اپنی کتاب "طب نبوی" میں جو طبی فوائد' نادر تجربات اور بیش بہا نسخے پیش کئے ہیں' وہ طبی دنیا میں ان کی طرف سے ایک ایسا اضافہ ہیں کہ طب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

قاضی برہان الدین کا بیان ہے کہ :

"اس آسمان کے نیچے کوئی بھی ان سے زیادہ وسیع العلم نہ تھا"۔

علامہ کے رفیقِ درس حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"ابن القیم رحمتہ اللہ علیہ نے حدیث کی سماعت کی اور زندگی بھر علمی مشغلہ میں مصروف رہے' اُنہیں متعدد علوم میں کمال حاصل تھا۔ خاص طور پر علمِ تفسیراور حدیث وغیرہ میں غیر معمولی دستگاہ تھی' چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں یگانہ روزگار بن گئے' وہ اللہ کی عبادت و انابت کی صفت سے اس قدر متصف تھے کہ شاید ہی اس دور میں ان سے زیادہ کوئی عبادت گذار رہاہو' استاذ محترم شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے علوم کے صحیح وارث اور ان کی مسند تدریس کے کماحقہ جانشین تھے"۔

چنانچہ علامہ موصوف نے اپنے استاذ گرامی کی علمی خدمات اور علمی کارناموں کی توسیع و اشاعت میں غیر معمولی حصہ لیا' ان کی طرف دعوت و دفاع کا فریضہ سرانجام دیا اور اس کی تائید کے لئے تحقیق و تنقیح کی پوری کوشش کی' ان کی فقہی تحقیقات اور ان کے فتاویٰ و اصول کو بڑی عرق ریزی سے جمع کیا' بلکہ مزید تحقیق و محنت سے قرآن و سنت کے دلائل سے مدلل کیا۔

اس طرح علامہ محترم نے بہت بڑا علمی ذخیرہ چھوڑا ہے جو ایک طرف علامہ ابن تیمیہ کے علم کا خلاصہ ہے اور دوسری طرف استاذ کی تحقیقات کے نتائج و ثمرات میں علمی توجیہات کا بہترین لب لباب بھی ۔ انہوں نے مختلف فنون و علوم پر قابل قدر کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں فکر کی گہرائی ' قوت استدلال ' حسن ترتیب اور جوش بیان پورے طور پر نمایاں ہے ' ان کتابوں میں کتاب و سنت کا نور اور سلف کی حکمت و بصیرت موجود ہے۔

ایک پہلو جو خاص طور پر ان کی کتابوں کے مطالعہ سے ان کی شخصیت اور عقیدے کے متعلق واضح ہوتا ہے' وہ ہے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی محبت شیفتگی اور بدعت کی سخت مخالفت ' جو چیز انہیں سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق نظر آتی ہے ' اسے دل و جان سے قبول کر لیتے ہیں ' جو چیز سنتِ رسول کے خلاف نظر آتی ہے' اسے جڑ سے اکھاڑ ڈالنے میں اپنی پوری توانائی صرف کر دیتے ہیں۔اس سلسلہ میں وہ نہ کسی کے ساتھ رعایت کرتے ہیں ' نہ مصالحت اور نہ رواداری ' ان کا دل حُبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نشہ سے سرشار تھا لیکن ان کی یہ محبت حدود سے تجاوز نہیں کرتی تھی ۔ وہ کسی صورت اور کسی حیثیت میں بھی حُبِ رسول کو جذبہ توحید سے متصادم نہیں ہونے دیتے

تھے' ان کی توحید اتنی شدید' خالص اور واضح تھی کہ ان کے دشمنوں نے انہیں ہدف ستم بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا' انہیں طرح طرح سے تکلیفیں دی گئیں' ان پر ناروا پابندیاں عائد کی گئیں' نظر بندی و جلاوطنی کے مصائب سے دوچار کیا گیا' انہیں قید و بند کی صعوبتوں سے گذارا گیا لیکن ان کے عزم واستقامت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔

علامہ کی چند مشہور و مقبول تصانیف یہ ہیں :

(۱) تہذیب سنن ابی داؤد (۲) اعلام الموقعین (۳) مدارج السالکین (۴) زاد المعاد (۵) عدۃ الصابرین وذخیرۃ الشاکرین (۶) مفتاح السعادۃ (۷) الفوائد (۸) الوابل الصیب (۹) تحفتہ المودود فی احکام المولود (۱۰) الصواعق المنزلتہ علی الجھمیۃ والمعطلتہ (۱۱) حادی الارواح (۱۲) الصراط المستقیم (۱۳) جلاء الافہام فی ذکر الصلاۃ والسلام علی خیر الانام (۱۴) شفاء العلیل۔

ان کے علاوہ بھی کئی ایک گرانقدر تصنیفات ہیں' جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

آپ کی وفات ۱۳ رجب ۷۵۱ھ میں ہوئی اور دمشق کے باب صغیر کے مقبرہ میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو درجات عالیہ اور رحمت ابدی سے نوازے۔ آمین!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ امام ابن القیم

اَلْحَمْدُ للهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى أَشْرَفِ الأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ، وَالْقَائِلِ فِيْهِ - سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ، وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلَى يَوْمِ الدِّيْنِ. أَمَّا بَعْدُ:

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک تمام مخلوقات کی تنہا خالق اور مختار کل ہے' جیسا کہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے :

﴿ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ سُبْحَٰنَ ٱللَّهِ وَتَعَٰلَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴾ [القصص : ٦٨]

تمہارا رب جو چاہتا ہے' پیدا کرتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ ان کا اس میں کوئی اختیار نہیں' اللہ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔

اس آیت کریمہ میں اختیار سے مراد منتخب اور برگزیدہ بنانا ہے اور ارشاد باری مَا كَانَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ کا مفہوم یہ ہے کہ اس اختیار میں بندوں کا کوئی دخل نہیں ہے' جس طرح اللہ تعالیٰ نے تنہا مخلوقات کو پیدا کیا' اسی طرح وہ مقامات کو بھی بخوبی جانتا ہے' جیسا کہ اس کا ارشاد گرامی ہے :

﴿ ٱللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُۥ ﴾ [الأنعام : ١٢٤]

اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں نازل فرمائے۔

﴿ وَقَالُوا۟ لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ ٱلْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ○ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ ﴾ [الزخرف : ٣١، ٣٢]

اور ان لوگوں نے کہا کیوں نہیں نازل کیا گیا یہ قرآن ان دو شہروں کے کسی بڑے آدمی پر' کیا وہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنے والے ہیں' ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کر

رکھی ہے اور بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے درجوں کے اعتبار سے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اختیار کی حیثیت کا انکار فرمایا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ یہ صفت انہیں حاصل نہیں بلکہ یہ صفت تو اس کی ہے جس نے ان کے معاش یعنی رزق کو تقسیم کر رکھا ہے اور بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ﴿ سُبْحَٰنَ ٱللَّهِ وَتَعَٰلَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴾ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ مشرکین کا شرک جس اختیار و تجویز کا متقاضی ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک و صاف ہے' اور چونکہ ان مشرکین کے اس طرح کے شرک سے کسی دوسرے خالق کا وجود نہیں ثابت ہوتا' اس لئے آیت میں اس کی تردید نہیں کی گئی' اس کے بعد ایک اور آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ فَأَمَّا مَن تَابَ وَءَامَنَ وَعَمِلَ صَٰلِحًا فَعَسَىٰٓ أَن يَكُونَ مِنَ ٱلْمُفْلِحِينَ ﴾

[القصص : ٦٧]

البتہ جو شخص توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کیا کرے تو امید ہے ایسے لوگ فلاح پانے والوں میں سے ہوں گے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا اور ان میں سے انبیاء کرام کو منتخب فرمایا' یہ انتخاب و اختیار اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے۔ اس میں کسی دوسرے کے مشوروں اور انتخاب و اختیار کا کوئی دخل نہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ انتخاب عام سارے عالم میں اس کی ربوبیت کی عظیم ترین نشانیوں میں سے ہے اور اس کی وحدانیت' صفات کمال اور رسولوں کی سچائی کی کھلی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں میں بھی کچھ کو منتخب اور برگزیدہ بنایا ہے' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

اے اللہ' جبرائیل و میکائیل اور اسرافیل کے پروردگار' زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے' حاضر و غیب کے جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے اختلافات کا فیصلہ کرے گا۔ جس حق کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے' تو اس میں میری رہنمائی فرما جس میں لوگوں کا اختلاف ہو گیا' تو جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرات انبیاء علیہم السلام کو منتخب فرمایا اور پھر ان انبیاء کرام سے رسولوں کو اور ان رسولوں میں سے ان پانچ اولوالعزم کو منتخب فرمایا' جن کا

تذکرہ سورہ احزاب آیت ۷ اور سورہ شوریٰ آیت ۱۳ میں موجود ہے' پھر ان میں سے اللہ تعالیٰ نے بطور خاص حضرت ابراہیم اور حضرت محمد علیہما الصلاۃ والسلام کو خلیل منتخب فرمایا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی اولاد میں اسماعیل علیہ السلام اور بنی کنانہ میں قریش کو اور قریش میں بنی ہاشم کو اور آخر میں بنی ہاشم میں سے سارے انسانوں کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب فرمایا اور آپ کی امت کو ساری امتوں میں بہترین امت کے طور پر منتخب فرمایا ہے۔

مسند احمد میں معاویہ بن حیدہ سے مرفوعا روایت ہے کہ: "تم سترویں امت ہو اور تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر اور باعزت ہو"۔

مسند بزار میں ابی الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعا روایت ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے فرمایا کہ میں تمہارے بعد ایسی امت بھیجوں گا جو مسرت و خوشی کے وقت حمد و شکر سے' اور مصیبت و تکلیف کے وقت صبر و احتساب سے کام لے گی جب کہ کوئی علم و حلم نہ ہوگا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ ایسا کس طرح ہوگا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں انہیں اپنا علم اور حلم عطا کر دوں گا"۔

فصل (۱)

اللہ تعالیٰ کو اپنے لئے پاکیزہ چیزیں پسند ہیں

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم میں سب سے زیادہ پاکیزہ چیز کا انتخاب فرمایا ہے اور اپنے لئے اسے مخصوص فرمالیا اور اختیار کرلیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود پاکیزہ ہے اور پاکیزہ چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ اس کی بارگاہ میں پاکیزہ و طیب ہی قول و عمل اور صدقہ و خیرات شرف قبولیت سے نوازے جاتے ہیں۔ اسی سے بندہ کی سعادت و شقاوت کا فرق معلوم ہوتا ہے' کیوں کہ پاکیزہ شخص کے لئے پاکیزہ چیز ہی مناسب و موزوں ہوگی اور اسی سے اس کو سکون و اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جو کلام بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں پیش ہوتا ہے' اس کا بھی طیب اور پاکیزہ ہونا ضروری ہے۔ وہ فحش کلام' جھوٹ' غیبت' چغلی' بہتان طرازی' جھوٹی گواہی اور بیہودہ کلام سے سخت متنفر ہوتا ہے۔

اور یہی حال اعمال کا ہے۔ وہ اعمال حسنہ سے مانوس ہوتا ہے جس کے حسن و خوبی و پاکیزگی پر شریعت محمدی اور طبیعت سلیمہ و عقل صحیح مطمئن اور متفق ہوں' مثلاً صرف خدائے واحد کی عبادت کی جائے' اس کا کسی کو شریک نہ مانا جائے' اپنی خواہشات کو اس کے تابع کیا جائے' اور پوری جد و جہد کے ساتھ اس کی رضامندی حاصل کی جائے۔ اس کی مخلوقات سے بقدر استطاعت احسان کیا جائے اور دوسروں سے وہی سلوک کرے جس سلوک کا اپنے لئے اس سے توقع اور پسند کرتا ہے۔ اسی طرح اخلاق بھی انتہائی پاکیزہ اور اعلیٰ ہونا چاہیے مثلاً بردباری' وقار' صبر و رحم' وفا اور سچائی' صفائی قلب' تواضع' خودداری' نرم مزاجی وغیرہ۔ یہ وہ صفات اخلاقیہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہیں۔ اسی طرح پاکیزہ خورد و نوش کا اہتمام یعنی بندہ ایسی حلال و خوشگوار غذاء استعمال کرے جس سے جسم و روح کو فائدہ حاصل ہو اور جذبہ بندگی بھی سلامت رہے۔

اسی طرح مناکحت اور ازدواجی رشتے کو بھی پاکیزہ و طیب لوگوں کے ساتھ استوار کرے اور احباب

اور ہم نشینوں کا انتخاب اسی اصول پر ہو۔

ان اعمال حسنہ اور پاکیزہ اخلاق و ستودہ صفات سے متصف لوگوں کی مثال دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی ہے :

﴿ ٱلَّذِينَ تَتَوَفَّىٰهُمُ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلَـٰمٌ عَلَيْكُمُ ٱدْخُلُوا۟ ٱلْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾

[النحل : ٣٢]

وہ لوگ جنہیں فرشتے پاکیزگی کی حالت میں وفات دیں گے اور کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو' اپنے نیک عمل کی وجہ سے تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔

اور قیامت کے دن جنت کے فرشتے خوش آمدید کہتے ہوئے کہیں گے :

﴿ سَلَـٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَٱدْخُلُوهَا خَـٰلِدِينَ ﴾ [الزمر : ٧٣]

تم پر سلامتی ہو' خوش رہو' اور جنت میں ہمیشہ کی زندگی بسر کرو۔

آیت مذکورہ میں ﴿ فَٱدْخُلُوهَا ﴾ میں حرف "فاء" سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جنت میں دخول کا سبب ان کی پاکیزگی ہے۔ ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ ٱلْخَبِيثَـٰتُ لِلْخَبِيثِينَ وَٱلْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَـٰتِ ۖ وَٱلطَّيِّبَـٰتُ لِلطَّيِّبِينَ وَٱلطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَـٰتِ ۚ أُو۟لَـٰٓئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۖ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴾ [النور : ٢٦]

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے' پلید مرد پلید عورتوں کے لئے' پاکیزہ عورتیں پاک مردوں کے لئے اور پاک مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے پاک ہیں جو (منافق) بکتے پھرتے ہیں' ان کے لئے مغفرت ہے اور رزق کریم۔

اس آیت کی تفسیر میں بتایا گیا ہے کہ خبیثوں کی باتیں بھی خبیث اور پاکیزہ لوگوں کی باتیں بھی پاک و صاف ہوتی ہیں اور یہ تفسیر بھی بیان کی جاتی ہے کہ پاکیزہ عورتیں پاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک و پلید عورتیں ناپاک و خبیث مردوں کے لئے ہیں۔ اس آیت کا مطلب عمومی حیثیت رکھتا ہے' کسی خاص معنی کے لئے تخصیص نہیں کی جا سکتی پھر اللہ تعالیٰ نے تمام پاکیزہ چیزوں کے لئے جنت اور تمام گندی و پلید چیزوں کے لئے جہنم کو مخصوص کیا ہے اور اس دنیا میں پاکیزہ اور ناپاک دونوں باہم مخلوط ہیں لیکن جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ پاک اور ناپاک کو علیحدہ علیحدہ کردے گا اور صرف دو ٹھکانے باقی رہ جائیں گے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے نیکی و بدبختی کی علامت و نشان فرق بتایا ہے جس سے ان کو پہچانا جاتا ہے (یعنی پاک طینت کو اعمال صالحہ کے ذریعہ اور بد باطن کو اعمال بد کے ذریعہ) 'کبھی کبھی ایک انسان میں دونوں طرح کی عادتیں اور مادے ہوتے ہیں لہٰذا اس پر جس طرح کے مادے کا غلبہ ہوگا' وہ اسی قبیل سے ہوگا' اگر اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو موت سے پہلے اسے گناہوں سے پاک کر دیتا ہے اور اسے پاک ہونے کی خاطر دوزخ میں جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی آدمی اس کے جوار رحمت (جنت) میں گناہوں کی نجاست لے کر نہ آئے گا' اس لئے وہ پاکیزگی کے لئے برے آدمی کو دوزخ میں داخل کر دیتا ہے تاکہ اسے طہارت و صفائی و پاکیزگی حاصل ہو جائے اور اس قسم کے لوگوں کا دوزخ میں قیام ان کی معصیت اور گناہوں کی کثرت و قلت پر منحصر ہوگا۔

چونکہ مشرک نجس عین ہے لہٰذا اس کو آتش جہنم پاک و صاف نہیں کر سکے گی جس طرح ایک کتا سمندر سے نکل کر بھی نجس ہی رہتا ہے' اور جب پاکیزہ صفت مومن نجاستوں سے پاک و صاف ہو جائے گا تو آگ اس پر حرام ہوگی کیوں کہ اس میں کوئی خرابی نہیں جسے زائل کرنے کے لئے آگ کی ضرورت ہو۔

پاک ہے وہ ذات جس کی حکمت عقل و دانش سے بالا تر ہے۔

فصل (۲)

معرفت سنت کی ضرورت

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت اور اطاعت کس قدر ضروری ہے کیونکہ طیب اور خبیث کی پوری معرفت کا ذریعہ بجز آپ کے اور کوئی نہیں۔ بندے کی ضرورتوں میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ ناگزیر ضرورت یہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے بخوبی واقف ہو' کیونکہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی و سیرت طیبہ ہماری نظروں سے ایک لمحہ کے لئے اوجھل ہوئی تو اس سے فساد شروع ہو جائے گا' لیکن اس کا احساس زندہ دل لوگوں ہی کو ہوتا ہے' مردہ دلوں کے لئے احساس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' چونکہ سعادت دارین کا دارومدار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ پر ہے' اس لئے نجات و سعادت کے خواہشمندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپ کی سیرت مبارکہ و سنت طیبہ سے واقف ہوں تاکہ جہالت کے دائرہ سے نکل سکیں اور کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو بالکل ہی محروم ہیں' کچھ وہ ہیں جو تھوڑے پر اکتفاء کر رہے ہیں اور بعض خوب خوب سعادت سے بہرہ ور ہیں۔ یہ فضل و کرم اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے' جسے چاہتا ہے دیتا ہے' اور وہ بڑا عظیم اور فضل والا ہے۔

فصل (۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وضوء کا طریقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لئے اکثر الگ وضوء فرماتے تھے' کبھی ایک ہی وضوء سے کئی کئی نمازیں پڑھ لیتے' کبھی ایک مُد[1] سے کبھی دو تہائی مُد سے اور کبھی اس سے زیادہ سے وضوء فرماتے تھے' اور امت کو بھی ہمیشہ وضوء میں اسراف سے منع فرماتے تھے' اور آپ بنفس نفیس وضوء کا پانی کم سے کم خرچ فرماتے تھے۔ آپ نے وضوء میں اعضاء کو ایک مرتبہ' دو دو مرتبہ اور تین تین مرتبہ دھویا ہے اور بعض اعضاء دو مرتبہ اور بعض کو تین مرتبہ بھی دھونا آپ سے ثابت ہے۔

کبھی آپ ایک ہی چلو سے کئی بار کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈالتے اور کبھی دو یا تین چلوؤں سے بھی ایسا فرما لیتے' آپ کلی اور ناک میں پانی دونوں ایک ساتھ ڈالتے تھے' دائیں ہاتھ سے ناک میں پانی ڈالتے اور بائیں ہاتھ سے ناک صاف کرتے۔

آپ پورے سر کا مسح فرماتے تھے اور کبھی دونوں ہاتھ آگے لے آتے اور پھر پیچھے لے جاتے۔ یہ ثابت نہیں کہ کبھی سر کے بعض حصہ پر مسح کیا ہو اور بعض کو چھوڑ دیا ہو' البتہ جب کبھی عمامہ بندھا ہونے کی وجہ سے اول سر کا مسح کرتے تو باقی سر کا عمامہ ہی پر سے ہاتھ پھیر کر مسح کر لیتے۔

ہر وضوء میں آپ سے کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ثابت ہے۔ ان دونوں چیزوں کو آپ نے کبھی ترک نہیں فرمایا۔

امام ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں بہت سی جگہ پر کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کے وجوب کی وضاحت کی ہے' اور اس طرح سے وضوء میں ترتیب اور پے در پے کرنا ضروری ہے' کبھی اس کے خلاف ثابت نہیں ہے۔

جب پیروں پر چمڑے کے موزے یا عام موزے نہ ہوتے تو آپ انہیں دھوتے تھے اور سر کے مسح کے ساتھ آپ دونوں کانوں کے اندرونی اور بیرونی حصوں کا بھی مسح کرتے تھے۔

---

(۱) مُد: تقریباً ایک سیر وزن کا ہوتا ہے۔

وضوء کرنے کے دوران جو دعائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہیں' سب غلط ہیں۔ اس سلسلہ میں صرف یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شروع میں بسم اللہ کہتے تھے اور آخر میں یہ دعا پڑھتے تھے :

«أَشْهَدُ أَنْ لاَإِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَشَرِيْكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، اللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ»

اور سنن نسائی کی ایک دوسری حدیث میں یہ دعا ہے :

«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لاَإِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ»

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کوئی صحابی وضوء کے شروع میں «نَوَيْتُ» (میں نے نیت کی) نہیں کہتے تھے اور نہ تین مرتبہ سے زیادہ کوئی عضو دھوتے تھے اور آپ سے کہنی اور ٹخنے سے اوپر پانی ڈالنا بھی ثابت نہیں' وضو کے بعد اعضاء کو خشک کرنے کی بھی عادت نہ تھی۔

اور کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ڈاڑھی کا خلال کرتے تھے اور اس پر مداومت ثابت نہیں' اس طرح آپ انگلیوں میں بھی خلال کرتے لیکن پابندی سے نہیں' اور وضو کے دوران انگوٹھی کو حرکت دینے کے بارے میں ایک ضعیف حدیث آئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر و حضر میں موزوں پر مسح ثابت ہے۔ اس کی مدت مقیم کے لئے ایک دن اور رات' اور مسافر کے لئے تین دن اور تین راتیں ہوتی ہیں۔

آپ جراب اور موزوں پر بھی مسح کرتے تھے اور آپ نے صرف عمامہ کا پیشانی کے ساتھ مسح کیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ضرورت کے ساتھ خاص ہو' یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حکم عام ہو اور یہی صورت زیادہ ظاہر ہے' پیروں کے سلسلے میں آپ کسی تکلف سے کام نہ لیتے تھے۔ اگر موزے پہنے ہوتے تو مسح کر لیتے اور موزے نہیں پہنے ہوتے تو دھو لیتے۔

اور تیمم کرتے وقت آپ ایک ہی بار پاک مٹی پر ہاتھ مار کر چہرے اور ہتھیلیوں کا تیمم کر لیتے تھے۔ تیمم اس زمین پر کر لیتے جس پر نماز جائز ہے خواہ وہ مٹی ہو یا ریت یا دلدل' آپ فرماتے تھے "جہاں کہیں میری امت کے آدمی کو نماز کا وقت آجائے' اس کے پاس اس کی مسجد اور اس کی طہارت کا سامان موجود ہے"۔

غزوہ تبوک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام ریتلے صحرائی علاقے میں سفر کر رہے تھے اور آپ کے ساتھ پانی بہت کم مقدار میں تھا' اور کسی سے یہ روایت نہیں کہ آپ اپنے ساتھ مٹی اٹھا کر لائے ہوں یا صحابہ کو اس کا حکم دیا ہو' نہ کسی صحابی سے ایسا کرنا ثابت ہے۔ اس پر غور و فکر کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے یقیناً ریت ہی سے تیمم فرمایا تھا' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں کہ ہر نماز کے لئے جداگانہ تیمم فرماتے تھے اور نہ اس کا حکم دیا' بلکہ تیمم کو بالکل وضو کا قائم مقام قرار دیا ہے۔

فصل (۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے تھے۔ اس سے پہلے کچھ نہ کہتے تھے حتی کہ زبان سے آپ نیت بھی نہ کرتے تھے۔ تابعین یا ائمہ اربعہ میں سے بھی کسی نے اسے مستحب نہیں مانا ہے۔ تکبیر تحریمہ میں آپ صرف اللہ اکبر کہتے تھے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر ان کو قبلہ کی طرف کرکے کان کی لو یا مونڈھے تک اٹھاتے تھے پھر دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی کلائی اور بازو کے اوپر رکھ لیتے تھے۔

دونوں ہاتھوں کے رکھنے کی جگہ کے بارے میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے (لیکن ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کیا ہے کہ سنت یہ ہے کہ ہتھیلی کو ہتھیلی پر ناف کے نیچے باندھا جائے)۔

تکبیر تحریمہ کے بعد آپ نماز کا آغاز کبھی اس دعا سے فرماتے تھے :

«اللَّهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اللَّهُمَّ اغْسِلْنِي مِنْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، اللَّهُمَّ نَقِّنِي مِنَ الذُّنُوْبِ وَالْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ»

اے اللہ میرے اور میری لغزشوں کے مابین اتنی ہی دوری کر دیجئے جتنی مشرق و مغرب کے درمیان ہے' اے اللہ میری لغزشوں سے مجھے پانی' اولے' اور ٹھنڈ سے دھو ڈال' اے اللہ مجھے خطاؤں اور گناہوں سے اس طرح پاک و صاف کر دے جس طرح سفید کپڑا میل سے صاف ہو جاتا ہے :

اور کبھی یہ دعا پڑھتے تھے :

«وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضَ حَنِيْفًا مُسْلِمًا وَمَا أَنَا مِنَ

الْمُشْرِكِيْنَ إِنَّ صَلاَتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي للهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لاَشَرِيْكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ، اللّٰهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي وَأَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِي وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي ذُنُوْبِي جَمِيْعًا إِنَّهُ لاَيَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلاَّ أَنْتَ وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الأَخْلاَقِ لاَيَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلاَّ أَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا لاَيَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَهَا إِلاَّ أَنْتَ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِي يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ أَنَا بِكَ وَإِلَيْكَ تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ»

میں صرف اس اللہ کی طرف اپنا رخ کرتا ہوں جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور بلاشبہ میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ بیشک میری نماز میری قربانی ' میری زندگی ' میری موت اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے' جس کا کوئی شریک نہیں' اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا فرمانبردار ہوں۔ اے اللہ آپ بادشاہ ہیں' آپ کے علاوہ میرا کوئی رب نہیں اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اور اپنی خطاؤں کا اعتراف کرتا ہوں۔ تو میرے گناہوں کو معاف کر دے۔ آپ کے علاوہ کوئی اور گناہوں کا معاف کرنے والا نہیں ہے اور حسن اخلاق کی طرف میری رہنمائی فرما کیونکہ آپ کے علاوہ اور کوئی اس کی رہنمائی کرنے والا نہیں اور مجھے بد اخلاقی سے دور فرما کیونکہ آپ کے علاوہ کوئی اور اس سے دور کرنے والا نہیں۔ آپ کے دربار میں حاضر ہوں' بابرکت ہے آپ کی ذات ' خیر کے خزانے تیرے ہاتھ میں ہیں' شر کی نسبت آپ کی طرف نہیں کی جا سکتی۔ میرا وجود آپ کے ہی سہارے ہے اور آپ کی طرف لوٹنا ہے۔ آپ کی ذات بابرکت ہے اور عظیم الشان ہے اور آپ سے استغفار کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔

لیکن ثابت یہ ہے کہ یہ دعا قیام اللیل کے وقت پڑھنے کی ہے۔

اور کبھی کبھار آپ سے یہ دعا پڑھنا بھی ثابت ہے :

«اللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ»

اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بھی پڑھتے تھے :

«اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ»

پھر علامہ ابن قیم نے دو اور دعاؤں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے' یہ تمام دعائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا آغاز ان الفاظ سے بھی کرتے تھے :

«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَاإِلٰهَ غَيْرُكَ»

اس دعاء استفتاح کو اصحاب سنن نے ذکر کیا ہے لیکن پہلے والی دعائیں زیادہ ثابت ہیں البتہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثابت ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلے پر کھڑے ہو کر باواز بلند یہ دعا پڑھتے تھے اور لوگوں کو سکھلایا کرتے تھے۔

امام احمد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرا مسلک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مطابق ہے اور اگر کوئی شخص نماز کے افتتاح میں کوئی دوسری دعائیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوں تو پڑھ سکتا ہے۔

دعائے استفتاح کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم «أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ» پڑھ کر سورہ فاتحہ پڑھتے تھے اور «بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ» کبھی باواز بلند اور کبھی آہستہ پڑھتے تھے لیکن اکثر و بیشتر آہستہ پڑھتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر آیت پر ٹھہرتے تھے اور آخری حرف کو کھینچ کر پڑھتے تھے۔آپ کی قراءت ٹھہراؤ کے ساتھ ہوتی تھی۔

جب سورہ فاتحہ ختم ہو جاتی تو اگر جہری قراءت ہوتی تو آمین بھی باواز بلند کہتے ورنہ آہستہ سے کہتے اور صحابہ کرام بھی آپ کے پیچھے ایسا ہی کرتے تھے۔

آپ پہلی رکعت میں دو سکتے کرتے تھے۔ ایک تکبیر اولیٰ اور قراءت کے درمیان' دوسرے کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ سورہ فاتحہ کے خاتمہ پر' دوسری روایت میں ہے کہ رکوع سے پہلے' ایک قول یہ ہے کہ پہلے سکتے کے علاوہ دو مزید سکتے تھے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے تھے لیکن صحیح یہ ہے کہ سکتے کے مقامات دو ہی تھے۔ تیسرے مقام پر معمولی سا سکتہ ہوتا جو

بظاہر دم (سانس) لینے کے لئے ہوتا تھا۔ اس کے معمولی اور مختصر ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں نے ذکر نہیں کیا ہے۔

جب آپ سورہ فاتحہ کی قراءت سے فارغ ہو جاتے تو کوئی سورہ شروع کر دیتے جو کبھی طویل ہوتی اور کبھی مختصر، لیکن عموماً متوسط درجے کی سورتیں پڑھتے تھے۔ الا یہ کہ سفر میں ہوتے یا اور کوئی عذر پیش آ جاتا تو مجبوراً چھوٹی سورتیں تلاوت کرتے تھے۔

فصل (۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نمازوں میں قراءت کا طریقہ

نماز فجر : آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر میں قرآن پاک کی ساٹھ سے سو آیتوں تک تلاوت فرماتے تھے۔ یہ سورہ ق، سورہ روم، سورہ الشمس، سورہ الزلزال اور معوذتین کے علاوہ دوسری سورتوں کی آیات ہوتیں، جو آپ دونوں رکعتوں میں تلاوت فرماتے تھے۔

ایک دفعہ نماز فجر میں پہلی رکعت میں سورہ مومنون شروع کی، جب حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے تذکرے والی آیات پر پہنچے تو آپ کو کھانسی آگئی اور آپ رکوع میں چلے گئے۔

اور جمعہ کے دن اکثر سورہ سجدہ اور سورہ دہر ایک ایک رکعت میں پڑھتے تھے، کیونکہ ان دونوں سورتوں میں کائنات کی ابتداء و انتہاء، آدم علیہ السلام کی پیدائش کی بات، جنت و جہنم کے داخلے کا ذکر، یوم آخرت اور جمعہ کے دن واقع ہونے والی چیزوں کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح آپ بڑے اجتماعی موقعوں پر جیسے عیدین اور جمعہ کو سورہ ق اور سورہ اقترب، سورہ سبح اور سورہ غاشیہ پڑھتے تھے۔

نماز ظہر : ظہر کی نماز میں آپ کبھی کبھی طویل قراءت کرتے تھے۔ ابو سعید کی ایک روایت میں ہے کہ نماز ظہر کی اقامت سن کر اس اثناء میں اگر کوئی چاہتا تو آسانی سے بقیع تک جا کر وہاں قضاء حاجت سے فارغ ہو کر گھر آتا، وضو کرتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی رکعت میں پالیتا، کیونکہ آپ قراءت طویل فرماتے تھے۔ (مسلم نے روایت کیا ہے)۔

کبھی آپ ظہر کی نماز میں الم تنزیل السجدہ، یا، سبح اسم ربک الاعلی، یا، واللیل اذا یغشیٰ، یا والسماء ذات البروج کی قراءت کرتے تھے۔

نماز عصر : عصر کی نماز میں قراءت بقدر ظہر کے نصف ہوتی۔ اگر اسے طویل کرتے تو ظہر کی مختصر نماز کے برابر ہوتی۔

نماز مغرب : مغرب کی نماز میں آج کل کے لوگوں کے برخلاف کبھی سورہ اعراف جیسی طویل سورہ پڑھتے، کبھی سورہ طور اور کبھی سورہ مرسلات پڑھتے تھے، نماز مغرب میں ہمیشہ چھوٹی سورتیں پڑھنا مروان

بن حکم کے دور سے شروع ہوا جس پر زید بن ثابت نے نکیر فرمائی ہے۔

علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز مغرب میں سورہ المص 'سورہ صافات ' سورہ دخان' سورہ سبح اسم ربک الاعلی'سورہ تین' معوذتین اور مرسلات پڑھنا بھی ثابت ہے' اس طرح سے آپ کبھی کبھی چھوٹی سورتیں بھی پڑھتے تھے اور یہ تمام روایات صحیح و مشہور ہیں۔

نماز عشاء : عشاء کی نماز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ التین پڑھی ہے' حضرت معاذ کے لئے آپ نے والشمس وضحاھا' سبح اسم ربک الاعلی 'واللیل اذا یغشی اور اسی جیسی سورتیں متعین فرمائی تھیں۔

اسی لئے حضرت معاذ کو سورہ بقرۃ پڑھنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا : "اے معاذ کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالنا چاہتے ہو"۔

اس واقعہ کو بعض لوگ جو نماز پڑھنے میں جلد باز ہیں' بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور واقعہ کے سیاق وسباق کو نظرانداز کردیتے ہیں۔

نماز جمعہ : جمعہ کی نماز میں آپ سورہ جمعہ 'سورہ منافقین' سورہ اعلی ' وغاشیہ پڑھا کرتے تھے۔

نماز عیدین :

عیدین کی نماز میں کبھی آپ پوری سورہ ق' سورہ اقتربت پڑھتے اور کبھی سورہ اعلی و غاشیہ پڑھتے تھے' وفات تک آپ کا یہی معمول رہا۔

حضرات خلفاء راشدین بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر پابندی سے عمل کرتے رہے چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فجر کی نماز میں سورہ بقرہ پڑھی اور طلوع شمس سے قریب سلام پھیرا۔

ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نماز فجر میں سورہ یوسف ' نحل 'ہود اور سورہ بنی اسرائیل جیسی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان گرامی کہ "تم میں سے جو کوئی امامت کرے تو اس کو چاہیے کہ ہلکی نماز پڑھایا کرے" اس سلسلہ میں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ "تخفیف" ایک نسبتی وصف ہے اور اس کی تحدید و تعیین کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کی طرف رجوع کیا جائے گا اور مقتدیوں

کی خواہشات کا خیال نہ کیا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ و سنت جس پر آپ نے ہمیشہ مواظبت فرمائی ہے' وہی سارے اختلافات کا حل و فیصلہ کن ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ و عیدین کے علاوہ تمام نمازوں میں سورت متعین کر کے نہیں پڑھتے تھے کہ اس کے علاوہ کچھ نہ پڑھیں۔ آپ کا معمول تھا کہ جو سورت پڑھتے ' پوری پڑھتے' کبھی ایک سورت دو رکعتوں میں پوری کرتے لیکن ایک ہی سورت دو رکعتوں میں آپ کم پڑھتے تھے۔ سورت کا آخری یا درمیانی حصہ پڑھنا ثابت نہیں ۔ ایک رکعت میں دو سورتیں بھی آپ پڑھ لیتے تھے لیکن نفل نمازوں میں' فرض میں نہیں ۔ ہر نماز میں پہلی رکعت دوسری رکعت سے زیادہ طویل ہوتی تھی' بسا اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم قدموں کی آواز نہ آنے تک طویل کرتے تھے ۔

فصل (٦)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رکوع کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قراءت سے فارغ ہوتے تو رفع یدین اور تکبیر کہتے ہوئے رکوع میں چلے جاتے، رکوع کی صورت یہ تھی کہ ہاتھوں کے دونوں پنجے گھٹنوں پر اس طرح رکھتے تھے گویا انہیں پکڑے ہوئے ہیں۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں سے الگ رکھتے تھے۔ پشت بالکل سیدھی رہتی تھی اور سر نہ بہت اٹھا ہوا ہوتا تھا اور نہ بہت جھکا ہوا بلکہ پیٹھ کی سیدھ میں رہتا تھا۔ رکوع میں سبحان ربی العظیم پڑھتے تھے اور کبھی اتنا اضافہ اور کر دیتے۔ سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی۔

آپ کا رکوع عام طور پر اتنا طویل ہوتا کہ آدمی باسانی دس مرتبہ سبحان ربی العظیم کہہ سکے۔ یہی کیفیت سجدہ کی بھی ہوتی، کبھی رکوع اور سجدہ بقدر قیام ہوتا لیکن ایسا کبھی کبھار رات کی نفل نمازوں میں فرماتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر و بیشتر نمازیں معتدل اور مناسب ہوتی تھی، آپ رکوع میں یہ دعا بھی پڑھتے تھے۔ «سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ» اور کبھی یہ دعا پڑھتے «اللَّهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ، خَشَعَ لَكَ سَمْعِي، وَبَصَرِي، وَمُخِّي وَعَظْمِي، وَعَصَبِي» یہ دعا قیام اللیل کے بارے میں ثابت ہے۔

پھر سر اٹھاتے اور رفع یدین کرتے ہوئے «سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ» کہتے تھے۔ آپ ہمیشہ رکوع سے اٹھنے کے بعد اور دونوں سجدوں کے درمیان پیٹھ سیدھی کر لیتے اور یہ فرماتے تھے "اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو رکوع اور سجدے میں اپنی پیٹھ سیدھی نہ کرتا ہو"۔

رکوع سے فارغ ہو کر بالکل سیدھے کھڑے ہو جاتے اور یہ کہتے تھے «رَبَّنَا وَ لَكَ الْحَمْدُ» اور کبھی «اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ» کہتے اور کبھی «رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ» کہتے «اللَّهُمَّ وَ لَكَ الْحَمْدُ» ثابت نہیں ہے۔ رکوع کے بعد آپ کا قیام بھی بقدر رکوع و سجدہ طویل ہوتا تھا، چنانچہ آپ سے قیام کے دوران یہ دعا

ثابت ہے :

«اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوَاتِ وَمِلْءَ الأَرْضِ، وَمِلْءَ مَا بَيْنَهُمَا وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، أَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ، أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ، وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ، لاَمَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلاَمُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلاَيَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ»

اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا بھی ثابت ہے :

«اللَّهُمَّ اغْسِلْنِي مِنْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، وَنَقِّنِي مِنَ الذُّنُوْبِ وَالْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، وَبَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ»

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مروی ہے کہ آپ «لِرَبِّيَ الْحَمْدُ» کے کلمے کو اتنی بار دہراتے تھے کہ قومہ بقدر رکوع ہو جاتا تھا۔

امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب «سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ» کہتے تو اتنی دیر کھڑے رہتے کہ ہمیں خیال ہوتا کہ آپ کو سہو ہو گیا ہے اور جب آپ دونوں سجدوں کے درمیان قعدہ کرتے تو ہمیں یہی خیال ہوتا کہ آپ کو سہو ہو گیا ہے اور یہی آپ کی معروف سنت تھی لیکن اموی حکام نے ان رکنوں کو مختصر کر دیا اور لوگوں نے اسی کو سنت سمجھ لیا ہے۔

فصل (۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سجدے کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر کہتے ہوئے بغیر رفع یدین کئے ہوئے سجدے میں چلے جاتے تھے' سجدے کے وقت پہلے آپ دونوں گھٹنے زمین پر رکھتے پھر دونوں ہاتھ' اس کے بعد پیشانی اور ناک۔ احادیث صحیحہ سے یہی ثابت ہے۔ حاصل یہ کہ سجدے میں جاتے وقت زمین پر وہ عضو رکھتے تھے جو اس سے زیادہ قریب ہو پھر اس سے قریب تر' اسی طرح سے زمین سے اٹھتے وقت سب سے پہلے اوپر والا حصہ اٹھاتے تھے پھر اس کے بعد کا حصہ' اس طور پر کہ سب سے پہلے سر اٹھاتے' پھر دونوں ہاتھ' پھر دونوں گھٹنے اور اس صورت میں اونٹ کے اٹھنے سے مشابہت نہیں ہوتی جیسا کہ ہمیں جانوروں کی مشابہت سے نماز میں منع کیا گیا ہے' چنانچہ ایک اونٹ کی طرح بیٹھنے' لومڑی کی طرح متوجہ ہونے' درندوں کی طرح پھیلنے' کتے کی طرح چپکنے' کوؤں کی طرح چونچ مارنے اور سلام کے وقت سرکش گھوڑوں کی دم کی طرح ہاتھ اٹھانے سے روکا گیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیشانی اور ناک پر سجدہ کرتے تھے اور عمامہ کے کور پر سجدہ کرنا ثابت نہیں ہے۔ آپ زیادہ تر زمین پر سجدہ کرتے تھے اور پانی' گیلی مٹی' کھجور کی چٹائی اور دباغت دیئے ہوئے چمڑے پر بھی سجدہ کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

سجدے کی حالت میں آپ کی عادت یہ تھی کہ پیشانی اور ناک اچھی طرح زمین پر ٹکا دیتے تھے۔ دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں سے اس طرح جدا رکھتے تھے کہ بغل کی سفیدی نظر آتی تھی اور اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں اور کانوں کی سیدھ میں رکھتے اور سجدہ میں پیٹھ سیدھی رکھتے۔ دونوں پیروں کی انگلیوں کے سرے قبلہ کی طرف ہوتے' ہتھیلیاں اور انگلیاں پھیلا دیتے' انگلیاں نہ باہم ملی ہوتیں نہ بالکل الگ الگ ہوتیں۔

حالت سجدہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ پڑھا کرتے تھے' "سبحان ربی الاعلی" اور اس کا حکم بھی دیا ہے۔ آپ نے یہ دعا بھی پڑھی ہے :

«سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِيْ، سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ، رَبُّ

الْمَلاَئِكَةِ وَالرُّوْحِ»

اے میرے رب میں تیری پاکی اور حمد بیان کرتا ہوں' تو مجھے بخش دے' تو سب عیوب سے بالکل بری ہے' پاک ہے' فرشتوں اور روح کا مالک ہے۔

«اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي كُلَّهُ دِقَّهُ وَجُلَّهُ وَأَوَّلَهُ وآخِرَهُ وَعَلاَنِيَتَهُ وَسِرَّهُ»

اے اللہ میرے تمام چھوٹے بڑے' پچھلے اور بعد کے' ظاہر اور پوشیدہ گناہوں کو معاف فرما دے۔

«اللَّهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ، وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ، سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِي خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ، وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ، تَبَارَكَ اللهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ»

اے اللہ میں نے تیرے لئے سجدہ کیا' تجھ پر ایمان لے آیا' تیرا فرماں بردار ہوا' جس نے مجھے پیدا کیا' اسے میں سجدہ کرتا ہوں' جس نے مجھے قوت سماعت اور بصارت دی' اس کی اطاعت کرتا ہوں۔ نیز اس دعا کا پڑھنا بھی ثابت ہے۔

«اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي خَطِيْئَتِيْ وَجَهْلِي وَإِسْرَافِي فِي أَمْرِي وَمَاأَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي جِدِّي وَهَزْلِي، وَخَطَئِي وَعَمْدِي وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِي، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَأَخَّرْتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ وَ مَا أَعْلَنْتُ، أَنْتَ إِلٰهِي لاَ إِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ»

اے اللہ میرے گناہوں' نادانیوں' معاملات میں زیادتی اور گناہوں کو جنہیں مجھ سے زیادہ تو جانتا ہے' بخش دے۔ اے اللہ مذاق و سنجیدگی اور دانستگی و نادانستگی کے تمام گناہوں کو بخش دے۔ اے اللہ میرے اگلے پچھلے' ظاہر و پوشیدہ گناہوں کو بخش دے۔ تو میرا معبود ہے' تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

دعائے سجدہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم دیتے تھے کہ خوب اچھی طرح گڑگڑا کر دعا مانگا کرو اور فرماتے تھے کہ اس کی قبولیت کا یقین ہے۔

فصل (۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تشہد کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر کہتے ہوئے سر اٹھاتے اور رفع یدین نہ کرتے ' پھر بایاں پاؤں بچھا دیتے اور اس پر بیٹھ جاتے' داہنا پاؤں کھڑا رکھتے ' رانوں پر ہاتھ یوں رکھتے کہ کہنیاں رانوں پر ٹکی رہتیں اور پنجے گھٹنوں پر ہوتے' دو انگلیوں کو سمیٹ کر حلقہ بنا لیتے پھر انگلی اٹھا کر دعا کرتے اور اسے ہلاتے اور یہ دعا پڑھتے :

«اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي وَاجْبُرْنِي وَاهْدِنِي وَارْزُقْنِي»

اے اللہ مجھے بخش دے' مجھ پر رحم فرما' میرے نقصانات کی تلافی فرما' مجھ کو ہدایت دے اور رزق دے۔

یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رب اغفرلی کہتے تھے ' پھر آپ رانوں کا سہارا لیتے ہوئے قدموں اور گھٹنوں پر کھڑے ہو جاتے تھے اور فورا قراءت شروع کر دیتے' پہلی رکعت کی طرح کچھ وقفہ نہیں فرماتے تھے' پھر پہلی رکعت کی طرح دوسری رکعت بھی ادا فرماتے تھے۔ بس فرق اتنا ہوتا تھا کہ اس میں پہلی کی طرح قراءت سے پہلے نہ تو وقفہ ہوتا نہ دعائے استفتاح' نہ تکبیر تحریمہ اور نہ وہ طوالت ہوتی تھی۔

اور جب آپ تشہد کے لئے بیٹھتے تو بایاں ہاتھ بائیں ران پر اور داہنا ہاتھ داہنی ران پر رکھتے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے۔ اس انگلی کو نہ تو آپ بالکل کھڑی رکھتے اور نہ سیدھی بلکہ تھوڑی جھکائے رکھتے اور اسے حرکت دیتے تھے' چھنگو انگلی اور برابر والی انگلی سے گھٹنے کو پکڑتے اور درمیان والی انگلی کو انگوٹھے کے ساتھ ملا کر حلقہ بناتے' شہادت کی انگلی کو اٹھا کر دعا پڑھتے اور اس کی جانب اپنی نگاہ رکھتے۔ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ران پر رکھتے' تشہد کے لیے آپ اس طرح بیٹھتے تھے جس طرح

دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھتے تھے۔

مسلم شریف میں عبداللہ ابن زبیر کی حدیث میں مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں بیٹھتے تھے تو بائیں پیر کو ران اور پنڈلی کے درمیان کر لیتے تھے اور دائیں پیر کو بچھا لیتے تھے' اور یہ آخری تشہد میں ہوتا تھا۔

حضرت ابن زبیر نے بچھانے اور ابو حمید نے کھڑا کرنے کا ذکر کیا ہے' لیکن دونوں روایتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے' کیونکہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ اس پر بیٹھتے نہیں تھے بلکہ دائیں جانب نکال دیتے تھے اور وہ کھڑے ہونے اور بچھانے کی درمیانی کیفیت میں رہتا تھا۔ اور یا یہ کہا جائے کہ کبھی کھڑا رکھتے اور کبھی بچھا لیتے تھے اور یہ توجیہ زیادہ قابل اطمینان ہے۔

اس طرح تشہد ہمیشہ پڑھتے تھے اور صحابہ کرام کو یہ دعا پڑھنے کی تعلیم دیتے تھے :

«التَّحِيَّاتُ للهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِيْنَ، أَشْهَدُ أَنْ لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ»

تمام کی تمام عبادتیں اللہ کے لئے ہیں ' اے نبی سلام ہو آپ پر اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں' ہم پر اور اللہ کے سب نیک بندوں پر سلام ہو۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس تشہد کو بہت جلد ختم کرتے گویا آپ گرم پتھر پر کھڑے ہوں' کسی حدیث میں منقول نہیں کہ اس تشہد میں درود پڑھا ہو یا عذاب قبر و عذاب جہنم' موت و حیات اور دجال کے فتنے سے پناہ مانگی ہو' جن لوگوں نے اسے مستحب سمجھ لیا ہے' ان کو آخری تشہد کے سلسلے میں جو احادیث عمومی طور پر آتی ہیں' ان سے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔

تشہد کے بعد (چار رکعت والی نماز میں) اللہ اکبر کہتے ہوئے رانوں کا سہارا لیتے ہوئے گھٹنوں اور قدموں کی مدد سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

صحیح مسلم میں اور صحیح بخاری کی بعض روایتوں میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد اول سے اٹھنے کے بعد رفع یدین کرتے تھے اور پھر صرف سورہ فاتحہ پڑھتے تھے اور اس کے بعد آپ سے کچھ مزید پڑھنا ثابت نہیں ہے۔

نماز کے دوران آپ ادھر ادھر متوجہ نہیں ہوتے تھے' بخاری شریف میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "اس طرح شیطان بندے کی نماز چراتا ہے" آپ نے بعض مرتبہ ضرورت کے تحت ایسا کیا ہے لیکن یہ معمول نہ تھا جس طرح آپ ایک وادی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جہاں آپ نے لشکر بھیجا تھا اور آپ تشہد کے بعد سلام سے پہلے دعا پڑھتے تھے' اس کا حکم ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور فضالہ کی حدیث میں ہے۔

سلام کے بعد قبلہ رخ ہو کر یا مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر دعا کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں ہے' نماز سے متعلق تمام دعائیں آپ نماز کے اندر ہی پڑھتے تھے اور اسی کا حکم دیتے تھے اور یہی مصلی کے شایان شان ہے' کیونکہ نماز میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے اور سلام پھیرنے کے بعد یہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اپنے داہنی طرف السلام علیکم و رحمتہ اللہ کہتے ہوئے سلام پھیرتے تھے اور بائیں طرف بھی اسی طرح کرتے تھے۔ جس روایت میں آپ سے صرف ایک سلام کا ذکر ہے وہ ثابت نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے اچھی حدیث سنن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے لیکن وہ قیام اللیل کے متعلق ہے اور یہ حدیث بھی معلول ہے۔ اس میں وضاحت کے ساتھ یہ مذکور نہیں ہے کہ آپ نے ایک سلام پر اکتفا کیا ہے۔

نماز میں (تشہد میں) یہ دعائیں پڑھا کرتے تھے :

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، اللَّهُمَّ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ»

اے اللہ میں عذاب قبر سے پناہ مانگتا ہو اور دجال کے فتنے اور زندگی اور موت کے فتنے سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ میں گناہ اور قرض سے پناہ مانگتا ہوں۔

اس طرح آپ یہ دعا بھی پڑھتے تھے :

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِي الأَمْرِ وَالْعَزِيْمَةَ عَلَى الرُّشْدِ وَأَسْئَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ وَأَسْأَلُكَ قَلْبًا سَلِيْمًا وَأَسْأَلُكَ لِسَانًا صَادِقًا وَأَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَاتَعْلَمُ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَاتَعْلَمُ وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ»

اے اللہ میں تجھ سے ثابت قدمی اور پختہ ارادے کا سوال کرتا ہوں۔ اور نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا سوال کرتا ہوں' تیری اچھی عبادت کا سوال کرتا ہوں' قلب سلیم اور سچی زبان مانگتا ہوں' جس خیر کو تو جانتا ہے' اس کا سوال کرتا ہوں اور جن گناہوں کا تجھے علم ہے' ان سے مغفرت کا سائل ہوں۔

آپ یہ دعا بھی پڑھتے تھے :

«اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي، وَوَسِّعْ لِي فِي دَارِي وَبَارِكْ لِي فِيمَا رَزَقْتَنِي»

اے اللہ میرے گناہ بخش دے' میرا گھر میرے لئے کشادہ کر دے اور میرے رزق میں برکت عطا فرما۔

ساری دعائیں جو نماز میں پڑھنے کے سلسلے میں آئی ہیں' وہ صیغہ مفرد سے آئی ہیں۔

امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو سر جھکا کر کھڑے ہوتے اور تشہد کی حالت میں آپ کی نگاہ شہادت کی انگلی پر رہا کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور راحت نماز میں رکھی تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے "اے بلال! نماز کے ذریعہ ہمیں راحت پہنچاؤ" نماز میں اس قدر اور غیر معمولی دلچسپی کے باوجود آپ ہمیشہ مقتدیوں کی رعایت فرماتے تھے' بعض مرتبہ نماز کو طویل پڑھنے کی غرض سے شروع فرماتے لیکن بچہ کے رونے کی آواز سن کر مختصر کر دیتے تاکہ اس کی ماں کو تکلیف نہ ہو' اس طرح آپ بعض مرتبہ اپنی نواسی امامہ کو کندھے پر اٹھا کر فرض نماز پڑھتے تھے' قیام کی حالت میں اٹھا لیتے اور سجدہ اور رکوع کی حالت میں اتار دیتے تھے' نماز کی حالت میں حضرت حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما آتے اور آپ کی پشت پر سوار ہو جاتے تھے۔ آپ سجدہ طویل کر دیتے تاکہ انہیں اتارنا نہ پڑے۔ آپ جب نماز پڑھتے ہوتے تو اس دوران اگر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آ جاتیں تو آپ چل کر دروازہ کھول دیتے اور پھر مصلی پر آ جاتے اور نماز کی حالت میں آپ سلام کا جواب اشارہ سے دیتے تھے۔

جس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ جس نے نماز میں اشارہ کیا تو چاہیے کہ وہ نماز دہرائے' وہ باطل ہے۔

امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بوقت حاجت پھونکتے اور کھنکھار لیتے تھے' نماز میں آپ کبھی روتے بھی تھے' نیز آپ کبھی ننگے پاؤں نماز پڑھتے اور کبھی جوتے ہی

میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ یہودیوں کی مخالفت کی غرض سے جوتوں میں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ کبھی آپ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی اور زیادہ تر دو کپڑوں میں ادا فرمائی۔

فجر کی نماز میں رکوع کے بعد ایک ماہ تک دعائے قنوت پڑھی پھر چھوڑ دی۔ آپ کسی ناگہانی وجہ سے دعائے قنوت پڑھتے تھے' جب وہ دور ہو جاتی تو ترک کر دیتے تھے' مصیبتوں کے وقت دعائے قنوت پڑھنا اور اور اس کے دور ہو جانے کے بعد ترک کر دینا آپ کی سنت تھی' فجر کی نماز میں خصوصیت سے قنوت نہ پڑھتے تھے۔ البتہ اس میں زیادہ قنوت پڑھنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ نماز طویل ہوتی تھی۔ اس کا وقت تہجد سے قریب ہوتا ہے جو کہ قبولیت دعا اور نزول رحمت کی گھڑی ہے۔

فصل (۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سجدہ سہو کا طریقہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا "میں تم جیسا ایک بشر ہوں' جس طرح تم بھول جاتے ہو' اسی طرح میں بھی بھول جاتا ہوں' جب میں بھول جایا کروں تو مجھے یاد دلایا کرو"۔

آپ کا سہو دراصل امت کے لئے ایک نعمت اور کمال دین کا سبب ہے تا کہ سہو میں جو طریقہ مشروع ہوا' اس میں آپ کی اقتداء کریں' چنانچہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چار رکعت والی نماز میں دوسری رکعت کے بعد کھڑے ہو گئے اور دونوں کے درمیان قعدہ نہیں گیا' جب آپ نے نماز ختم کرلی تو سلام سے پہلے دو سجدے کئے' پھر سلام کیا' اس طرح اس سے ایک مسئلہ معلوم ہو گیا کہ جو آدمی نماز کے ارکان کے علاوہ باقی اجزاء میں سے کچھ حصہ سہوا چھوڑ دے تو وہ سلام سے پہلے سجدہ سہو کرے۔

بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ جب ایک رکن کے علاوہ کوئی حصہ سہوا چھوڑ دیا اور دوسرا رکن شروع کردیا تو متروک حصہ کی طرف نہیں لوٹے۔

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب یا عشاء کی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا' پھر بات چیت کی' پھر اسے پورا کیا' پھر آپ نے سلام پھیر کر سجدہ کیا اور اس کے بعد پھر سلام پھیرا۔

ایک مرتبہ آپ نے نماز پڑھائی اور ایک رکعت باقی تھی کہ آپ نے سلام پھیر دیا' اتنے میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ ایک رکعت بھول گئے ہیں' یہ سن کر آپ واپس مسجد لوٹے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اقامت کہیں' پھر آپ نے ایک رکعت نماز پڑھائی' اس روایت کو امام احمد نے ذکر کیا ہے۔

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھ لی' لوگوں نے یاد دلایا تو آپ نے سلام کے بعد سجدہ سہو کیا۔

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز تین رکعتیں پڑھائیں' پھر آپ گھر چلے گئے۔ لوگوں نے یاد دلایا تو آپ باہر تشریف لے آئے اور مزید ایک رکعت پڑھا کر سلام پھیرا' پھر سجدہ سہو کیا اور

سلام پھیرا۔

یہ سجدہ سہو سے متعلق مجموعی طور پر پانچ واقعات مروی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی حالت میں اپنی آنکھیں بند نہیں کرتے تھے' امام احمد نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ یہودیوں کی عادت تھی' ایک جماعت نے اسے مباح قرار دیا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اگر آنکھیں کھولنا نماز کے خشوع میں مخل نہیں ہے تو کھولنا افضل ہے اور اگر آنکھ کھولنے سے قبلہ کی طرف کے نقش و نگار خلل انداز ہوتے ہیں تو یہ مکروہ نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ استغفراللہ کہنے کا معمول تھا اور اس کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے :

«اللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَا الْجَلَالِ وَالإِكْرَامِ»

اے اللہ! تو ہر عیب سے پاک ہے اور تجھ ہی سے سلامتی ہے۔ تو برکت والا ہے' اے بزرگی اور تعظیم والے ۔

آپ قبلہ رخ صرف اتنی دیر بیٹھتے کہ استغفار اور دعا پڑھتے' پھر فوراً اپنا رخ مقتدیوں کی طرف کر لیتے اور اپنے دائیں اور بائیں جانب سے (رخ انور) پھیر لیتے تھے پھر اپنا چہرہ انور مقتدیوں کی سمت کے علاوہ کوئی دوسری سمت متعین نہ کرتے تھے اور جب آپ صبح کی نماز پڑھ لیتے تو جائے نماز پر بیٹھ جاتے' یہاں تک کہ سورج نکل آتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے :

«لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ» «اللّٰهُمَّ لَامَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَامُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَايَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ، وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَلَانَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ، لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ»

خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک نہیں' اسی کی حکومت ہے' اسی کے لئے سب تعریف ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اے اللہ جو تو نے عطا کیا ہے' اسے

کوئی روکنے والا نہیں' اور جو تو نے روک دیا ہے' اسے کوئی دینے والا نہیں اور کسی عزت دار دولت والے کو تیرے مقابلے میں دولت نفع نہیں دیتی' گناہ سے باز رہنا اور اطاعت کی قوت اللہ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے' اس کے لئے ساری نعمتیں اور ساری بڑائیاں اور اچھی تعریفیں ہیں' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' ہم خالص اس کی بندگی کرتے ہیں' اگرچہ کافروں کو یہ بات بری معلوم ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے یہ مستحب قرار دیا کہ ہر فرض نماز کے بعد سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ' الحمد للہ ۳۳ مرتبہ' اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ اور آخر میں ایک مرتبہ «لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ» کہہ کر سو کا عدد پورا کیا جائے۔

صحیح ابن حبان میں حضرت حارث بن مسلم سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ : جب تم صبح کی نماز پڑھ لو تو بات کرنے سے پہلے سات مرتبہ یہ دعا پڑھ لو :

«اللّٰهُمَّ أَجِرْنِي مِنَ النَّارِ»

اے اللہ تو مجھے جہنم کی آگ سے بچا!

اگر تم اس دن مر جاؤ تو اللہ تعالیٰ آگ سے تمہاری نجات لکھ دے گا اور جب تم مغرب کی نماز کے بعد بات کرنے سے پہلے یہی کلمات سات مرتبہ پڑھ لو اور پھر اسی رات تمہارا انتقال ہو گیا تو جہنم سے محفوظ رہو گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تو اپنے اور اس کے درمیان بکری کی گذرگاہ کا فاصلہ چھوڑ دیتے اور اس سے دور نہ رہتے بلکہ سترہ کے قریب ہونے کا حکم فرماتے تھے اور جب آپ لکڑی یا ستون یا درخت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تو اسے دائیں بائیں جانب کر لیتے اور بالکل سامنے نہ کرتے' سفر میں آپ نیزہ کا سترہ بنا لیتے تھے اور سواری اور کجاوے کی لکڑی کا بھی سترہ بنا لیتے تھے اور مصلی کے آگے تیر یا لاٹھی کا بھی سترہ بنانے کا حکم فرمایا ہے۔ اگر کوئی چیز نہ ملے تو زمین پر ایک لکیر ہی کھینچ کر سترہ بنا لینا کافی ہے۔

اگر سترہ نہ ہو تو صحیح روایت میں مذکور ہے کہ عورت' گدھے اور کتے کے گذرنے سے نماز فاسد ہو

جاتی ہے' اس روایت کی مخالف روایت اگر صحیح ہے تو اس میں صراحت نہیں ہے اور جو روایت صریح ہے' تو اس میں صحت نہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں نماز پڑھتے تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے سامنے قبلہ کی جانب سوئی ہوتی تھیں لیکن یہ صورت سامنے سے گذرنے والے سے مشابہ نہیں ہے کہ نمازی کے سامنے سے گذرنا حرام ہے اور اس کے سامنے ٹھہرنا مکروہ نہیں ہے۔

فصل (۱۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں سنتوں کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حالت اقامت میں ہمیشہ دس رکعتوں کا اہتمام کرتے تھے اور وہ رکعتیں وہی ہیں، جن کے متعلق حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعتیں محفوظ کی تھیں، دو رکعتیں ظہر سے پہلے، دو اس کے بعد، دو رکعتیں مغرب کے بعد، دو رکعتیں عشاء کے بعد گھر میں اور دو رکعتیں فجر کی نماز سے پہلے۔ ظہر کے بعد کی دو رکعتیں اگر چھوٹ جائیں تو انہیں آپ عصر کے بعد ادا کر لیا کرتے تھے، آپ کبھی ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

مغرب سے پہلے دو رکعتوں کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ "مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لیا کرو" تیسری بار فرمایا کہ "جس کا جی چاہے" تا کہ لوگ اسے سنت موکدہ نہ سمجھ لیں اور صحیح یہ ہے کہ یہ مستحب ہیں، سنت موکدہ نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عام سنتیں اور نوافل جس کا کوئی مخصوص سبب نہ ہو، خاص طور پر مغرب کی سنت گھر ہی میں ادا فرماتے تھے، یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کبھی مسجد میں پڑھی ہو لیکن مسجد میں پڑھی جا سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنت کا تمام دیگر نوافل سے زیادہ اہتمام فرماتے تھے اور اسے اور نماز وتر کو کبھی سفر و حضر میں نہیں چھوڑتے تھے۔ حالت سفر میں ان دونوں سنتوں کے علاوہ کوئی دوسری سنت پڑھنا ثابت نہیں ہے۔

فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ فجر کی سنتوں اور وتروں میں کونسی زیادہ ضروری ہے۔ فجر کی سنت سے عمل کی ابتدا ہوتی ہے اور وتر کی نماز سے اعمال اپنے اختتام کو پہنچتے ہیں، اس وجہ سے آپ فجر کی سنتوں اور نماز وتر میں سورہ کافرون اور سورہ اخلاص پڑھا کرتے تھے اور یہ سورتیں توحید علمی، عملی، ارادی، اعتقادی پر مشتمل ہیں۔

سورہ اخلاص میں ایسی توحید کامل کا بیان ہے جو شرک کی تمام صورتوں کے قطعی منافی ہے' پھر اس میں اثبات صمدیت جو تمام صفات کمال اس کی طرف منسوب کرتی ہے جس میں کسی طرح کوئی نقص نہیں پایا جاتا اور ابوت و بنوت کی نفی سے بے نیازی اور وحدانیت ثابت ہوتی ہے اور اس میں کفو و نظیر کی بھی نفی ہے جس سے ہر قسم کی تشبیہ و تمثیل کی نفی ہوتی ہے۔

غرض سورہ اخلاص میں عقیدہ توحید کے وہ بنیادی اصول آگئے ہیں جن کے تسلیم کر لینے کے بعد انسان تمام گمراہ فرقوں سے دور ہو کر توحید کامل کا قائل ہو جاتا ہے' یہی وجہ ہے کہ یہ سورہ قرآن کے ایک تہائی حصہ کے برابر ہے' کیونکہ قرآن کریم کا دار و مدار خبر اور انشاء پر ہے اور انشاء میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔ (۱) امر (۲) نہی (۳) اباحت' اور خبر کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے اسماء و صفات اور احکام کی خبر۔ دوسری مخلوق کو اس کی اطلاع و خبر دینا' چنانچہ سورہ اخلاص محض اس کی ذات اور اس کے اسماء و صفات کی خبر پر مشتمل ہے' اسی وجہ سے یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے اور اس کا پڑھنے والا جبکہ اس کا اس پر ایمان بھی ہو' شرک اعتقادی سے بری ہو جاتا ہے' جس طرح سورہ الکافرون شرک عملی اور شرک ارادی سے انسان کو الگ کر دیتا ہے۔

چونکہ علم عمل پر مقدم اور اس کا امام و قائد ہے' اس لئے سورہ اخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے اور سورہ الکافرون ایک چوتھائی کے برابر ہے۔

چونکہ شرک عملی اپنی خواہشات کی اتباع کے باعث لوگوں پر غالب ہو جاتا ہے اور اکثر لوگ باوجود اس کے مضرت و بطلان سے واقف ہونے کے اسکے مرتکب ہو جاتے ہیں اور اس کو زائل کرنا شرک علمی سے زیادہ مشکل و دشوار ہو جاتا ہے' کیونکہ یہ دلیل سے زائل ہو جاتا ہے' اس لئے سورہ الکافرون میں تاکید اور تکرار سے کام لیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے آپ ان دونوں سورتوں کو طواف کی دو رکعتوں میں پڑھا کرتے تھے کہ حج توحید کا شعار ہے اور اس وجہ سے ان کے ذریعہ دن کے کام کی ابتداء اور رات کے کام کا اختتام فرماتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتوں کے بعد دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔ اس سلسلہ میں دو جماعتوں نے قدرے غلو سے کام لیا ہے۔ ظاہریہ نے اسے واجب قرار دیا ہے اور ایک دوسری جماعت نے اسے بدعت و مکروہ بتایا ہے' لیکن امام مالک نے معتدل اور درمیانی مسلک اختیار کیا ہے' وہ یہ کہ آرام کی غرض سے لیٹ جائے تو کوئی حرج نہیں اور اگر سنت سمجھ کر کیا جائے تو یہ فعل مکروہ ہے۔

فصل (۱۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تہجد کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز سفرو حضر کسی حال میں نہیں چھوڑتے تھے۔ جب کبھی آپ پر نیند کا غلبہ ہو جاتا یا کوئی تکلیف ہو جاتی تو دن میں بارہ رکعتیں پڑھ لیتے۔

ہم نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ کو اس دلیل کے متعلق فرماتے سنا کہ وتر اپنے محل سے قضا ہو جانے کے بعد قضا نہیں ہوتی جس طرح تحیتہ المسجد' نماز کسوف اور نماز استسقاء وغیرہ ہے' کیوں کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ رات کی آخری نماز وتر ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد میں گیارہ یا تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے' گیارہ رکعتوں پر اتفاق ہے اور آخری دو رکعتوں کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ فجر کی دو سنتیں تھیں یا کوئی اور نماز تھی' اس طرح جب فرائض اور ان سنن موکدہ کو جمع کیا جائے' جن پر آپ مواظبت کرتے تھے تو مجموعی طور پر چالیس رکعتیں ہوتی ہیں' اس کے علاوہ کوئی نماز پڑھی تو پابندی سے نہیں پڑھی۔

لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ تاحیات اس طرح معمول رکھے' اس لئے کہ جو شخص دن اور رات میں چالیس مرتبہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی بات کس قدر جلد سن لی جائے گی ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وقت جاگتے تو یہ دعا پڑھتے تھے :

«لَاإِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ أَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِي، وَأَسْأَلُكَ رَحْمَتَكَ، اللَّهُمَّ زِدْنِي عِلْمًا وَلَاتُزِغْ قَلْبِي بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنِي، وَهَبْ لِي مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ»

تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں' تو پاک ہے' اے اللہ میں تجھ سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتا ہوں اور تجھ سے تیری رحمت طلب کرتا ہوں' اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما اور ہدایت کے بعد میرے دل کو ٹیڑھا نہ کر' مجھ کو اپنی رحمت سے نواز' تو بہت نوازنے والا ہے۔

جب آپ سو کر اٹھتے تو یہ دعا پڑھتے :

«اَلْحَمْدُ للهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ»

تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں' جس نے ہم کو موت (نیند) کے بعد زندگی عطا کی اور اسی کے پاس جمع ہونا ہے۔

پھر اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسواک فرماتے۔ بسا اوقات سورہ آل عمران کی آخری دس آیتیں ﴿ إِنَّ فِي خَلْقِ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ﴾ سے آخر سورہ تک تلاوت فرماتے تھے' پھر وضو کرتے اور مختصر دو رکعتیں نماز پڑھتے' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے اسے پڑھنے کا حکم معلوم ہوتا ہے۔

جب رات آدھی گذر جاتی اور اس سے قبل یا اس کے بعد آپ اٹھتے اور اکثر اوقات اس وقت اٹھتے جب آواز دینے والے یعنی مرغ کی آواز سنتے اور وہ اکثر نصف ثانی (رات کے آخری نصف) میں آواز لگاتا تو آپ اپنا ورد کئی حصوں میں کر دیتے اور کبھی مسلسل جاری رکھتے اور یہی زیادہ تر ہوتا' کئی حصوں میں ادا کرنے کی صورت حضرت ابن عباس نے یہ بتائی ہے کہ "دو رکعت نماز ادا کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو جاتے تھے' اس طرح تین مرتبہ میں چھ رکعتیں ادا فرماتے تھے اور ہر مرتبہ اٹھ کر مسواک اور وضو کرتے' پھر تین رکعت وتر ادا کرتے"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کئی طرح پڑھتے تھے۔ ایک کیفیت کا ذکر ابھی ہوا' دوسری صورت یہ ہے کہ آپ آٹھ رکعتیں اس طور پر پڑھتے تھے کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے' پھر مسلسل پانچ رکعت بطور وتر پڑھتے۔ صرف آخر میں تشہد کے لئے بیٹھتے تھے۔

تیسری صورت : نو رکعت اس طرح پڑھتے تھے کہ آٹھ رکعت مسلسل پڑھتے اور صرف آٹھویں رکعت کے آخر میں بیٹھتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے' دعا مانگتے اور پھر بغیر سلام پھیرے کھڑے ہو جاتے' پھر نویں رکعت میں تشہد پڑھتے اور سلام پھیر دیتے' سلام پھیرنے کے بعد دو رکعت نماز پڑھتے۔

چوتھی صورت : یہ ہے کہ مذکورہ ہی طریقے سے سات رکعتیں پڑھتے پھر اس کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

پانچویں صورت : دو دو رکعت پڑھ کر آخر میں تین رکعت وتر پڑھ لیتے جن میں قعدہ یا تشہد کا فاصلہ نہ ہوتا۔ اس کو امام احمد نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھتے تھے اور ان کے درمیان وقفہ نہیں کرتے تھے' تاہم یہ روایت محل نظر ہے' کیوں کہ صحیح ابن حبان میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ "تین رکعت وتر نہ پڑھو' پانچ یا سات پڑھو' وتر کو مغرب کی نماز کے مشابہ نہ بناؤ"۔ امام دار قطنی کہتے ہیں کہ اس روایت کے سارے راوی ثقہ ہیں۔

حرب کہتے ہیں کہ امام احمد سے وتر کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا' دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے' اگر سلام نہ پھیر سکا تو میرا خیال ہے کہ کوئی نقصان دہ بات نہیں ہے لیکن سلام پھیرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مستند طریقے سے ثابت ہے۔ ابو طالب کی روایت میں ایک قول مذکور ہے کہ زیادہ قوی روایت ایک رکعت والی ہے اور میں اسی کا قائل ہوں۔

چھٹی صورت : جیسا کہ امام نسائی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو رکوع میں قیام کے بقدر یہ دعا پڑھی «سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم» اسی حدیث میں ہے کہ آپ نے ابھی چار رکعتیں پڑھی تھیں کہ حضرت بلال صبح کی نماز کے لئے آپ کو بلانے آگئے' آپ نے رات کے ابتدائی' درمیانی اور آخری حصہ میں وتر پڑھی' ایک رات قیام میں صبح تک صرف ایک ہی آیت پڑھتے رہ گئے' اور وہ یہ تھی :

﴿ إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ [المائدة : ١١٨]

اگر تو ان کو عذاب دے گا تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے تو غالب حکمت والا ہے۔

رات میں آپ کی نماز تین طرح کی ہوتی تھی' ایک یہ کہ آپ زیادہ تر کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے' دوسرے بیٹھ کر نماز پڑھتے اور رکوع بھی بیٹھ کر کرتے' تیسرے یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر نماز پڑھتے اور جب تھوڑی سی قراءت باقی رہ جاتی تو کھڑے ہو جاتے اور پھر رکوع فرماتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ وتر کے بعد کبھی دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے اور کبھی بیٹھ کر ہی قراءت کرتے اور رکوع کے وقت کھڑے ہو جاتے پھر رکوع کرتے۔

اس حدیث سے بہت لوگوں کو اشکال ہوا اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد

کو کہ "رات کی آخری نماز وتر بناؤ" کا معارض سمجھ لیا۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ میں ان دو رکعتوں کو نہ پڑھتا ہوں اور نہ کسی کو پڑھنے سے منع کرتا ہوں۔ امام مالک نے تو ان دونوں رکعتوں کا انکار کیا ہے۔

لیکن صحیح صورت یہ ہے کہ نماز وتر مستقل عبادت ہے اور وتر کے بعد دو رکعتیں مغرب کی سنتوں کی طرح ہیں۔ اس طرح مذکورہ دونوں رکعتیں وتر کی تکمیل کا درجہ رکھتی ہیں' کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتیں۔

وتر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قنوت ثابت نہیں۔ صرف ابن ماجہ کی ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے۔ امام احمد کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ثابت نہیں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ پورے سال دعاء قنوت پڑھا کرتے تھے۔

اصحاب سنن نے قنوت پڑھنے کے سلسلہ میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو روایت کیا ہے' امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور کہا کہ ہم اس کو ابوالحوراء السعدی کے طریقے سے جانتے ہیں۔

نماز وتر میں دعائے قنوت پڑھنا حضرت عمر' حضرت ابی ابن کعب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ امام ابو داؤد اور امام نسائی نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں سورہ اعلیٰ' سورہ الکافرون اور سورہ اخلاص پڑھا کرتے تھے اور سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ سبحان الملک القدوس کہا کرتے تھے۔ تیسری مرتبہ قدرے آواز کھینچ کر پڑھا کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سورہ ترتیل سے پڑھتے تھے خواہ وہ بڑی سے بڑی کیوں نہ ہو۔ قرآن کریم پڑھنے کا مقصد بھی یہ ہے کہ غور اور فکر و تدبر سے کام لیا جائے' اس پر عمل کیا جائے اور اس کی تلاوت اس کے مفہوم و معانی کے سمجھنے کا بہترین وسیلہ ہے۔

بعض سلف کا قول ہے کہ قرآن کریم عمل کے لئے نازل کیا گیا ہے اس لئے اس کی تلاوت کو عمل سمجھو۔ حضرت شعبہ کہتے ہیں کہ ہمیں ابو جمرہ نے بتایا کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ میں جلدی پڑھنے کا عادی ہوں اور بسا اوقات ایک رات میں ایک یا دو قرآن ختم کرتا ہوں۔ ابن عباس نے فرمایا کہ مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں ایک سورہ پڑھوں بجائے اس کے کہ جو تم کرتے ہو۔ اگر تم کو تیز ہی پڑھنا ہے تو اس طرح پڑھو کہ کان سن سکیں اور دل یاد کر سکے۔

ابراہیم کہتے ہیں کہ حضرت علقمہ نے حضرت ابن مسعود کے سامنے تلاوت فرمائی تو انہوں نے فرمایا

کہ میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں' ترتیل سے پڑھو کیونکہ یہ قرآن مجید کی زینت ہے۔

نیز حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ قرآن کو شعر کی طرح نہ گا کر پڑھو اور نہ فضول کلام کی طرح پڑھو بلکہ اس کو پڑھتے وقت اس کے عجائب پر ٹھیرو اور اس کے ذریعہ دلوں کو حرکت دو اور دھیان محض سورہ کو جلد ختم کر دینے پر نہ لگا ہوا ہو۔ مزید فرماتے ہیں۔ جب تم سنو کہ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے:
﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ ﴾ (اے ایمان والو) تو تم سراپا گوش ہو جاؤ کیونکہ یا تو تمہیں نیکی کا حکم دیا جائے گا یا برائی سے منع کیا جائے گا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلی فرماتے ہیں کہ ایک عورت میرے پاس آئی' میں اس وقت "سورہ ہود" پڑھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی' اے عبدالرحمٰن تو اس طرح سورہ ہود پڑھ رہا ہے' بخدا میں اسے چھ مہینے سے پڑھ رہی ہوں لیکن ابھی تک اسے ختم نہیں کر سکی ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز میں کبھی آہستہ سے تلاوت فرماتے تھے اور کبھی بہ آواز بلند' دونوں طرح قراءت فرماتے تھے اور قیام کبھی مختصر کرتے تھے اور کبھی طویل۔ نفل نمازیں حالت سفر میں دن ہو یا رات' سواری پر پڑھ لیتے تھے' خواہ اس کا رخ جس طرف ہو' رکوع اور سجدہ اشارہ سے کرتے تھے اور سجدہ رکوع سے زیادہ جھک کر کرتے تھے۔

فصل (۱۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز چاشت اور سجدہ تلاوت کا طریقہ

امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاشت کی نماز پڑھتے کبھی نہیں دیکھا لیکن میں اسے پڑھتی ہوں۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھ کو میرے خلیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی کہ ہرماہ تین دن کے روزے رکھوں' اور چاشت کی دو رکعت نماز پڑھوں' اور سونے سے پہلے نماز وتر پڑھوں۔ امام مسلم نے زید بن ارقم سے مرفوعا روایت کی ہے کہ اوابین کی نماز اس وقت پڑھی جاتی ہے جب دن کی گرمی بڑھ جائے' اور جسم میں دوپہر کی گرمی محسوس ہونے لگے اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے لیکن آپ نے خود بنفس نفیس تہجد کی وجہ سے نہیں پڑھی۔

حضرت مسروق کہتے ہیں کہ ہم مسجد میں نماز پڑھتے تھے اور حضرت عبداللہ ابن مسعود کے قیام کے بعد ہم وہیں رہتے تھے اور پھر اٹھتے اور چاشت کی نماز پڑھتے تھے۔ ان کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو فرمایا کہ کیوں بندوں پر وہ بوجھ ڈالتے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے نہیں ڈالا ہے۔ اگر تم واقعی اس کو پڑھنا چاہتے ہو تو اپنے گھروں میں پڑھ لیا کرو۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ میں چاشت کی نماز خواہش کے باوجود اس ڈر سے چھوڑ دیتا ہوں کہ کہیں مجھ پر لازمی (عائد) نہ ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی سنت طیبہ یہ تھی جب ان کو کسی طرح مسرت و نعمت کے حصول یا کسی مصیبت کے ٹلنے کی اطلاع ملتی تو اللہ تعالیٰ کی جناب میں سجدہ شکر کرتے تھے' اور جب کسی سجدہ والی آیت کی تلاوت فرماتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے تھے اور اکثر سجدہ میں یہ دعا پڑھتے تھے :

«سَجَدَ وَجْهِي لِلَّذِي خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ»

میرے چہرہ نے اس ذات کو سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی تصویر بنائی اور سماعت و بصارت اپنی قوت و قدرت سے عطا کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہیں منقول نہیں ہے کہ آپ اس سجدے سے اٹھتے وقت تکبیر کہتے تھے یا تشہد پڑھتے یا سلام پھیرتے تھے۔ اور یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ "الم تنزیل" اور "ص" اور "اقرا" اور "النجم" اور "اذا السماء انشقت" میں سجدہ کیا ہے۔

ابو داؤد نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کے پندرہ مقامات بتائے ہیں' ان میں سے تین مفصل (چھوٹی سورتوں) میں ہیں اور دو سجدے سورہ حج میں ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد مفصل سورتوں میں سجدہ نہیں کیا' وہ ضعیف ہے۔ اس حدیث کی سند میں ابو قدامہ الحارث ابن عبید نامی ایک راوی ہے جو غیر معتبر ہے۔ نیز اس حدیث کو ابن قطان نے مطرالوراق کی وجہ سے ناقابل اعتبار بتایا ہے اور کہا ہے کہ وہ خرابی حافظہ میں محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلی کے مشابہ ہیں۔

امام مسلم کا ان احادیث کا ذکر کرنا کوئی عیب کی بات نہیں کیونکہ امام صاحب نے انہی احادیث کا ذکر کیا ہے جن کے محفوظ ہونے کا یقین ہوا' جس طرح بہت سے ثقہ و معتبر راویوں کی ان حدیثوں کو چھوڑ دیا جن میں غلطی کا علم ہو گیا تھا' کچھ لوگ ثقہ راویوں کی تمام احادیث کو صحیح قرار دیتے ہیں' اسی طرح بعض لوگ کمزور حافظہ والوں کی تمام روایتوں کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں بہتر طریقہ کار امام حاکم وغیرہ کا ہے اور دوسرا طریقہ ابن حزم وغیرہ کا ہے لیکن امام مسلم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ ائمہ فنِ حدیث کا طریقہ کار ہے۔

فصل (۱۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم جمعہ میں اسوہ حسنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "ہم سے پہلی قومیں یوم جمعہ کے متعلق بھٹک گئیں۔ یہودیوں نے سنیچر کا دن اور عیسائیوں نے اتوار کا دن اپنے لئے اختیار کر لیا پھر اللہ تعالیٰ ہمیں لایا اور جمعہ کے دن کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی۔ اس طرح ترتیب یوں ہو گئی۔ جمعہ' سنیچر اور اتوار' چنانچہ وہ لوگ قیامت کے دن ہم سے پیچھے ہوں گے۔ ہم دنیا میں بعد میں ہیں لیکن قیامت کے دن آگے آگے ہوں گے اور ہمارے فیصلے تمام مخلوق سے پہلے ہوں گے"۔

امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک صحیح حدیث مرفوعا روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا : "سب سے بہترین دن جمعہ کا دن ہے' اس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا فرمایا' اسی دن وہ جنت میں داخل ہوئے اور اسی دن نکالے گئے اور قیامت بھی جمعہ کے دن ہی آئے گی"۔ اسے موطا نے روایت کیا ہے' امام ترمذی نے ان الفاظ کے ساتھ بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے "وہ سب سے بہتر دن ہے' اسی دن آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے' زمین پر اتارے گئے' ان کی توبہ قبول ہوئی اور ان کی وفات ہوئی اور اسی دن قیامت آئے گی' جنات اور انسان کے سوا کوئی جاندار ایسا نہیں جو جمعہ کے دن قیامت کے ڈر سے خائف و ترساں نہ ہو۔ اس میں ایسی مبارک گھڑی بھی آتی ہے کہ جب کوئی مسلمان نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے تو وہ اسے عطا کرتا ہے" کعب نے دریافت کیا کہ کیا یہ ہر سال ہوتا ہے تو میں نے کہا نہیں بلکہ ہر جمعہ کو' پھر انہوں نے تورات کھول کر پڑھی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں' پھر میں عبداللہ بن سلام سے ملا تو میں نے ان کے سامنے حضرت کعب کی مجلس اور واقعہ کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں' وہ کون سی گھڑی ہے' میں نے عرض کیا' پھر مجھے بھی بتا دیجئے' چنانچہ انہوں نے فرمایا' یہ جمعہ کے دن کی آخری گھڑی ہے۔ میں نے عرض کیا : وہ کس طرح جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس گھڑی میں کوئی مسلمان نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا تو اللہ

تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول کرے گا"۔ حضرت ابن سلام نے فرمایا' کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ "جو کسی جگہ بیٹھے اور نماز کا انتظار کر رہا ہو تو نماز پڑھنے تک گویا وہ نماز ہی میں مشغول رہا"۔

مسند احمد میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں : نبی کریم صل اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ کس وجہ سے اس دن کا نام جمعہ رکھا گیا' آپ نے فرمایا : "اس لئے کہ اس دن تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی کو شکل دی گئی اور اسی دن فنا اور حشر ہو گا اور گرفت ہو گی' اسی میں تین آخری گھڑیاں ہیں' جن میں سے ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں جو دعا بھی کی جائے گی' قبول ہو گی"۔

ابن اسحاق نے عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک سے نقل کیا ہے' انہوں نے کہا کہ میرے والد جب نابینا ہو گئے تو میں ان کو لے کر نماز جمعہ کے لئے جاتا تھا' جب وہ جمعہ کی اذان سنتے تو اسعد بن زرارہ کے لئے دعائے استغفار کرتے' میں نے دریافت کیا کہ آپ ہر جمعہ کی اذان سنتے ہیں تو اسعد بن زرارہ کے لئے دعائے استغفار کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اے میرے بیٹے! اسعد بن زرارہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہم لوگوں کو ہزم النبیت کے بنی بیاضہ کے محلے میں جمعہ پڑھایا جو کہ نقیع خضمات میں واقع تھا' میں نے پوچھا' آپ کی تعداد کتنی تھی؟ انہوں نے کہا' چالیس۔ امام بیہقی کہتے ہیں' یہ حدیث حسن اور صحیح الاسناد ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور قباء میں دوشنبہ منگل' بدھ اور جمعرات تک قیام پذیر ہو کر مسجد قباء کی بنیاد ڈالی۔ پھر وہاں سے جمعہ کے دن روانہ ہوئے اور جب بنی سالم بن عوف کے علاقے میں پہنچے تو جمعہ کی نماز کا وقت ہو گیا' آپ نے وادی کے اندر واقع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ یہ جمعہ مسجد نبوی کی تعمیر سے قبل پڑھا گیا تھا۔

ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پہلا خطبہ دیا' وہ مجھے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کے واسطے سے پہنچا' ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی بات منسوب کریں جو آپ نے نہ فرمائی ہو' آپ نے خطبہ دیتے ہوئے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی پھر فرمایا :

لوگو اپنے لئے عمل کا ذخیرہ آگے بھیجو' تمھیں ضرور علم ہو گا' جب تم پر اچانک موت آئے گی اور بندہ

اپنی بکریوں کو بغیر چرواہے کے چھوڑ جائے گا پھر اس سے اللہ تعالیٰ بغیر ترجمان اور بغیر واسطے کے فرمائے گا کہ کیا ہمارے رسول نے تیرے پاس آکر ہمارے احکام نہیں سنائے تھے اور کیا ہم نے تمہیں مال نہیں دیا تھا اور تم پر احسان نہیں کیا تھا' پھر تم نے اپنے لئے کیا کیا ہے۔ وہ دائیں بائیں نظر ڈالے گا تو کچھ نہ دیکھ سکے گا پھر آگے دیکھے گا تو جہنم کے علاوہ کچھ نہ دیکھے گا۔ اس لئے جو شخص اپنے آپ کو جہنم سے بچا سکے خواہ کھجور کے ٹکڑے ہی سے تو ضرور بچالے۔ جس کے پاس یہ بھی نہ ہو تو اچھی بات ہی بولے' اس لئے کہ اس سے بھی نیکی کا دس گنا سے سات سو گنا تک ثواب ملتا ہے' والسلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے فرمایا :

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ اس کی تعریف کرتا ہوں اور اس سے مدد چاہتا ہوں اور اپنی جانوں کے شر سے اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے' اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ گمراہ کرے' اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تنہا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' بے شک سب سے بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے' جس کے دل کو اللہ نے قرآن سے مزین کیا اور کفر کے بعد اسے اسلام میں داخل کیا۔ وہ یقیناً کامیاب رہا اور دوسروں کی باتوں کے مقابلے میں اسے منتخب کر لیا کیونکہ یہ بہترین کلام ہے اور سب سے زیادہ بلیغ ہے۔ جس سے اللہ محبت رکھے' تم بھی اس سے محبت کرو' اپنے دل کی ساری محبت اللہ کے لئے کر دو۔ اللہ کی کلام اور اس کے ذکر سے نہ اکتاؤ' تمہارے قلوب اس کے متعلق کھوٹے نہ ہو جائیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے بہترین عمل اور صالح ترین کلام کا نام دیا ہے اور اس میں تمام حلال و حرام جو انسانوں کو بتلائے گئے' موجود ہیں۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ ذرا بھی شرک نہ کرو اور اس سے کماحقہ ڈرو اور جو بات تم اپنے منہ سے نکالتے ہو' اس کے بہتر الفاظ سے اللہ کی تصدیق کرو' اور اللہ کی رحمت سے آپس میں محبت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے کہ اس کا وعدہ توڑا جائے۔ والسلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔

فصل (۱۴)

یوم جمعہ کی عظمت اور فضیلت کا بیان

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دن (یوم جمعہ) کو بڑی عظمت و شرف سے دیکھا کرتے تھے اور اسے چند خصوصیات سے مخصوص کیا کرتے تھے' چنانچہ اس دن کی فجر کی نماز میں الم سجدہ اور ھل اتی علی الانسان پڑھا کرتے تھے کیونکہ یہ سورتیں ایسے مضامین پر مشتمل ہیں جو اس دن ہوئے یا آئندہ واقع ہوں گے۔

دوسری خصوصیت : یہ ہے کہ جمعہ کے دن اور اس کی شب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود و سلام بھیجنا مستحب ہے کیونکہ اس امت کو دینی و دنیوی ہر طرح کی بھلائی آپ ہی کے ذریعہ ملی ہے اور سب سے بڑی عزت بھی انہیں اسی دن ملے گی کیونکہ امت کو جنت میں اسی دن ان کے محلات اور منازل کی طرف بھیجا جائے گا اور داخلہ کے بعد اسی دن مزید نعمتوں سے نوازے جائیں گے۔ قیامت کے دن اللہ کا قرب اور انعام میں کثرت جمعہ کے دن امام سے قرب اور نماز جمعہ میں سبقت حاصل کرنے والوں کے لئے ہے۔

تیسری خصوصیت : جمعہ کے دن غسل کرنا ہے اور اس کی بڑی تاکید آئی ہے۔ عضو خاص کو چھونے' نکسیر پھوٹنے اور قے ہونے پر وضو کے وجوب اور آخری تشہد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کے وجوب سے زیادہ واجب جمعہ کا غسل ہے۔

چوتھی خصوصیت : جمعہ کے دن خوشبو لگانا' مسواک کرنا ہے۔ جمعہ کے دن ان کا اہتمام دوسرے دنوں سے زیادہ افضل ہے۔ اس طرح نماز جمعہ کے لئے سویرے نکلنا' اللہ کے ذکر میں مشغول ہونا اور امام کے آنے تک نماز وغیرہ میں مصروف رہنا اس دن کی خصوصیات ہیں۔

پانچویں خصوصیت : خطبہ کے دوران خاموشی اختیار کرنا' سورہ جمعہ 'منافقون' سبح اسمک' اور سورہ غاشیہ کی قراءت کرنا ہے۔

چھٹی خصوصیت : جمعہ کے دن اچھا لباس زیب تن کرنا ہے۔

ساتویں خصوصیت : جمعہ کے لئے پیدل جانے والے کو ہر قدم کے بدلے ایک سال کے روزے اور قیام اللیل کا اجر ملتا ہے۔

آٹھویں خصوصیت : یہ ہے کہ اس دن گناہ معاف کئے جاتے ہیں۔

نویں خصوصیت : یہ ہے کہ اس دن ایک ایسی گھڑی ہے جس میں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ دیتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں' آپ کی آواز بلند ہو جاتی اور آپ پر جلال کی کیفیت طاری ہو جاتی جیسے کوئی حملہ سے ڈرا رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ لوگو! دشمن صبح و شام میں تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے. نیز آپ کی عادت مبارکہ خطبہ مختصر دینے اور نماز طویل کرنے کی تھی اور اما بعد کہنے کے بعد خطبہ شروع فرماتے اور صحابہ کرام کو اسلام کی بنیادیں اور شریعت کے قوانین سکھلاتے اور جب کبھی کسی کام کے حکم یا ممانعت کی ضرورت ہوتی تو آپ خطبہ میں بتا دیتے یا منع کر دیتے. جیسا کہ خطبہ دیتے وقت ایک صحابی مسجد میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دو رکعت نماز پڑھ لو''۔

خطبہ میں وقت کے تقاضے اور ضرورت کے مطابق تقریر فرماتے' جب کسی کو آپ ضرورت مند یا بھوکا دیکھتے تو صحابہ کرام کو صدقے کا حکم دیتے اور اس کی ترغیب دیتے تھے۔

خطبہ میں آپ دعا میں یا اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔ جب بارش کی ضرورت ہوتی تو خطبہ میں اس کے لئے دعا کرتے تھے۔ جب لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے تو آپ تشریف لاتے اور سلام کرکے منبر پر تشریف لے جاتے پھر اپنا چہرہ مبارک لوگوں کی طرف کر لیتے اور لوگوں کو سلام کرتے پھر حضرت بلال اذان دیتے' اذان کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دیتے اور کمان یا عصا پر ٹیک لگائے رکھتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر میں تین سیڑھیاں تھیں۔ منبر بننے سے پہلے آپ ایک کھجور کے تنے کے ساتھ ٹیک لگایا کرتے تھے اور یہ منبر مسجد کے درمیان میں نہیں بلکہ مغربی سمت میں اس طرح رکھا گیا تھا کہ اس کے اور دیوار کے بیچ بکری گذرنے بھر کی جگہ تھی۔ جب جمعہ کے علاوہ اس پر بیٹھتے یا جمعہ کے دن خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تو صحابہ کرام اپنا رخ آپ کی طرف کر لیتے تھے۔ آپ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے پھر کچھ دیر بیٹھ جاتے' پھر کھڑے ہو کر دوسرا خطبہ دیتے۔ جب آپ خطبہ سے فارغ ہو جاتے تو حضرت بلال اقامت کہتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو قریب ہو جانے اور خاموش رہنے کا حکم دیتے اور یہ فرماتے کہ اگر کوئی شخص اپنے پاس بیٹھے ساتھی سے یہ کہے کہ خاموش ہو جاؤ تو اس نے بھی ایک لغو حرکت کی اور اپنا جمعہ خراب کیا۔

جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر آپ گھر تشریف لے جاتے تھے اور دو رکعت سنت ادا فرماتے تھے۔ آپ نے جمعہ کے بعد چار رکعت سنت کا بھی حکم دیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ کا قول ہے کہ جب مسجد میں پڑھے تو چار رکعت اور اگر گھر میں پڑھے تو دو رکعت پڑھے۔

فصل (۱۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز عیدین کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز عید گاہ میں پڑھتے تھے۔ یہ عید گاہ مدینہ کے مشرقی دروازے پر ہے جہاں حاجیوں کا محمل رکھا جاتا تھا۔ مسجد نبوی میں عید کی نماز صرف ایک مرتبہ بارش ہو جانے کی وجہ سے پڑھی تھی جیسا کہ سنن ابوداود کی روایت سے پتہ چلتا ہے۔

عید میں آپ بہترین لباس زیب تن فرماتے تھے اور عید الفطر میں نکلنے سے پہلے چند کھجوریں کھا لیتے تھے جن کی تعداد طاق ہوتی تھی لیکن عیدالاضحیٰ میں عید گاہ سے واپس آ جانے تک کچھ نہ کھاتے بلکہ عید گاہ سے واپسی پر قربانی کا گوشت کھاتے۔ عیدین کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم غسل کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں دو ضعیف حدیثیں ہیں لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے جو غیر معمولی طور پر متبع سنت تھے۔ آپ عید گاہ پیدل تشریف لے جاتے۔ وہاں پہنچنے پر نیزہ بطور سترہ آپ کے سامنے نصب کر دیا جاتا کیوں کہ ان دنوں عید گاہ میں کوئی عمارت نہ تھی۔ عیدالفطر کی نماز قدرے تاخیر سے اور عید الاضحیٰ کی نماز جلدی ادا فرماتے تھے۔ حضرت ابن عمر اپنے غیر معمولی متبع سنت ہونے کے باوجود سورج نکلنے سے پہلے عید گاہ کے لئے روانہ نہیں ہوتے تھے اور گھر سے عید گاہ تک تکبیر کہتے جاتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب عید گاہ پہنچ جاتے تو بغیر اذان و اقامت یا الصلاۃ جامعہ جیسے کلمات کہتے ہوئے نماز شروع فرما دیتے تھے۔ نماز عیدین سے پہلے یا بعد آپ یا صحابہ کرام کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے۔

خطبہ سے پہلے آپ دو رکعت نماز عید پڑھتے تھے۔ پہلی رکعت میں تکبیر اولیٰ سمیت سات تکبیریں مسلسل کہتے۔ ہر دو تکبیروں کے درمیان معمولی سا وقفہ کرتے اور ان تکبیروں کے درمیان آپ سے کوئی مخصوص ذکر مروی نہیں ہے لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مذکور ہے کہ وہ حمد و ثنا اور درود پڑھتے تھے اور حضرت ابن عمر ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین بھی کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیریں ختم فرماتے تو قراءت شروع کرتے' پہلی رکعت میں سورہ

فاتحہ کے بعد سورہ "ق" اور دوسری رکعت میں سورہ اقتربت پڑھتے۔ بسا اوقات دو رکعتوں میں سورہ الاعلی اور سورہ الغاشیہ پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ صحیح روایات میں کچھ اور مروی نہیں ہے' اور جب آپ قراءت سے فارغ ہو جاتے تو تکبیر کہتے اور رکوع میں چلے جاتے' پھر دوسری رکعت میں آپ مسلسل پانچ تکبیریں کہتے اور قراءت شروع کر دیتے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اٹھ کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے۔ آپ انہیں وعظ و نصیحت فرماتے اور اچھی باتوں کا حکم دیتے' بری باتوں سے منع کرتے۔ اگر کہیں کوئی لشکر بھیجنا ہوتا تو اس وقت بھیجتے' کسی اور بات کا حکم دینا ہوتا تو حکم دیتے' عید گاہ میں کوئی منبر نہ تھا' زمین پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے۔ صحیحین کی حدیث میں جو ذکر ہے کہ پھر آپ خواتین کی طرف اتر کر تشریف لے گئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کسی اونچی جگہ پر کھڑے تھے جہاں سے اتر کر تشریف لے گئے۔

مدینہ کا منبر تو سب سے پہلے مروان بن حکم نے ایجاد کیا تھا اور لوگوں نے اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا اور پختہ منبر کی تعمیر سب سے پہلے کثیر بن صلت نے مدینہ میں مروان کی گورنری کے زمانہ میں کی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ عید کے موقع پر لوگوں کو بغیر خطبہ سنے گھر چلے جانے کی بھی اجازت دی ہے۔ اسی طرح جب جمعہ کے دن عید پڑ جائے تو اس کی رخصت دی ہے کہ جمعہ کی نماز میں شریک نہ ہوں اور صرف عید کی نماز پر اکتفاء کر لیں اور ظہر کی نماز ادا کریں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن عید گاہ جاتے وقت مختلف راستوں سے آتے جاتے تھے۔

آپ سے مروی ہے کہ عرفہ کے دن (نویں تاریخ) فجر کی نماز سے ایام تشریق آخری دن عصر تک یہ تکبیر کہتے تھے۔«اللهُ أَكْبَرُ، اللهُ أَكْبَرُ، لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ، اللهُ أَكْبَرُ وَلِلهِ الْحَمْدُ»

فصل (۱۶)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سورج گرہن کے موقع پر اسوہ حسنہ

سورج گرہن کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیزی اور گھبراہٹ میں چادر گھسیٹتے ہوئے مسجد تشریف لاتے۔ کسوف شمس کی کیفیت یہ تھی کہ دن کے شروع میں دو یا تین نیزے تک آفتاب بلند ہوا تھا کہ گہن میں آگیا۔ مسجد میں آنے کے بعد آپ نے فورا دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ اور ایک طویل سورہ باآواز بلند تلاوت فرمائی اور پھر طویل رکوع کیا اور پھر رکوع سے سر اٹھایا اور دیر تک کھڑے رہے لیکن یہ قیام پہلے قیام سے کم تھا۔ رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "سمع اللہ لمن حمدہ ربنا ولک الحمد" فرمایا پھر قراءت شروع کی پھر طویل رکوع کیا جو پہلے رکوع سے مختصر تھا' پھر آپ نے سجدہ کیا' جو طویل تھا اور دوسری رکعت بھی اسی طرح ادا فرمائی۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت میں چار رکوع اور چار سجدے کئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز میں جنت اور جہنم کا مشاہدہ کیا اور جنت سے انگور کا ایک خوشہ توڑنے کا ارادہ کیا کہ صحابہ کرام کو دکھا سکیں اور دوزخ میں دوزخیوں کو دیکھا' اس میں ایک عورت کو دیکھا کہ اسے ایک بلی نوچ رہی ہے' جسے عورت نے باندھ دیا تھا اور وہ بھوک اور پیاس کی شدت سے مرگئی تھی۔ عمرو بن مالک کو دیکھا کہ وہ آگ میں اپنی آنتوں کو گھسیٹ رہا ہے۔ یہ پہلا شخص تھا' جس نے حضرت ابراہیم کے دین میں تبدیلی پیدا کی تھی' اور اس میں حاجیوں کے ایک چور کو بھی عذاب میں مبتلا دیکھا۔

نماز سے فراغت کے بعد آپ نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ امام احمد سے مروی ہے کہ آپ نے حمد و ثناء اور کلمہ طیبہ کے پڑھنے کے بعد فرمایا :

"اے لوگو! میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں' کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اپنے پروردگار کے پیغامات کی تبلیغ میں کوئی کوتاہی کی ہے" کچھ لوگوں نے کھڑے ہو کر عرض کیا : ہم لوگ گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور آپ نے امت کو نصیحت فرمائی اور اپنے فرائض منصبی کو بحسن و خوبی

ادا فرما دیا' پھر آپ نے فرمایا "امابعد : بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سورج یا چاند کا گہن میں ہونا یا ان ستاروں کا اپنے برجوں سے ہٹ جانا اہل زمین کے بڑے بڑے لوگوں کی موت کا باعث ہوتا ہے' یقیناً ان کا یہ عقیدہ غلط اور باطل ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جن سے اس کے بندے عبرت حاصل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے ' ان میں سے کون توبہ کرتا ہے' بخدا میں نے کھڑے ہو کر وہ چیزیں دیکھیں جو تم کو دنیا اور آخرت میں پیش آئیں گی اور خدا کی قسم قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک تیس کذاب نہ آجائیں گے۔ ان میں آخری کا نام دجال ہوگا' جس کی بائیں آنکھ مسخ ہوگی گویا کہ ابو یحییٰ کی آنکھ ہو۔ یہ دجال نکلنے کے بعد خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ جو شخص اس کو سچا سمجھ کر ایمان لے آئے گا اور اس کی اتباع کرے گا تو اسے اس کا کوئی عمل صالح کام نہ دے گا اور جو اس کا انکار اور تکذیب کرے گا ' اس کو اس کے گزشتہ برے عمل کی سزا نہیں ملے گی۔ وہ حرم اور بیت المقدس کے علاوہ ساری سرزمین پر غالب آجائے گا اور مسلمانوں کو بیت المقدس میں محصور کر دے گا۔ وہ اس وقت شدید دہشت زدہ ہو جائیں گے تب اللہ تعالیٰ دجال اور اس کے لشکر کو ہلاک کر دے گا' دیواروں کی بنیادیں اور درختوں کی جڑیں پکار پکار کر کہیں گی کہ اے مسلمان! اے مومن! یہ یہودی ' یہ کافر ہے ' اسے قتل کر دے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ ان بھیانک اور خطرناک چیزوں کے بعد دیکھو گے کہ تم لوگ آپس میں پوچھ رہے ہوگے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں میں سے کس کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد پہاڑ اپنی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے اور ہر چیز فنا ہو جائے گی"۔

ایک دوسری روایت میں آیا کہ : آپ نے ہر رکعت تین رکوع یا چار رکوع سے پڑھی یا ہر رکعت ایک رکوع سے ادا فرمائی لیکن ائمہ کبار اس کی صحت کے قائل نہیں ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج گرہن کے موقعہ پر ذکر اللہ ' نماز' دعا' استغفار' صدقہ اور غلاموں کی آزادی کا حکم دیا ہے۔

فصل (۱۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز استسقاء کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بارش طلب کرنے کے متعدد طریقے ثابت ہیں :

پہلا طریقہ : جمعہ کے دن منبر پر دوران خطبہ آپ نے بارش کے لئے دعا فرمائی۔

دوسرا طریقہ : نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے عید گاہ چلنے کا وعدہ کیا' چنانچہ سورج طلوع ہونے کے بعد آپ انتہائی تواضع' انکسار' عاجزی اور خشوع و خضوع کی کیفیات کے ساتھ نکلے اور وہاں پہنچ کر منبر پر چڑھے۔ (اس روایت کی صحت میں کچھ تردد ہے) اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی پھر خطبہ دیا جس کے یہ الفاظ منقول ہیں۔

"سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے' بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے اور روز جزاء کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' جو چاہتا ہے کرتا ہے' اے اللہ تو ہی معبود ہے' تیرے سوا کوئی معبود نہیں' تو جو چاہتا ہے کرتا ہے' تو بے نیاز اور ہم محتاج ہیں' ہمارے لئے بارش نازل فرما اور بارش کو قوت اور سہارا بنا"۔

پھر آپ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور تضرع و عجز و انکسار سے دعا میں مشغول ہو گئے اور ہاتھ اتنا زیادہ اونچا اٹھا لیا کہ دونوں بغلوں کی سفیدی ظاہر ہو گئی پھر آپ لوگوں کی طرف پشت کر کے قبلہ رخ ہو گئے اور اپنی چادر کو پلٹ دیا۔ چنانچہ دائیں طرف کو بائیں اور بائیں طرف کو دائیں طرف کر لیا۔ آپ کے بدن پر سیاہ چادر تھی اور اس طرح قبلہ رخ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام دعاؤں میں مشغول ہو گئے۔

پھر آپ نے منبر سے اتر کر اذان و اقامت کے بغیر عید کی طرح دو رکعت نماز ادا فرمائی جس کی پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ سبح اسمک ربک الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورہ الغاشیہ پڑھی۔

تیسرا استسقاء کا طریقہ : یہ منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے منبر پر جمعہ کے دن کے علاوہ صرف بارش کے لئے دعا فرمائی۔ اس موقع پر آپ سے کوئی نماز منقول نہیں ہے۔

چوتھا استسقاء کا طریقہ : یہ منقول ہے کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے ہاتھ اٹھا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کے لئے دعا فرمائی۔

پانچواں استسقاء کا طریقہ : یہ منقول ہے کہ آپ نے زوراء کے قریب دعا مانگی جو مسجد کے دروازے سے باہر ہے اور جسے آج کل باب السلام کہتے ہیں۔

چھٹا استسقاء کا طریقہ : یہ مذکور ہے کہ آپ نے کسی غزوہ میں اس وقت دعا کی جب مشرکین نے سبقت کر کے پانی پر قبضہ کر لیا تھا اور مسلمان پیاس کی شدت سے بے حال ہو رہے تھے' چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی فریاد کی۔ اس موقع پر بعض منافقین کہنے لگے' جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی سیرابی کے لئے دعا مانگی تھی اگر یہ نبی برحق ہیں تو یہ بھی اپنی قوم کی سیرابی کے لئے دعا کریں۔ آپ کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا' کیا انہوں نے یہ کہا ہے' اب امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور پانی دے گا۔

پھر آپ نے دونوں ہاتھ اللہ کی جناب میں دعا کرنے کے لئے اٹھائے۔ ابھی آپ نے ہاتھ نہ ہٹائے تھے کہ بادلوں نے سایہ کر لیا اور بارش شروع ہو گئی۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بارش کی دعا فرمائی' اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت سے نوازا اور بارش ضرور ہوئی۔

ایک مرتبہ آپ نے بارش کے لئے دعا فرمائی تو ابو لبابہ صحابی نے کھڑے ہو کر عرض کیا' اے اللہ کے رسول' کھجوریں کھلیانوں میں پڑی ہیں' آپ نے فرمایا' اے اللہ! ہمیں سیراب کر' یہاں تک کہ ابو لبابہ ننگے ہو کر اپنے کھلیان کے راستوں کو اپنے ازار سے بند کرنے لگے' چنانچہ بارش ہونے لگی اور لوگ ابو لبابہ کے پاس آئے' کہنے لگے کہ جب تک آپ ننگے کھڑے ہو کر اپنے کھلیان کے راستے کو ازار سے بند نہ کریں گے' بارش بند نہ ہو گی۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا تو بارش بند ہو گئی۔

جب بارش کبھی زیادہ ہونے لگتی تو صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بند ہونے کے لئے دعا کی درخواست کرتے تھے' اس وقت آپ یہ دعا فرماتے تھے :

«اللَّهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلاَعَلَيْنَا، اللَّهُمَّ عَلَى الظِّرَابِ، وَالآكَامِ وَالْجِبَالِ، وَبُطُوْنِ الأَوْدِيَةِ وَمَنَابِتِ الشَّجَرِ»

اے اللہ ہمارے اردگرد ہو اور ہمارے اوپر نہ ہو' اے اللہ ٹیلوں اور پہاڑوں اور وادیوں کے علاقے میں اور درختوں کی جڑوں پر بارش کر۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بارش دیکھتے تو یہ فرماتے تھے : «اللَّهُمَّ صَيِّبًا نَافِعًا»

اے اللہ بارش کو نفع بخش بنا۔

اور اپنا کرتا اتار دیتے تھے۔ تاکہ جسم مبارک پر بارش کا پانی پڑے۔ آپ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تازہ ترین نعمت ہے۔

امام شافعی کا بیان ہے کہ مجھے ایک معتبر شخص نے یزید بن الہاد کے واسطے سے خبر دی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جب سیلاب آتا تھا تو آپ فرماتے تھے "آؤ ہمارے ساتھ اس پانی کی طرف' جسے اللہ تعالیٰ نے طاہر بنایا ہے ہم اس سے طہارت حاصل کریں' اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں"۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ مجھے ایک معتبر شخص نے اسحاق بن عبداللہ کے واسطے سے خبر دی کہ جب سیلاب آیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کرام کے ساتھ سیلاب تک گئے اور فرمایا کہ ہم میں سے ہر ایک اس سے طہارت حاصل کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بادل یا آندھی دیکھتے تو چہرے سے اس کے آثار ظاہر ہو جاتے اور آپ ادھر اودھر دیکھنے لگتے تھے۔ جب بارش ہو جاتی تو گھبراہٹ کے آثار دور ہو جاتے کیونکہ آپ کو خطرہ محسوس ہوتا کہ کہیں یہ عذاب نہ ہو۔

فصل (۱۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوران سفر عبادتوں کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر چار طرح کے ہوتے تھے :

(۱) سفر ہجرت (۲) سفر جہاد' یہ سفر اکثر و بیشتر ہوتے رہتے تھے (۳) سفر عمرہ (۴) سفر حج۔

جب آپ سفر کا ارادہ فرماتے تو ازواج مطہرات کو ساتھ لے جانے کے لئے قرعہ اندازی کرتے جس کا نام نکل آتا اس کو ساتھ لے جاتے' اور سفر حج میں تمام ازواج مطہرات کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

جب آپ سفر کرتے تو دن کے پہلے پہر میں نکلتے۔ جمعرات کے دن نکلنا زیادہ پسند کرتے اور آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرماتے کہ "اے اللہ امت کے سویرے نکلنے میں برکت عطا فرما"۔

جب آپ کوئی لشکر یا وفد بھیجنا چاہتے تو اسے بھی دن کے پہلے پہر بھیجتے۔ مسافروں کو آپ تاکید فرماتے کہ اگر وہ تین ہوں تو ایک کو امیر بنا لیں۔ آپ نے تنہا سفر کرنے سے منع کیا ہے اور فرمایا کہ "ایک سوار شیطان ہے' دو سوار دو شیطان ہیں اور تین مسافر سے دراصل قافلہ بنتا ہے"۔

اور ثابت ہے کہ جب آپ سفر کے لئے اٹھتے تو یہ دعا پڑھتے :

«اَللّٰهُمَّ إِلَيْكَ تَوَجَّهْتُ، وَبِكَ اعْتَصَمْتُ، اَللّٰهُمَّ اكْفِنِي مَا أَهَمَّنِي وَمَا لَا أَهْتَمُّ لَهُ، اَللّٰهُمَّ زَوِّدْنِيَ التَّقْوَى، وَاغْفِرْ لِي ذَنْبِي، وَوَجِّهْنِي لِلْخَيْرِ أَيْنَمَا تَوَجَّهْتُ»

اے اللہ تیری ہی طرف متوجہ اور تیری ہی پناہ میں ہوں۔ اے اللہ میرے لئے اہم اور غیر اہم چیز میں میری کفایت کر' تقویٰ کو میرا توشہ بنا' میرے گناہ بخش دے' جدھر توجہ کروں بھلائی کی طرف میرا رخ کر۔

جب سواری حاضر کی جاتی تو رکاب میں پیر رکھتے ہوئے بسم اللہ کہتے اور جب جم کے بیٹھ جاتے تو فرماتے :

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْنَ وَ إِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ»

تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے ہمارے لئے اسے مسخر کردیا' ورنہ ہم خود اسے زیر نہ کر سکتے تھے' ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

پھر تین مرتبہ "الحمدللہ" اور تین مرتبہ "اللہ اکبر" کہتے اور اس کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے :

«سُبْحَانَكَ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْلِي إِنَّهُ لَايَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ»

تو سارے عیوب سے پاک ہے' بلاشبہ میں نے اپنے اوپر ظلم کیا' اب تو مجھے بخش دے تیرے سوا گناہوں کو کوئی نہیں بخشتا۔

آپ یہ دعا بھی پڑھتے تھے :

«اللَّهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ فِي سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى، وَمِنَ الْعَمَلِ مَاتَرْضَى، اللَّهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا، وَاطْوِعَنَّا بُعْدَهُ، اللَّهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ، وَالْخَلِيْفَةُ فِي الأَهْلِ، اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُبِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ، وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ، وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الأَهْلِ وَالْمَالِ»

اے اللہ ہم اپنے اس سفر میں تجھ سے نیکی و تقوی اور اس عمل کا سوال کرتے ہیں جس سے تو راضی ہو' اے اللہ ہم پر ہمارا سفر آسان کردے اور ہمارے لئے اس کی دوری لپیٹ دے' اے اللہ سفر میں تو ہی آقا ہے اور گھر میں تو ہی محافظ ہے' اے اللہ میں سفر کی ایذاء اور برے منظر سے اور گھر اور مال و دولت میں تکلیف دہ واپسی سے پناہ چاہتا ہوں۔

جب آپ سفر سے واپس آتے تو مذکورہ دعا میں ان الفاظ کا اضافہ کردیتے :

«آئِبُوْنَ، تَائِبُوْنَ، عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ»

ہم لوٹنے والے' توبہ کرنے والے' بندگی کرنے والے' اور اپنے پروردگار کا شکر کرنے والے ہیں۔

نیز آپ اور صحابہ کرام جب بلندی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے اور جب نیچے وادیوں میں اترتے تو تسبیح کہتے' اور جب کسی بستی کے پاس آتے اور اس میں داخل ہونا چاہتے تو یہ دعا پڑھتے تھے :

«اللَّهُمَّ رَبَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَمَا أَظْلَلْنَ، وَرَبَّ الأَرْضِيْنَ السَّبْعِ وَمَا أَقْلَلْنَ، وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنِ وَمَا أَضْلَلْنَ، وَرَبَّ الرِّيَاحِ وَمَاذَرَيْنَ، أَسْأَلُكَ خَيْرَ

هٰذِهِ الْقَرْيَةِ، وَخَيْرَ أَهْلِهَا، وَخَيْرَ مَافِيْهَا، وَأَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ أَهْلِهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا»

اے ساتوں آسمانوں اور ان کے زیر سایہ چیزوں کے پروردگار' ساتوں زمینوں اور ان کی اٹھائی چیزوں کے پروردگار' شیاطین اور ان کے گمراہ کردہ لوگوں کے پروردگار' ہواؤں اور ان کی پراگندہ کی ہوئی چیزوں کے پروردگار میں تجھ سے اس بستی کی اور اس میں رہنے والے لوگوں کی اور اس کی دوسری تمام چیزوں کی بھلائی کا سوال کرتا ہوں' اور اس بستی کی اور اس کے تمام رہنے والوں کی اور اس میں موجودہ تمام چیزوں کی برائی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر کی حالت میں چار رکعت والی نماز کو دو رکعت پڑھتے تھے۔ حضرت امیہ بن خالد' حضرت عبداللہ بن عمر سے دریافت کرتے ہیں ہم حضر اور حالت خوف کی نماز کا تذکرہ قرآن کریم میں پاتے ہیں لیکن سفر کی نماز کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ملتا' حضرت عبداللہ بن عمر نے ان سے کہا کہ اے ہمارے بھائی' اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے پاس اس وقت مبعوث فرمایا جب ہم لوگ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ اب ہم اسی طریقے سے کام کرتے ہیں' جس طرح آپ کو کرتے دیکھا ہے۔

سفر کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ آپ فرض پر اکتفاء کرتے تھے' سنتوں میں فجر کی سنت اور نماز وتر کے علاوہ سفر میں کچھ اور پڑھنا ثابت نہیں' لیکن آپ نے نوافل پڑھنے سے منع نہیں فرمایا ہے لیکن اس کی حیثیت سنت موکدہ کی نہیں بلکہ محض نفل ہی کی رہتی ہے' آپ سے یہ ثابت ہے کہ فتح کے دن چاشت کے وقت آپ نے آٹھ رکعتیں پڑھی تھیں۔

سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نفل نمازیں سواری پر پڑھتے تھے خواہ اس کا رخ کسی طرف بھی ہو' رکوع آپ اشارہ سے کرتے تھے۔ جب آپ زوال سے پہلے سفر شروع کرنے کا ارادہ رکھتے' ظہر کو عصر تک موخر کر دیتے' اگر زوال کے بعد سفر کرتے تو ظہر پڑھ کے سوار ہوتے تھے۔ اگر کسی سفر میں جلدی ہوتی تو مغرب کی نماز موخر کر کے عشاء کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ اور دو نمازوں کے درمیان جمع کرنا سواری پر اور سواری سے اترنے کی حالت میں آپ کی سنت مطہرہ نہیں ہے۔

فصل (۱۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلاوت قرآن کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معمول کی پابندی کرتے تھے' آپ قرآن پاک ترتیل سے (ایک ایک حرف واضح کرکے) پڑھا کرتے تھے' ایک ایک آیت پر وقفہ کرتے' مد کے حروف کو کھینچ کر پڑھتے مثلاً الرحمٰن الرحیم کو مد سے پڑھتے تھے اور تلاوت کے آغاز میں آپ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھتے اور کبھی یہ کہتے تھے :

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ»

میں شیطان رجیم اور اس کے وسوسہ' اس کی پھونک اور اس کے جادو سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کی زبان سے قرآن سننا بھی پسند فرماتے تھے' آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم فرمایا تو انہوں نے آپ کے سامنے تلاوت کی' آپ کو سنتے وقت اس قدر خشوع طاری ہوا کہ آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور آنسو جاری ہو گئے۔

آپ کھڑے' بیٹھے' لیٹے' باوضو اور بغیر وضو ہر حالت میں قرآن پڑھتے تھے لیکن حالت جنابت میں قرآن نہیں پڑھتے تھے۔

آپ کبھی کبھی آواز کھینچ کر بہترین انداز میں قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے اور حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ آپ کی آواز کھینچنے کی کیفیت تین مرتبہ آ۔ آ۔ آ کی صورت میں بیان کی ہے جیسا کہ امام بخاری نے ذکر کیا ہے۔

جب آپ سے منقول مندرجہ ذیل احادیث کو جمع کیا جائے :

«زَيِّنُوْا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ»

قرآن پاک کو اپنی آوازوں سے زینت بخشو۔

«مَاأَذِنَ اللهُ لِشَيْءٍ كَأَذْنِهِ لِنَبِيٍّ حَسَنِ الصَّوْتِ يَتَغَنَّى بِالْقُرْآنِ»

اللہ تعالیٰ اچھی آواز والے نبی کے قرآن نغمہ کے ساتھ پڑھنے کو جس طرح سنتا ہے اس طرح کسی اور چیز کو نہیں سنتا۔

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آواز کو قصداً اور اختیار سے کھینچتے تھے جیسا کہ عبداللہ بن مغفل سے مروی ہے۔

غنا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک جو بلا تکلف ہو' یہ جائز ہے خواہ قصداً تزیین کی جائے کیونکہ ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میرا قرآن آپ سن رہے ہیں تو میں اور اچھی طرح پڑھتا۔ سلف اسی طرح کی تحسین کیا کرتے تھے اور اسی مفہوم پر تمام دلیلوں کو محمول کیا جائے گا۔

غنا کی دوسری صورت یہ ہے کہ اسے فن کی طرح الحان اور اوزان کی قسموں کے ساتھ سیکھا جائے اس کو سلف نے مکروہ قرار دیا ہے اور کراہت کی دلیلوں سے یہی صورت مراد ہے۔

فصل (۲۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مریضوں کی عیادت کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب صحابہ کرام میں کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ ایک یہودی خادم اور اپنے مشرک چچا کی عیادت کے لئے بھی تشریف لے گئے اور ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی۔ چنانچہ یہودی نے اسلام قبول کر لیا۔

آپ مریض کے قریب تشریف لے جاتے اور اس کے سرہانے بیٹھ کر حال دریافت فرماتے تھے۔ دائیں ہاتھ سے مریض کو سہلاتے اور یہ دعا پڑھتے تھے :

«اَللّٰهُمَّ رَبَّ النَّاسِ أَذْهِبِ الْبَأْسَ وَاشْفِ أَنْتَ الشَّافِي، لَاشِفَاءَ إِلَّا شِفَاءُكَ، شِفَاءً لَايُغَادِرُ سَقَمًا»

اے اللہ لوگوں کے پروردگار' دکھ دور فرما' اور شفا عطا فرما' تو ہی شفا دینے والا ہے' تیرے سوا کہیں سے کوئی شفا نہیں۔ ایسی شفا دے جو کسی بیماری کو رہنے نہ دے۔

اور آپ مریض کے لئے تین بار دعا فرماتے تھے' جیسا کہ آپ نے حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے دعا کی : "اللهم اشف سعدا" (اے اللہ سعد کو شفا دے)۔

مریض کی عیادت کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے «لَابَأْسَ طَهُورٌ إِنْ شَآءَ اللهُ» کبھی "کفارہ و طهورا" فرماتے تھے یعنی کوئی فکر کی بات نہیں۔ ان شاء اللہ یہ بیماری گناہوں سے پاک کرنے والی ہے۔

اور جس کے زخم یا کوئی اور تکلیف ہوتی تو آپ اس پر دم کیا کرتے' چنانچہ شہادت کی انگلی زمین پر رکھ دیتے پھر اسے اٹھا لیتے اور یہ دعا پڑھتے :

«بِسْمِ اللهِ تُرْبَةُ أَرْضِنَا بِرِيْقَةِ بَعْضِنَا يُشْفَى سَقِيْمُنَا بِإِذْنِ رَبِّنَا»

اللہ کے نام سے ہماری زمین کی مٹی ہم میں سے بعض کے لعاب سے ہمارے بیمار کو شفا دے گی'

ہمارے رب کی اجازت سے۔

یہ صحیحین کی روایت ہے' اس سے ستر ہزار والی حدیث میں (لا یرقون) (جو دم نہیں کریں گے) کا لفظ بالکل باطل ہو جاتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ راوی کی غلطی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مریض کی عیادت کے لئے کوئی دن یا کوئی وقت مقرر نہیں کرتے تھے' بلکہ آپ دن اور رات کے تمام اوقات میں (حسب ضرورت) مریضوں کی عیادت فرماتے تھے اور امت کے لئے اسی کو مشروع فرمایا ہے۔

آپ آنکھ کے مریضوں کی بھی عیادت فرماتے' کبھی مریض کی پیشانی پر دست مبارک رکھتے پھر اس کے سینے اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور دعا فرماتے "اے اللہ اسے شفا دے" اور آپ چہرے پر بھی ہاتھ پھیرتے اور جب مریض کی صحت سے مایوس ہو جاتے تو یہ آیت پڑھتے : "انا للہ وانا الیہ راجعون"

جنازے کے سلسلے میں آپ کا طریقہ انتہائی کامل اور تمام دوسری قوموں سے بالکل مختلف تھا' اس میں میت اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا تھا' اور مردے کے ساتھ معاملہ کرنے میں زندہ شخص اپنی بندگی و عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔

جنازوں میں آپ کی سنت طیبہ اللہ تعالیٰ کی پوری اطاعت و عبدیت کا اظہار تھی اور میت کو اچھی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف بھیجتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ صف بستہ کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے اور میت کیلئے دعائے مغفرت فرماتے اور اس کے ساتھ چل کر قبر میں دفن کرتے' پھر آپ اور صحابہ کرام کھڑے ہو کر اس کے لئے ثابت قدمی کی دعا فرماتے۔ گاہے گاہے اس کی قبر پر تشریف لے جاتے اور سلام کر کے دعا فرماتے تھے۔

مریض کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شروع سے ہی سلوک ذکر آخرت' وصیت اور توبہ و استغفار کرنے کی ہدایات پر مبنی ہوتا' اور اس کے پاس موجود لوگوں کو حکم دیتے کہ قریب الموت مریض کو کلمہ شہادت "لا الہ الا اللہ" کی تلقین کرتے رہیں تاکہ کلمہ طیبہ ہی اس کا آخری کلام ہو' پھر ان اقوام کی عادات اور طور طریقے اختیار کرنے سے منع فرماتے' جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتیں یعنی ایسے مواقع پر منہ پیٹتی' چیختی چلاتی اور بے حد واویلا مچاتی ہیں۔

آپ نے میت کے لئے رونے اور اظہار رنج و افسوس کی اجازت دی ہے جس میں چیخنا و چلانا نہ ہو' دل سے غمگین رہنے کا حکم ہے' چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ "آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل غمگین رہتا

ہے اور ہم وہی کہتے ہیں جس سے ہمارا پروردگار راضی ہو" آپ نے اپنی امت کے لئے الحمداللہ اور انااللہ وانا الیہ راجعون پڑھنا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنا مسنون قرار دیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ میت کی تجہیزو تدفین میں جلدی کرتے تھے۔ اسے غسل دیتے' خوشبو لگاتے اور سفید کپڑوں میں کفن دیتے اور پھر جنازے کی نماز پڑھتے' اور اس کے بعد قبر تک ساتھ جاتے تھے' جب صحابہ کرام نے دیکھا کہ یہ کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دے رہا ہے تو وہ خود میت کی تیاری کرتے پھر میت کو اٹھاتے' اور نماز جنازہ مسجد کے باہر پڑھتے اور کبھی مسجد کے اندر بھی پڑھ لیتے' جیسا کہ آپ نے سہیل بن بیضاء اور ان کے بھائی کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھائی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ جب کوئی انتقال کر جائے تو اس کا چہرہ اور بدن چھپا دیا جائے۔ اس کی آنکھیں بند کر دی جائیں۔ بسا اوقات میت کا خود بوسہ لیتے جیسا کہ آپ حضرت عثمان بن مظعون کا بوسہ لے کر رو پڑے۔

آپ میت کو تین یا پانچ مرتبہ یا غسل دینے والے کے خیال کے مطابق (حسب ضرورت) زیادہ غسل دینے کا حکم دیتے تھے اور آخری مرتبہ کافور استعمال کرنے کو کہتے تھے۔

میدان جنگ کے شہداء کو غسل نہیں دیتے تھے اور ہتھیار و زرہ وغیرہ اتار کر اسی کپڑے میں تدفین کر دیتے تھے اور نماز جنازہ بھی نہیں پڑھتے تھے اور حالت احرام میں فوت ہو جانے والے کو آپ نے پانی اور بیری سے غسل دیا اور احرام ہی کے کپڑے میں اسے کفن دینے کا حکم دیا اور اسے خوشبو لگانے اور سر چھپانے سے منع فرمایا۔

میت کے متعلقین کو اچھے اور سفید کپڑے کا کفن پہنانے کا حکم دیتے اور زیادہ مہنگے کفن سے منع فرماتے تھے۔ اور اگر کفن چھوٹا ہوتا اور پورے بدن کو چھپانے سے قاصر ہوتا تو اس کا سر چھپا دیتے اور پاؤں پر گھاس ڈال دیتے تھے۔

نماز جنازہ کے لئے جب کوئی میت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائی جاتی تو آپ دریافت فرماتے' کیا اس پر قرض ہے یا نہیں؟ اگر اس پر قرض نہ ہوتا تو اس پر نماز پڑھ دیتے اور اگر قرض ہوتا تو خود نہ پڑھتے بلکہ صحابہ کو نماز پڑھنے کا حکم دے دیتے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا (نماز) حصول مغفرت اور وجوب شفاعت کا حکم رکھتی ہے اور ادھر مقروض کا قرض دخول جنت کے لئے مانع ہے۔

چنانچہ جب کثرت فتوحات کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دولت آگئی تو آپ قرضدار پر نماز جنازہ پڑھنے لگے کیونکہ آپ اس مال کے ذریعہ اس کا قرض ادا فرما دیتے تھے اور اس کا ترکہ اس کے ورثاء کو دے دیتے تھے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ شروع فرماتے تو تکبیر کہتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرتے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک جنازے پر نماز پڑھی تو پہلی تکبیر کے بعد بلند آواز سے سورہ فاتحہ پڑھی اور (بعد میں) فرمایا تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے۔

ہمارے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں ہے بلکہ سنت ہے اور حضرت ابو امامہ بن سہل نے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے نماز جنازہ میں درود شریف پڑھنا نقل کیا ہے۔

یحیی بن سعید انصاری نے سعید بن مقبری سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے نماز جنازہ کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ میں تمہیں بتاتا ہوں' ابتدا میں تکبیر کہو' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو اور یہ دعا پڑھو :

«اللَّهُمَّ إِنَّ عَبْدَكَ فُلَانًا كَانَ لَايُشْرِكُ بِكَ، وَأَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ، إِنْ كَانَ مُحْسِنًا فَزِدْ فِي إِحْسَانِهِ، وَإِنْ كَانَ مُسِيئًا فَتَجَاوَزْ عَنْهُ، اللَّهُمَّ لَاتَحْرِمْنَا أَجْرَهُ وَلَاتُضِلَّنَا بَعْدَهُ»

اے اللہ بے شک تیرا فلاں بندہ تیرے ساتھ شرک نہ کرتا تھا اور تو ہی حقیقت کو زیادہ جانتا ہے' اگر وہ نیک تھا تو اس کی نیکیوں میں اضافہ فرما اور اگر برا تھا تو اس سے درگذر فرما' اے اللہ ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ کرنا اور اس کے بعد ہمیں گمراہ نہ کرنا۔

مردے پر نماز جنازہ کا مقصد دعائے خیر ہے' اسی وجہ سے آپ سے ثابت ہے اور دعا کا جتنا ذکر ملتا ہے اتنا سورہ فاتحہ یا درود کا ذکر نہیں ملتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا بھی ثابت ہے۔

«اللَّهُمَّ إِنَّ فُلَانَ ابْنَ فُلَانٍ فِي ذِمَّتِكَ وَحَبْلِ جِوَارِكَ، فَقِهِ فِتْنَةَ الْقَبْرِ وَعَذَابَ النَّارِ، وَأَنْتَ أَهْلُ الْوَفَاءِ وَالْحَقِّ فَاغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ، إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ»

اے اللہ فلاں بن فلاں تیری پناہ اور تیری ہمسائیگی کی امان میں ہے' تو اسے قبر کے فتنہ اور جہنم کی آگ سے نجات دے' تو وفا اور حق والا ہے' اے اللہ تو اسے بخش دے اور اس پر رحم فرما' بیشک تو بخشنے والا ہے' رحم کرنے والا ہے۔

اور یہ دعا بھی منقول ہے :

«اللَّهُمَّ أَنْتَ رَبُّهَا وَأَنْتَ خَلَقْتَهَا وَأَنْتَ رَزَقْتَهَا، وَأَنْتَ هَدَيْتَهَا لِلإِسْلاَمِ وَأَنْتَ قَبَضْتَ رُوْحَهَا تَعْلَمُ سِرَّهَا وَعَلاَنِيَتَهَا، جِئْنَا شُفَعَآءَ فَاغْفِرْ لَهَا»

اے اللہ ' تو اس میت کا رب ہے' تو نے اسے پیدا کیا' رزق دیا' اسلام کی توفیق دی' اور اس کی روح قبض کی' تو اس کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے' ہم سفارش بن کر آئے ہیں' تو اسے بخش دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میت کے لئے اخلاص سے دعا کرنے کا حکم دیتے تھے۔ نماز جنازہ میں آپ چار تکبیریں کہتے تھے' اور پانچ تکبیریں بھی آپ سے ثابت ہیں۔ صحابہ کرام سے چار' پانچ اور چھ تکبیریں تک بھی ثابت ہیں۔ علقمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے کچھ ساتھی شام سے آئے ہیں' انہوں نے میت پر نماز جنازہ میں پانچ تکبیریں کہی ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میت پر تکبیر کہنے میں کوئی عدد نہیں ہے' امام جتنی تکبیریں کہے' اتنی تکبیریں کہو اور جب ختم کرے تب ختم کردو۔

امام احمد سے پوچھا گیا کہ صحابہ کرام میں کسی کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ وہ نماز جنازہ میں دو سلام پھیرتے تھے۔ انہوں نے کہا نہیں' لیکن چھ صحابیوں کے بارے میں منقول ہے کہ وہ دائیں طرف ایک مختصر سا سلام پھیرتے تھے۔ انہوں نے حضرت ابن عمر' حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کا نام لیا۔

نماز جنازہ میں رفع یدین کے متعلق امام شافعی سے منقول ہے کہ ایک صحابی کے اثر اور نماز میں سنت پر قیاس کرتے ہوئے رفع یدین کیا جائے گا۔ صحابی کے اثر سے ان کی مراد یہ ہے کہ حضرت ابن عمر اور حضرت انس سے ثابت ہے کہ وہ نماز جنازہ کی ہر تکبیر پر رفع یدین کرتے تھے۔

نماز جنازہ فوت ہو جانے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر پر نماز جنازہ پڑھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک بار ایک رات کے بعد نماز جنازہ پڑھی' ایک بار تین رات کے بعد اور ایک بار ایک ماہ کے بعد پڑھی

اور اس سلسلے میں کسی مدت کی تحدید نہیں کی گئی۔

امام مالک کے یہاں ولی کے علاوہ کسی کو بعد میں نماز جنازہ پڑھنے کی اجازت نہیں ہے' جب ولی نماز جنازہ میں موجود نہ ہو۔

نماز جنازہ میں آپ کا معمول یہ تھا کہ مرد کے سر کے قریب اور عورت کے وسط میں کھڑے ہوتے تھے' اور بچے کی نماز جنازہ بھی پڑھنا آپ سے ثابت ہے' اور خودکشی کرنے والے اور مال غنیمت میں خیانت کرنے والے پر آپ نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے۔

حد زنا وغیرہ میں قتل کئے جانے والے پر نماز جنازہ پڑھنے کے سلسلہ میں اختلاف ہے' چنانچہ آپ سے ثابت ہے کہ قبیلہ جہنیہ کی جس عورت کو رجم کیا گیا تھا' اس پر آپ نے نماز جنازہ پڑھی تھی' البتہ ماعز کی نماز جنازہ کے بارے میں اختلاف ہے' ان دونوں روایتوں میں تطبیق کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کوئی تعارض نہیں پایا جاتا' کیونکہ اس میں صلاۃ سے مراد دعا ہے اور ماعز کی نماز جنازہ از راہ تادیب چھوڑ دی تھی یا پھر یوں کہا جائے کہ الفاظ میں تعارض ہے تو پھر دوسری حدیث کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ نماز جنازہ کے بعد قبرستان تک پیدل تشریف لے جاتے تھے۔ سواری والے لوگوں کو پیچھے چلنے کا حکم دیا ہے اور پیدل چلنے والوں کو قریب رہنے کا حکم دیا ہے۔ چاہے وہ پیچھے ہوں یا آگے' دائیں ہوں یا بائیں۔ آپ میت کو تیز لے جانے کا حکم دیتے' چنانچہ صحابہ تقریبا دوڑتے ہوئے لے جاتے تھے اور آپ خود بنفس نفیس پیدل چلتے تھے اور فرماتے تھے' میں کیسے سوار ہو سکتا ہوں جب کہ فرشتے پیدل چل رہے ہیں۔ جب فارغ ہو جاتے تو بسا اوقات سواری پر واپس آتے۔

جنازے کو رکھنے سے پہلے آپ نہیں بیٹھتے تھے اور فرماتے تھے' جب تم جنازہ کے ساتھ چلو تو رکھ دینے سے پہلے نہ بیٹھو۔

ہر مرنے والے کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا آپ کی سنت نہیں ہے اور آپ سے حضرت نجاشی پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا ثابت ہے' اس طرح غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا اور چھوڑ دینا دونوں آپ کی سنت طیبہ ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی جگہ انتقال کر گیا جس پر نماز نہ پڑھی گی ہو تو اس پر نماز پڑھی جائے گی۔ اس وجہ سے نجاشی پر نماز جنازہ پڑھی گئی' کیونکہ ان کی وفات کافروں کے درمیان ہوئی تھی اور وہاں ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ کے سامنے سے جب جنازہ گزرا تو اس کے لئے کھڑے ہو گئے اور کھڑے ہونے کا حکم دیا' اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ بیٹھے رہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں کا قول ہے کہ کھڑا ہونا منسوخ ہو گیا ہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم استحباب کو بتانے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور بیان جواز کے لئے نہیں کھڑے ہوئے تھے اور یہی تاویل زیادہ مناسب ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت اور زوال کے وقت مردے کو دفن نہ کیا جائے اور یہ بھی سنت تھی کہ قبر بغلی اور گہری کھدواتے اور مردے کے سرہانے اور پائتانے کی جگہ کشادہ کرواتے تھے اور آپ سے منقول ہے کہ جب مردے کو قبر میں رکھا جاتا تو یہ دعا پڑھتے تھے :

«بِسْمِ اللهِ وَبِاللهِ وَعَلَى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللهِ»

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "بسم اللہ وفی سبیل اللہ وعلی ملتہ رسول اللہ" یعنی اللہ کے نام سے اور اللہ کی راہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر۔

اور آپ سے یہ بھی منقول ہے کہ آپ میت کی قبر پر دفن کے وقت سر کی جانب تین بار چلو بھر کر مٹی ڈالتے اور جب دفن سے فارغ ہو جاتے تو آپ اور آپ کے صحابہ قبر کے پاس کھڑے ہو کر مردے کی ثابت قدمی کے لئے دعا فرماتے اور اس کا آپ نے حکم بھی دیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبر کے پاس بیٹھ کر پڑھنا اور تلقین کرنا ثابت نہیں ہے۔ قبروں کو بلند کرنا' پکی بنانا' لیپنا' ان پر قبہ بنانا' یہ سب چیزیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں بلکہ سنت کے صریح خلاف ہیں۔ ایک دفعہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ جس تصویر کو دیکھیں اس کو مٹا دیں' جو اونچی قبر دیکھیں اس کو برابر کر دیں' اس وجہ سے تمام بلند اور اونچی قبروں کو ہموار اور برابر کرنا سنت طیبہ ہے۔

نیز آپ نے قبر پر چونا لگانے اور اس پر تعمیر کرنے سے منع فرمایا ہے اور ان پر کتبے تحریر کرنے کی مخالفت کی ہے۔ علامت کے طور پر پتھر رکھنے کی اجازت دی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے اور ان پر چراغ جلانے سے ممانعت فرمائی

ہے اور ایسا کرنے والوں پر لعنت کی ہے' اور قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے اور اپنی قبر پر میلہ وعید منانے سے بھی منع کیا ہے۔

اور آپ کی سنت یہ تھی کہ قبروں کی توہین نہ کی جائے اور نہ انہیں روندا جائے اور نہ ان پر بیٹھا جائے اور نہ ٹیک لگائی جائے۔ اور نہ اس شدت سے تعظیم کی جائے کہ انہیں سجدہ گاہ بنا لیا جائے اور ان کے پاس یا ان کی طرف نماز پڑھی جانے لگے' میلے شروع ہو جائیں اور انہیں بت بنا لیں گویا ان کی عبادت ہو رہی ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی قبروں کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور ان کے لئے دعا و استغفار کرتے تھے۔ یہی زیارت قبور ہے جو امت کے لئے مشروع اور مسنون ہے۔ زیارت کے وقت مسلمانوں کو یہ دعا پڑھنے کا حکم دیا ہے :

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ، وَإِنَّا إِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ، نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ»

مومنوں اور مسلمانوں کے اہل دیار! تم پر سلامتی ہو' اور بے شک اگر اللہ نے چاہا تو ہم تم سے ملنے والے ہیں' ہم اللہ سے اپنے لئے اور تمہارے لئے عافیت کی دعا کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبروں کی زیارت کے وقت وہی کچھ کرتے اور کہتے تھے جو نماز جنازہ کے وقت کرتے اور کہتے تھے' لیکن اہل شرک نے مردوں کو پکارنا' ان کو شریک کرنا' اس سے حاجتیں مانگنا' مدد چاہنا' اور ان کی طرف توجہ ایسے کرنے لگے جو آپ کی سنت اور شریعت کے صریحا خلاف ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ توحید اور مردوں کے ساتھ حسن سلوک پر مبنی ہے۔ آپ میت کے گھر والوں کی تعزیت کرتے تھے لیکن وقت مقرر کر کے اجتماع کرنا اور قبر پر یا دوسری جگہ جمع ہو کر قرآن پڑھنا آپ کا اسوہ حسنہ نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ بھی تھی کہ میت کے گھر والے لوگوں کے لئے کھانے وغیرہ کا انتظام نہ کریں' بلکہ میت کے اہل خانہ کے لئے کھانا تیار کریں اور ان کو کھلائیں' اور میت کے لئے باقاعدہ اعلان و منادی سے آپ منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسا کرنا جاہلی دور کا عمل ہے۔

فصل (۲۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز خوف کا طریقہ

اللہ تعالیٰ نے خوف و سفر کی حالت میں ارکان نماز اور تعداد رکعات میں کمی کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ جب سفر میں خوف نہ ہو تو تعداد رکعات میں قصر کرنے اور جب خوف ہو سفر نہ ہو تو تنہا ارکان میں قصر کی اجازت عطا کی ہے' یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ تھی اور اس سے سفر و خوف کی حالت میں آیت قرآنی کو مقید کرنے کی حکمت ظاہر ہوتی ہے۔

نماز خوف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ جب دشمن آپ کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا تو تمام مسلمان آپ کی اقتداء کرتے اور آپ اپنے پیچھے مسلمانوں کو دو صفوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ آپ تکبیر کہتے تو وہ سب تکبیر کہتے' آپ رکوع کرتے تو وہ سب رکوع کرتے' پھر آپ سر اٹھاتے وہ بھی آپ کے ساتھ سر اٹھا لیتے' پھر پہلی صف کے لوگ آپ کے ساتھ سجدہ کرتے اور دوسری صف والے دشمن کے مقابل کھڑے رہتے۔ جب آپ دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہو جاتے تو دوسری صف والے اپنے دونوں سجدے کرتے' پھر کھڑے ہو کر پہلی صف کی جانب بڑھتے اور پہلی صف والے پیچھے آ کر دوسری صف والوں کی جگہ لے لیتے تاکہ پہلی صف کی فضیلت دونوں کو حاصل ہو جائے اور دوسری صف والے بھی آپ کے ساتھ دو سجدے پا جائیں۔ یہ غیر معمولی عدل و انصاف کی علامت ہے۔

اسی طرح جب آپ دوسری رکعت میں رکوع کرتے تو دونوں صف والے پہلی رکعت کی طرح عمل کرتے اور جب آپ تشہد کے لئے قعدہ کرتے تو دوسری صف والے دو سجدے کر لیتے اور پھر آپ کے ساتھ تشہد میں شریک ہو جاتے۔ اس طرح سب کے ساتھ سلام پھیرتے۔

اگر دشمن قبلہ کے بجائے کسی دوسری سمت ہوتا' اس وقت بھی آپ دو جماعتیں بنا لیتے۔ ایک جماعت دشمن کے مقابلہ میں کھڑی رہتی اور دوسری جماعت کے ساتھ آپ نماز پڑھتے۔ یہ گروہ ایک رکعت نماز پڑھ کر واپس چلا جاتا۔ دوسرا گروہ آ کر آپ کے ساتھ دوسری رکعت پڑھتا پھر آپ سلام پھیر

دیتے اور دونوں گروہ ایک ایک رکعت بعد میں پوری کر لیتے۔ کبھی آپ دو جماعتوں میں سے ایک کو ایک رکعت پڑھا کر کھڑے رہتے اور وہ دوسری پوری کر کے واپس چلی جاتی اور پھر دوسری جماعت آ کر آپ کے ساتھ دوسری رکعت ادا کرتی۔ جب آپ تشہد میں بیٹھتے تو یہ اٹھ کر ایک رکعت پوری کرتی' آپ تشہد میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے اور اس کے تشہد پڑھنے کے بعد سلام پھیرتے' کبھی آپ ایک جماعت کو دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیتے پھر دوسری جماعت آتی تو اس کو بھی آپ دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ آپ کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر ایک جماعت چلی جاتی اور ایک رکعت قضا نہ کرتی پھر دوسری جماعت آتی تو اس کو بھی آپ ایک رکعت ہی پڑھاتے اور وہ بھی دوسری رکعت قضا نہ کرتی۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو رکعت پوری ہو جاتی اور عام لوگوں کی صرف ایک ایک ہوتی' یہ تمام صورتیں نماز میں جائز ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ نماز خوف کے چھ یا سات طریقے ثابت ہیں اور سب جائز ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہر جماعت آپ کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور پھر دوسری قضا نہ کرے تو یہ جائز ہے' یہ حضرت جابر' ابن عباس' طاؤس' مجاہد' حسن' قتادہ' حکم اور اسحاق کا مذہب ہے۔

بعض لوگوں نے نماز خوف کی دس صورتیں ذکر کی ہیں' اور ابن حزم نے تقریباً پندرہ صورتیں بتائی ہیں لیکن صحیح وہی ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے' لوگوں نے ایک ہی واقعہ میں راویوں کے اختلاف کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو مختلف شکلوں پر محمول کیا ہے۔

فصل (۲۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اداء زکوۃ کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ کا انتہائی کامل ترین نظام پیش کیا ہے۔ اس کے وجوب کا وقت' اس کی مقدار' اس کے نصاب' کن پر واجب ہوتی ہے' اور اس کے مصارف کیا ہیں' ان سب کی پوری طرح وضاحت فرمادی ہے۔ مالداروں اور مساکین کے مصالح اور ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کو مال اور صاحب مال کے لئے باعث طہارت بنایا ہے' چنانچہ مالداروں کی نعمتوں کو اس سے محفوظ کر دیا ہے اور جس نے زکوۃ ادا کی' وہ زوال نعمت سے محفوظ رہتا ہے بلکہ اس میں برکت اور زیادتی ہوتی رہتی ہے۔

زکوۃ چار طرح کے مال پر لگائی ہے کیونکہ یہی اموال زیادہ تر رائج ہیں اور اہمیت و ضرورت کے حامل ہیں۔

پہلی قسم : فصل اور پھل' دوسری قسم : جانوروں میں اونٹ' گائے اور بکریاں۔ تیسری قسم : سونا و چاندی جو سارے مالی نظام کی بنیاد ہے۔ چوتھی قسم : مختلف قسم کے تجارتی مال۔

زکوۃ کی ادائیگی ہر سال میں صرف ایک بار فرض ہے نیز اسے فصلوں اور پھلوں کے پکنے اور مکمل ہونے سے مشروط کر دیا گیا ہے' اور یہ غیر معمولی عادلانہ نظام ہے۔ کیونکہ ہر ماہ اور ہفتے اسے فرض قرار دینا صاحب مال کے لئے ضرر رساں ہے اور دوسری طرف عمر میں صرف ایک بار فرض کرنا فقراء و مساکین کی حق تلفی اور نقصان دہ تھا۔

چنانچہ سال میں ایک بار فرض کرنا فی الحقیقت سب سے زیادہ منصفانہ قانون ہے۔ شریعت نے مال کے حصول میں آسانی یا محنت کے لحاظ سے زکوۃ میں واجب ہونے والی مقدار میں بھی کمی بیشی رکھی ہے' چنانچہ ایسی دولت جو کسی کو اچانک مل جائے جیسے زمین میں مدفون خزانہ تو اس پر پانچواں حصہ فرض ہے اور اس کے لئے سال کا گذرنا شرط قرار نہیں دیا گیا بلکہ جونہی ایسی دولت ملے اسی وقت پانچویں حصے کی ادائیگی واجب ہوگی۔

رہے پھل اور فصلیں جن کے حصول کے لئے انسان کو بہت کم مشقت اور تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے' جنہیں بارش کا پانی سیراب کرتا ہے ' ان پر دسواں حصہ زکوۃ واجب ہوگی اور جسے انسان خود سینچے' اس میں بیسواں حصہ واجب ہے اور جس مال میں مالک کی مسلسل کوشش اور مستقل جد و جہد کے بغیر اضافہ ممکن نہیں' اس میں چالیسواں حصہ واجب ہے۔

چونکہ ہر مال مواسات کا متحمل نہیں ہو سکتا' اس لئے زکوۃ کے لئے ایک نصاب مقرر ہوا تاکہ صاحب مال کو نقصان نہ پہنچے اور فقراء کو خاطر خواہ فائدہ ہو جائے۔ چنانچہ چاندی کا نصاب دو سو درہم' سونے کا بیس مثقال' غلہ اور پھل کے لئے پانچ وسق اور بکریوں کے لئے چالیس بکریاں' گائے کے لئے تیس گائیں اور اونٹوں کے لئے پانچ اونٹ نصاب مقرر کیا ہے' لیکن چونکہ اونٹ کے نصاب میں اس کی جنس سے مواساۃ کی گنجائش نہیں' اس لئے اس میں ایک بکری واجب کی گئی ہے' البتہ جب پچیس اونٹ ہو جائیں تو نصاب میں گنجائش کی وجہ سے ایک اونٹنی واجب ہو جائے گی جو دوسرے سال میں لگی ہو' پھر چھتیس اونٹوں سے پینتالیس تک ایک اونٹنی جو تیسرے سال میں لگی ہو' اور چھیالیس سے لے کر ساٹھ تک ایک اونٹنی جو چوتھے سال میں لگی ہو' اور اکسٹھ سے لے کر پچھتر تک ایک اونٹنی جو چار سال مکمل کر چکی ہو۔ چھیتر سے نوے تک دو اونٹنیاں جو پانچ سال مکمل کر چکی ہوں' اور جب ایک سو بیس اونٹ سے زیادہ ہوں تو ہر چالیس پر ہر دو سالہ اونٹنی واجب ہے۔

اس طرح شریعت نے اصحاب مال اور فقراء دونوں کا لحاظ رکھا ہے اور کسی ایک فریق پر ظلم کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے زکوۃ و صدقات کے مصارف کی خود ہی تقسیم فرمائی ہے اور اس کی آٹھ قسمیں بیان کی ہیں' جو دو طرح کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو وہ جو ضرورت کے مطابق لیتا ہے اور ضرورت کی شدت و ضعف اور کمی و زیادتی کے مطابق سوال کرتا ہے جیسے فقراء و مساکین غلام کو آزاد کرانے میں اور مسافر' دوسرے لوگ وہ ہیں' جو اسے منفعت کے باعث لیتے ہیں جیسے زکوۃ وصول کرنے والے' دلجوئی کے مستحق لوگ' مقروض لوگ' اللہ کے راستے میں مجاہدین' اور اگر لینے والا محتاج نہ ہو اور نہ اس سے مسلمانوں کا فائدہ وابستہ ہو تو اسے زکوۃ کا مال نہیں دیا جائے گا۔

فصل (۲۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اموال زکوۃ کے تقسیم کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوتا کہ یہ شخص مال زکوۃ کا مستحق ہے تو آپ عطا فرماتے تھے اور جس کے متعلق آپ کو معلومات نہ ہوتیں تو اس کو یہ کہہ کر دیتے تھے کہ مالدار اور کمانے کے قابل شخص کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

آپ کی عادت طیبہ یہ تھی کہ جس علاقے کی زکوۃ جمع ہوتی وہیں کے مستحقین میں تقسیم کرتے تھے۔ ان میں تقسیم کے بعد بچ جاتی تو اسے منگوا کر دوسری جگہ تقسیم کر دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ عاملین کو دیہاتوں میں بھیجتے تھے' شہروں میں نہیں' بلکہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ اہل یمن کی زکوۃ لے کر انہی کے فقراء میں تقسیم کر دیں۔ اور نہ آپ کا یہ طریقہ تھا کہ عاملین کو چوپایوں' پھلوں اور فصلوں جیسے ظاہری اموال کے مالکین کی طرف بھیجتے تھے بلکہ آپ کھجوروں اور انگوروں کے مالکین کے پاس پھلوں کا اندازہ کرنے والوں کو بھیجتے تھے اور وہ اندازے کے مطابق زکوۃ متعین کرتے تھے کہ کتنے وسق پر کتنی زکوۃ متعین ہونی چاہیے' اور آپ ان عاملین کو حکم دیتے تھے کہ ان کے لئے تیسرا یا چوتھا حصہ چھوڑ دیں چنانچہ وہ چوتھائی کو اندازے میں ظاہر نہ کرتا کیونکہ کھجوریں آفات سے کم ہی محفوظ رہتی ہیں۔ یہ اندازہ اس لئے کیا جاتا تاکہ پھلوں کے استعمال سے پہلے یہ بات معلوم ہو سکے کہ اس میں کتنی زکوۃ واجب ہے تاکہ مالکین کو اس میں تصرف کا موقع حاصل رہے اور عاملین کی آمد کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت حسنہ تھی کہ آپ سواری کے گھوڑے' خدمت کے غلام' لادنے کے خچر اور گدھے' سبزیوں اور غلہ جات اور ایسے تمام پھلوں سے زکوۃ نہ لیتے تھے جو ناپے یا ذخیرہ نہیں کئے جا سکتے البتہ انگور و کھجور میں سے زکوۃ لیتے تھے اور خشک اور گیلی میں فرق نہیں کرتے تھے۔

جب کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان چیزوں کی زکوۃ لے کر آتا تو کبھی آپ صلی

اللہ علیہ وسلم اس کے لئے یہ دعا فرماتے :

«اللَّهُمَّ بَارِكْ فِيْهِ وَفِي إِبِلِهِ»

اے اللہ اس میں اور اس کے اونٹوں میں برکت دے۔

اور کبھی یہ دعا فرماتے :

«اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ»

اے اللہ اس پر رحمت نازل فرما۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زکوۃ کی مد میں اچھا اچھا مال چھانٹ لینے کا دستور نہ تھا بلکہ اوسط درجہ کا مال لیتے تھے' اور آپ صدقہ کرنے والوں کو اپنا ہی مال یا سامان خریدنے سے منع فرماتے تھے۔ اگر کوئی فقیر کسی مالدار کو صدقہ کا مال ہدیہ کے طور پر دیتا تو آپ اسے کھا لینے کی اجازت دیتے تھے۔

نبی کریم صلیٰ اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی زکوۃ و صدقہ کی مد میں سے مسلمانوں کے فائدے اور رفاہی کاموں کے لئے قرض لیتے تھے اور صدقہ کے اونٹوں پر اپنے ہاتھ سے نشان لگاتے تھے اور ضرورت کے وقت آپ زکوۃ وقت سے پہلے لیتے تھے جیسا کہ آپ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دو سال کی پیشگی زکوۃ لے لی تھی۔

صدقہ فطر کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر شخص اور اس کے زیر کفالت چھوٹے بڑے پر فرض قرار دیا ہے' جس کی مقدار ایک صاع ہوتی ہے' چاہے وہ کھجور کی ہو یا جو پنیر ہو یا کشمش' یا ایک صاع آٹا دیا جائے۔ ایک روایت میں آدھ صاع گیہوں بھی دینا ثابت ہے۔ جیسا کہ ابو داود نے ذکر کیا ہے' اور صحیحین کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آدھ صاع کا فیصلہ حضرت معاویہ نے قیمت کے لحاظ سے کیا تھا۔

صدقہ فطر آپ نماز عید سے پہلے نکال دیتے تھے اور صحیحین میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ عید گاہ جانے سے پہلے ہی صدقہ فطر ادا کر دیا کریں۔"

سنن میں ان ہی سے مروی ہے کہ "جس نے اسے نماز سے قبل ادا کیا وہ صدقہ مقبولہ ہے اور جس نے نماز کے بعد ادا کیا تو وہ ایک عام صدقہ ہے"۔

ان دونوں حدیثوں کا تقاضا یہ ہے کہ صدقہ فطر کو نماز سے موخر نہیں کرنا چاہیے اور نماز کے بعد

اس کا وقت ختم ہو جاتا ہے جس طرح کہ قربانی اگر امام کی نماز سے پہلے کی جائے تو وہ ایک ذبیحہ ہو گا۔

صدقہ فطر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ آپ اسے فقراء و مساکین کے لئے خاص فرماتے تھے اور زکوۃ کے آٹھوں مصارف میں سے کسی مصرف میں نہیں دیتے تھے۔ ایسا عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے بعد صحابہ و تابعین سے ثابت نہیں۔

فصل (۲۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اداء صدقات کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نفلی صدقات میں سنت طیبہ یہ تھی کہ آپ کے پاس جو کچھ بھی ہوتا صدقہ کر دیتے تھے اور آپ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ صدقہ و خیرات کرنے والے تھے۔ آپ اللہ کی رضا کے لئے بغیر اس کی کثرت و قلت کو مد نظر رکھے جو بھی آپ سے سوال کرتا اسے عطا فرما دیتے تھے' اور لینے والے کو حاصل کرنے میں جتنی خوشی ہوتی تھی اس سے زیادہ خوشی آپ کو دینے میں ہوتی تھی۔ جب کوئی محتاج آپ کے سامنے آجاتا تو آپ اپنے سے زیادہ لباس و خوراک کے معاملہ میں اسے ترجیح دیتے تھے۔

آپ کے عطایا و صدقات کی مختلف نوعیتیں ہوتی تھی۔ کبھی ہدیہ دیتے کبھی صدقہ' کبھی ہبہ کرتے' کبھی کوئی چیز خریدتے پھر بائع کو وہ چیز اور قیمت دونوں دیتے تھے اور کبھی قرض لیتے پھر اس سے زیادہ واپس کر دیتے' جب کسی سے ہدیہ قبول کرتے تو کسی نہ کسی طریقے سے اس کا بدلہ دیتے تھے۔ آپ دوسروں کے ساتھ مالی و عملی و قولی ہر طرح سے کرم و احسان کا معاملہ کرتے اور لوگوں کا بھرپور تعاون کرتے ہوئے اپنا مال صدقہ میں دے دیتے یا دوسروں کو صدقہ کی ترغیب دیتے اور بخیل کو صدقہ و خیرات کرنے پر آمادہ کرتے تھے۔

آپ سے ملنے والے خود سخاوت و مروت پر مجبور ہو جاتے تھے' آپ کا سینہ کھلا اور طبیعت پاکیزہ تھی کیوں کہ صدقہ و احسان کا شرح صدر میں خاص دخل ہے اور اس کی تاثیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسالت کے ذریعہ بھی آپ کے سینہ کو کھول دیا تھا' ظاہری طور پر بھی آپ کے سینہ کو کھول کر اللہ تعالیٰ نے شیطان کا حصہ اس سے نکال دیا تھا۔

شرح صدر کا سب سے بڑا سبب عقیدہ توحید ہے' توحید جس قدر کامل ترین و قوی تر ہوگی' اسی اعتبار سے شرح صدر بھی زیادہ اور کشادہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے :

﴿ أَفَمَن شَرَحَ ٱللَّهُ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَـٰمِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِۦ ﴾ [الزمر : ٢٢]

اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے۔ مزید ارشاد ہے :

﴿ فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَـٰمِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُۥ يَجْعَلْ صَدْرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجًا ﴾ [الأنعام : ١٢٥]

اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے' اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔

شرح صدر کا دوسرا سبب وہ نور ہے جسے اللہ تعالیٰ بندے کے قلب میں ڈال دیتا ہے اور یہ ایمان کا نور ہوتا ہے۔ ترمذی کی ایک مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ "جب نور قلب میں داخل ہوتا ہے تو وہ کشادہ اور منشرح ہو جاتا ہے"۔

شرح صدر کا تیسرا سبب علم ہے' اس سے بھی سینہ میں انشراح و کشادگی پیدا ہوتی ہے لیکن یہ تاثیر سارے علوم میں نہیں ہوتی بلکہ وہ علم ہے جس کا رشتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔

شرح صدر کا چوتھا سبب اللہ تعالیٰ کی طرف انابت اور اس سے دلی اور سچی محبت ہے کیونکہ شرح صدر میں محبت کی عجیب و غریب تاثیر ہوتی ہے' اس سے طبیعت میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ محبت جس قدر قوی ہوگی انشراح قلب اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ اس کے برعکس بروں کو دیکھنے سے سینہ تنگ ہوتا ہے۔

شرح صدر کا پانچواں سبب کثرت سے ذکر اللہ ہے اور اس کی بھی انشراح صدر میں بڑی تاثیر ہے (غفلت دور ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی قربت نصیب ہوتی ہے)۔

شرح صدر کا چھٹا سبب اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ کرم و احسان ہے اور ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون ہے خواہ وہ مالی ہو یا بدنی' اس کے علاوہ کرم و احسان کے بہت سے طریقے ہیں۔

شرح صدر کا ساتواں سبب شجاعت ہے کیونکہ بہادر وسعت ظرف اور فراخی قلب کا مالک ہوتا ہے۔ اس لئے بزدل' بخیل اور ذکر الٰہی سے غافل' اور دین الٰہی سے جاہل ہوتا ہے۔ دل کو دوسروں سے متعلق رکھنے میں روحانی کیف و سرور اور لذت حاصل نہیں ہوتی اور ایسے لوگوں کے دلوں کے انشراح یا

انقباض کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیوں کہ عارضی چیزیں اسباب ختم ہونے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ اعتبار صرف ان صفات کا ہوتا ہے جو دل کے ساتھ قائم و دائم ہوں اور اس کے انشراح و انقباض کا موجب ہوں اور لائق معیار اور قابل اعتبار ایسی ہی صفات ہیں۔

اسی طرح بلکہ ان تمام مذکورہ اسباب و صفات سے زیادہ اہم یہ ہے کہ دل ان تمام صفات مذمومہ سے خالی کر دیا جائے جو تنگی اور عذاب کا سبب بنتے ہیں جیسے بد نگاہی' فضول باتیں' غلط چیزیں سننا' اختلاط رکھنا' کھانے اور سونے میں بد نظمی کرنا کیونکہ جب تک انسان شرح صدر کے اسباب کی طرف راغب نہ ہو گا اور صفات مذمومہ اس کے قلب سے خارج نہ ہوں گی تو اسے کماحقہ انشراح صدر حاصل نہ ہو گا۔

فصل (۲۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان کے روزے رکھنے کا طریقہ

روزہ کا مقصد نفس کو خواہشات سے روکنا ہے تاکہ اس کے اندر پوری طرح سعادت حاصل کرنے اور اخروی پاکیزہ زندگی قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے' اور بھوک و پیاس کی شدت سے نفس کی تیزی کو ختم کیا جائے اور فقراء و مساکین کی بھوک اور پیاس کی تڑپ اور شدت کو محسوس کیا جائے اور کھانے و پینے کو کم کرکے انسان کے رگ میں شیطان کے چلنے پھرنے کے راستوں کو تنگ کیا جائے۔

یہ روزہ متقیوں کی لگام اور مجاہدوں کی ڈھال اور ابرار و مقربین کے لئے ورزش ہے اور تمام اعمال صالحہ میں روزہ ہی ایسا عمل ہے جو رب العالمین کے لئے مخصوص ہے کیونکہ روزہ دار رضائے الٰہی کی خاطر اپنا کھانا پینا' اور خواہشات کو چھوڑ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے ساری محبوب چیزوں کو خیر باد کہہ دیتا ہے گویا روزہ ایک معاہدہ اور راز ہے جو صرف بندہ اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے۔ لوگ ظاہری طور پر کھانے پینے کو ترک کردینے سے آگاہ ہوسکتے ہیں لیکن اپنے معبود کی خاطر اسے چھوڑ دینا ایک ایسی چیز ہے جس سے کوئی انسان واقف نہیں اور یہی روزے کی حقیقت ہے۔

روزہ کے فوائد و اثرات عجیب و غریب ہیں۔ وہ ظاہری جوارح کی حفاظت' باطنی قوت کو فاسد مادے سے محفوظ رکھنے میں' ظاہری اور باطنی قوت کو جلا دیتا ہے' فاسد مادے دور کرتا اور ردی اخلاط سے جسم کو پاک کرتا ہے۔ روزہ قلب اور دیگر تمام اعضاء کو وہ تمام قوتیں واپس دلاتا ہے جو مختلف طریقوں سے صرف ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ روزہ کو روحانیات میں ایک بڑا درجہ حاصل ہے اور تقوی و تزکیہ حاصل کرنے کا وہ ایک عمدہ ذریعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾ [البقرة: ١٨٣]

اے مسلمانو! روزہ تم پر بھی اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح اگلی قوموں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو جو وسائل کی عدم موجودگی کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے' روزہ رکھنے کا حکم دیتے اور فرماتے تھے۔ "روزہ (جنسی) خواہش کو دباتا ہے"۔

روزہ کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سب سے کامل ترین اور حصول مقصد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اس کی فرضیت میں آسانی اور سہولت پیدا کی گئی' کیونکہ مرغوبات و خواہشات نفس سے بچنا غیر معمولی سخت اور دشوار گذار چیز تھی' اس لئے روزہ ہجرت کے بعد فرض کیا گیا اور اس میں بھی تدریجی انداز میں پہلے یہ اختیار دیا گیا کہ اگر کوئی چاہے تو روزہ رکھے یا اس کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے' پھر یہ حکم ہوا کہ صرف بوڑھا شخص یا عورت اگر چاہے تو ہر روز ایک فقیر کو کھانا کھلا دیا کریں' اور نیز مریض اور مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی' بشرطیکہ وہ بعد میں اس کی قضا کریں' اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو اجازت دی گئی کہ وہ روزے نہ رکھیں لیکن بعد میں اس کی قضا کریں' اگر یہ عورتیں صرف بچوں کے نقصان کے اندیشے سے روزہ نہ رکھیں تو قضا کے ساتھ ایک مسکین کو کھانا بھی کھلائیں گی کیونکہ ان کا روزہ نہ رکھنا بیماری کے خوف سے نہیں ہے کہ صرف قضا کافی ہو' اس لئے اس کی تلافی مسکینوں کو کھانا کھلانے سے کی گئی جیسا تندرست آدمی اسلام کے ابتدائی دور میں روزہ نہ رکھنے کی صورت میں کرتا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان کے مہینے میں مختلف قسم کی بکثرت عبادات کا معمول تھا' چنانچہ آپ حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے اور اس ماہ میں کثرت سے صدقہ و خیرات' تلاوت اور ذکر کرنے کے علاوہ اعتکاف بھی کرتے تھے۔

اور اس میں عبادات کا اس طرح اہتمام فرماتے تھے جو دوسرے مہینوں نہیں ہوتا تھا' اور دن و رات مسلسل عبادات کرتے تھے اور کھانا اور پینا بھی چھوڑ دیتے تھے لیکن امت کو متواتر روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا آپ تو ایسا کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میرا حال تم سے مختلف ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کھلاتا اور پلاتا ہے۔

فصل (۲۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روزے کے بارے میں اسوہ حسنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب تک رویت ہلال کی تحقیق نہ ہو جائے یا کوئی عینی گواہ نہ مل جاتا' آپ روزے شروع نہ کرتے تھے اور اگر چاند نہ دیکھا جاتا اور کہیں سے اس کی شہادت بھی نہ ملتی تو شعبان کے پورے تیس دن پورے کرتے تھے اور اگر تیسویں رات کو بادل حائل نہ ہو جاتا تو آپ تیس دن مکمل کرتے تھے' اور آپ ابر آلود دن کو روزہ نہیں رکھتے تھے' نہ آپ نے اس کا حکم دیا بلکہ فرمایا "جب بادل ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کئے جائیں" یہ اس روایت کے منافی نہیں جس میں حکم ہوا ہے کہ "جب بدلی ہو تو اندازہ کر لیا کرو" اس سے مراد تکمیل ماہ ہے۔

آپ کی یہ عادت طیبہ تھی کہ رمضان کے اختتام پر دو افراد کی شہادت طلب کرتے تھے۔ اگر عید کا وقت نکل جانے کے بعد دو گواہ مل جاتے تو آپ روزہ توڑ دیتے پھر دوسرے دن وقت پر عید کی نماز پڑھتے۔

آپ افطار میں جلدی فرماتے اور اس کی تاکید کرتے تھے۔ اسی طرح سحری کو تاخیر سے کرتے اور اس کی تاکید فرماتے تھے اور افطار کو کھجور سے یا پانی سے کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

روزہ دار کو آپ مجامعت' شور و غل' گالی گلوچ سے منع فرماتے تھے اور اگر اس سے کوئی گالی گلوچ کرے تو یہ حکم دیا ہے کہ جواب میں یہ کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔

آپ نے رمضان کے مہینے میں سفر کیا تو حالت سفر میں کبھی روزہ رکھا اور کبھی افطار کیا۔ اور صحابہ کو دونوں باتوں کا اختیار دیا۔ ہاں اگر مسلمانوں کا لشکر دشمن سے قریب ہو جاتا تو روزہ نہ رکھنے کا حکم دیتے تھے۔

سفر کی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسافت کی تحدید نہیں کی ہے' صحابہ کرام سفر شروع کرنے کے بعد گھروں کو چھوڑنے کا اعتبار کئے بغیر روزہ چھوڑ دیتے تھے' وہ یہ

کہتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

طلوع فجر کے وقت بسا اوقات آپ حالت جنابت میں ہوتے تھے۔ نماز فجر کے وقت غسل فرماتے تھے اور روزہ رکھ لیتے تھے۔ روزے کی حالت میں بعض ازواج مطہرات کا بوسہ لے لیتے تھے اور اس کو پانی سے کلی کرنے کے مشابہ بتایا ہے۔ اس سلسلے میں بوڑھے اور جوان میں فرق ثابت نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص روزے کی حالت میں بھول کر کھا پی لے تو اس کو قضا کرنے کا حکم نہیں دیتے تھے کیونکہ اللہ تعالٰی نے اسے کھلایا اور پلایا ہے' اور روزے کو جو چیزیں فاسد کرتی ہیں' وہ یہ ہیں کہ کھانا پینا' پچھنا لگوانا' قئے کرنا اور قرآن کریم نے جماع کا بھی ذکر کیا ہے لیکن سرمہ لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

آپ سے روزے کی حالت میں مسواک کرنا' سر پر پانی ڈالنا ناک میں پانی ڈالنا' کلی کرنا ثابت ہے۔ البتہ ناک میں زیادہ پانی ڈالنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے' جیسا کہ امام احمد سے روایت ہے۔

آپ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے روزے کی حالت میں پچھنا لگوایا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں سرمہ لگانے سے ممانعت آئی ہے لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ ابن معین نے اسے منکر کہا ہے۔

فصل (۲۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفلی روزے رکھنے کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھنے لگتے تو کہا جانے لگتا کہ اب نہیں چھوڑیں گے' اور جب نہیں رکھتے تو کہا جاتا کہ اب روزہ نہیں رکھیں گے۔ اور رمضان کے علاوہ کسی مہینے کے پورے روزے نہیں رکھے اور آپ ماہ شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں روزہ نہیں رکھتے تھے اور کوئی مہینہ آپ کا بغیر روزہ کے نہیں گذرتا تھا۔ پیر اور جمعرات کے دن آپ خاص طور پر روزہ رکھتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر و حضر میں کسی بھی حالت میں ایام بیض (مہینہ کی ۱۳'۱۴'۱۵ تاریخ) کو روزہ نہیں چھوڑتے تھے۔ اسے امام نسائی نے ذکر کیا ہے آپ لوگوں کو ان تاریخوں میں روزہ رکھنے کی ترغیب بھی دیتے تھے۔

رہے عشرۃ ذی الحجہ کے روزے تو اس میں اختلاف ہے اور ماہ شوال کے چھ روزے تو آپ سے صحیح روایت میں مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "رمضان کے فوراً بعد یہ روزے رکھنا ہمیشہ روزے رکھنے کے برابر ہے" عاشورہ کا روزہ آپ باقی تمام ایام کے مقابلے میں زیادہ اہتمام کے ساتھ رکھتے تھے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور یہودیوں کو یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے دیکھا تو وجہ دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک متبرک دن ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دن موسیٰ اور بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دی ہے تو آپ نے فرمایا کہ ہم تم سے زیادہ موسیٰ کے حقدار ہیں چنانچہ عاشورہ کا روزہ خود بھی رکھا اور صحابہ کرام کو بھی اس کا حکم دیا۔

یہ واقعہ رمضان کے روزے فرض ہونے سے قبل کا ہے' اس لئے جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا "جس کا جی چاہے عاشورہ کا روزہ رکھے اور جس کا جی چاہے نہ رکھے"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ میدان عرفات میں یوم عرفہ کو روزہ نہ رکھتے تھے۔ یہ صحیحین کی روایت سے ثابت ہے' نیز آپ سے مروی ہے کہ آپ نے عرفات کے دن عرفات میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ اسے اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت میں ثابت ہے کہ "نویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنے سے ایک سال گذشتہ اور ایک سال آئندہ کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں"۔

آپ ہمیشہ مسلسل روزے نہیں رکھتے تھے بلکہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "جس نے ہمیشہ اور مسلسل روزے رکھے ' اس نے نہ روزہ رکھا اور نہ افطار کیا" اکثر یہ ہوتا تھا کہ آپ گھر میں تشریف لاتے اور پوچھتے "کچھ کھانے کو ہے' اگر جواب ملتا نہیں تو فرماتے' میں روزہ رکھ لیتا ہوں"۔

کبھی آپ نفلی روزہ کی نیت کر لیتے اور پھر توڑ دیتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے ان سے اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ "نفل روزہ کی قضا کرو" وہ حدیث معلول ہے۔

روزے کی حالت میں اگر کسی کے یہاں تشریف لے جاتے تو روزہ پورا کرتے تھے' جیسا کہ آپ نے ام سلیم رضی اللہ عنہا کے یہاں جانے کے موقع پر کیا تھا لیکن ام سلیم کی حیثیت آپ کے اہل بیت جیسی تھی اور صحیح روایت میں آپ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "تم میں سے اگر کوئی روزہ دار ہو اور اسے کھانے کے لئے بلایا جائے تو وہ کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں" اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن مخصوص کر کے روزہ رکھنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔

فصل (۲۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتکاف کا طریقہ

اصلاح قلب اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات پر چلنے میں استقامت اسی وقت ممکن ہے جب اس ذات پاک پر اعتماد کلی کیا جائے اور اس کی طرف پوری طرح رجوع و انابت اختیار کی جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف میلان اور رجوع ہی اطمینان قلب کا سبب ہے اور پراگندہ دل اللہ تعالیٰ کے قرب سے دور ہوتا ہے۔

چونکہ کھانے پینے میں زیادتی' باہمی میل جول میں اضافہ ، بات چیت اور سونے میں کثرت ایسے اعمال ہیں جس سے قلب کی پراگندگی اور اس کے انتشار اور پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف وصل و قرب میں رکاوٹ بنتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنی رحمت اور حکمت سے روزہ فرض کیا تاکہ کھانے پینے میں کمی واقع ہو جائے اور دل و دماغ سے شہوانی خیالات نکل جائیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت و انابت میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

پھر روزے میں اس کی بھی پوری رعایت رکھی گئی ہے کہ انسان دنیاوی نعمتوں اور مصلحتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اخروی زندگی کے لئے بھی کچھ مفید کام کر سکے جو اسے نقصان نہ پہنچائیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس میں اعتکاف کو مشروع قرار دیا ہے تاکہ بندہ کا دل خود بخود اللہ تعالیٰ کی طرف مائل اور اس کی عبادت کا عادی و شوقین ہو جائے اور غیر اللہ سے اس کی توجہ ہٹ جائے اور دنیاوی جنجھٹوں سے دور ہو کر اللہ تعالیٰ کے قرب کے لئے یکسو اور اسی سے مانوس ہو جائے۔ اور یہی انسیت بندہ کو قبر کی وحشت میں کام آئے گی۔

دراصل اعتکاف کا بڑا مقصد یہی ہے اور چونکہ یہ مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ اعتکاف رمضان میں ہو' اس لئے اعتکاف کو اس کے آخری عشرہ میں مشروع کیا گیا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے روزے ہی کے ساتھ اعتکاف کا ذکر کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

بھی روزہ کے بغیر اعتکاف نہیں فرمایا ہے۔

رہا مسئلہ قلت کلام کا تو اس کا حکم اس لئے ہے کہ شریعت نے امت کو تمام ایسی باتوں سے زبان بند رکھنے کا حکم دیا ہے جو آخرت میں اس کے لئے مفید نہ ہوں۔

رہا زیادہ سونے سے بھی ممانعت کا حکم' تو شریعت نے رات کی نماز کا حکم دیا ہے جو فضول جاگنے سے زیادہ بہتر اور مفید ہے۔ قیام اللیل معتدل قسم کی عبادت ہے جو دل اور جسم دونوں کے لئے مفید ہے' اور بندے کے ذاتی مصالح اور کاموں میں رکاوٹ بھی نہیں پیدا کرتی۔

اہل ریاضت و سلوک کے مجاہدوں کا دار و مدار ان ہی چار چیزوں پر ہے اور اس سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر گامزن رہے اور غلو کرنے والوں یا کوتاہی کرنے والوں کی راہ اور طریقہ سے پرہیز کرے۔

چونکہ ہم پہلے روزہ اور قیام اللیل اور کلام کے متعلق مسنون طریقہ کا ذکر کر چکے ہیں اس لئے اب اعتکاف کے مسنون طریقہ بیان کریں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے اور یہ سنت طیبہ وفات تک جاری رہی۔ ایک مرتبہ آپ نے رمضان میں اعتکاف نہیں کیا تو اس کی قضا شوال میں فرمائی۔ ایک دفعہ آپ نے رمضان کے پہلے عشرہ میں اور ایک مرتبہ درمیانی عشرہ میں اور ایک مرتبہ آخری عشرہ میں اعتکاف کیا۔ شب قدر اسی میں تلاش کرتے تھے۔ آخیر میں یہ معلوم ہوا کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرہ میں ہے تو آپ اس میں تلاش کرتے تھے۔ اعتکاف آپ پوری زندگی میں پابندی سے کرتے تھے اور اس کے لئے مسجد میں چھوٹا سے خیمہ لگا دیا جاتا تھا اور تنہائی میں رب العزت کے حضور بیٹھے رہتے تھے۔

جب آپ اعتکاف کا ارادہ فرماتے تو فجر کی نماز کے بعد خیمہ میں داخل ہو جاتے۔ ایک مرتبہ آپ کے حکم سے آپ کا خیمہ لگایا گیا' تو ازواج مطہرات نے بھی اپنے اپنے خیمے لگوا لئے' آپ جب فجر کی نماز سے فارغ ہوئے تو ان خیموں کو دیکھ کر اپنا خیمہ کھولنے کا حکم دے دیا' اور اس سال آپ نے رمضان میں اعتکاف ملتوی کر دیا۔ پھر شوال کے ابتدائی عشرہ میں اعتکاف فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال دس دن اعتکاف فرماتے تھے مگر وفات کے سال بیس دن اعتکاف کیا۔ آپ حضرت جبریل کے ساتھ قرآن کا ایک دور فرماتے تھے لیکن وفات کے سال دو مرتبہ دور فرمایا' اور اسی طرح ہر سال قرآن آپ پر ایک مرتبہ پیش کیا جاتا' اور وفات کے سال دو مرتبہ پیش کیا گیا۔

جب اعتکاف کی حالت میں ہوتے تو مسجد سے باہر نہ نکلتے حتی کہ گھر میں بھی بغیر خاص ضرورت کے نہ جاتے لیکن یہ ضرور ہوتا کہ سر حضرت عائشہ کے حجرہ میں کر دیتے وہ باوجود ایام سے ہونے کے اسے دھوتیں اور بالوں میں کنگھی کر دیتیں۔

اور بعض ازواج مطہرات خیمہ میں بھی آتی تھیں مگر بجز بات چیت کے ان سے اور کوئی سروکار نہ رکھتے تھے اور جب وہ چلنے کے لئے کھڑی ہوتیں تو واپسی پر ان کی مشایعت بھی کرتے تھے اور یہ رات میں ہوا کرتا تھا۔

آپ اعتکاف کے دوران ازواج مطہرات کے ساتھ مباشرت نہیں کرتے تھے اور نہ بوسہ وغیرہ لیتے تھے۔ اعتکاف کے دوران آپ کا بستر اور چارپائی اعتکاف کی جگہ رکھ دی جاتی تھی۔

جب کسی ضرورت کے لئے نکلتے تو راستہ میں کسی مریض کی عیادت بھی کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے ترکی قبہ میں اعتکاف کیا جس کے اندر چٹائی بچھی ہوتی تھی (یا اس پر چٹائی ڈال دی)۔

یہ تمام باتیں اس لئے تھیں کہ اعتکاف کا اصل اور اس کی روح حاصل ہو۔ بخلاف آجکل کے جاہل لوگوں کے اپنی جائے اعتکاف کو میل ملاپ کی جگہ اور زائرین کے لئے مجلس بنا لیتے ہیں پھر اس کے بعد دنیا بھر کی باتیں کرتے ہیں۔ اس میں اور اعتکاف نبوی میں بہت بڑا فرق ہے۔

فصل (۲۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج اور عمرہ کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد چار عمرے کئے' اور وہ سب کے سب ذی القعدہ کے مہینے میں تھے۔ (سوائے اس عمرہ کے جو آپ نے حجۃ الوداع کے ساتھ ادا کیا)

پہلا عمرہ : حدیبیہ کا' سنہ ٦ ہجری میں ادا کیا' اس موقع پر مشرکین نے خانہ کعبہ کے پاس جانے سے روک دیا تھا' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرام نے اس جگہ جہاں پر روکے گئے تھے' قربانی کی اور سر منڈا کر احرام کھول دیا۔

دوسرا عمرہ : قضیہ کا' جو پہلے عمرے کے بعد والے سال میں ادا کیا' اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور تین دن قیام فرما کر واپس ہوئے۔

تیسرا عمرہ : جو آپ نے حج کے ساتھ ادا فرمایا۔

چوتھا عمرہ : جو آپ نے جعرانہ سے ادا فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے عمرے کئے' سب مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہوئے کئے' یہ ثابت نہیں کہ مکہ میں ہوں اور عمرہ کرنے کے لئے باہر گئے ہوں' جیسا کہ آج کل لوگ کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے مشرف ہونے کے بعد مکہ میں تیرہ سال مقیم رہے لیکن یہ ثابت نہیں کہ آپ نے مکہ سے باہر نکل کر عمرہ کیا ہو' صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ نے تنعیم سے احرام باندھ کر عمرہ کرنے کی اجازت دی تھی کیوں کہ وہ ایام حیض کی وجہ سے حج سے پہلے اپنے قافلہ کے ساتھ عمرہ نہیں کر سکتی تھیں' آپ نے ان کی دلجوئی کے لئے حج کے بعد اس عمرہ کی اجازت دی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے عمرے حج کے مہینوں میں کئے' اس میں مشرکین کے اس نظریہ کی تردید مقصود تھی کہ حج کے مہینوں میں عمرہ مکروہ ہے' اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان مہینوں میں عمرہ کرنا ماہ رجب میں عمرہ کرنے سے افضل ہے۔

رہا رمضان کا عمرہ تو صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ "رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہوتا ہے" باوجود اس اہمیت کے آپ کے اس ماہ میں عمرہ نہ کرنے کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ آپ رمضان میں عمرہ سے زیادہ دوسری عبادتوں میں مشغول رہا کرتے تھے اور اس میں نہ کر کے امت پر رحمت و سہولت کرنا مقصد تھا' کیونکہ اگر آپ رمضان میں عمرہ کر لیتے تو ساری امت اس سنت پر عمل کرنے کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی' اس طرح عمرہ اور روزے میں جمع کرنا مشکل ہو جاتا' آپ نے بہت سی پسندیدہ عبادتوں کو محض اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ کہیں امت کا اس پر عمل کرنا دشوار نہ ہو جائے۔

آپ سے سال میں ایک عمرہ سے زائد کرنا ثابت نہیں ہے اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ ہجرت کے بعد سنہ ۱۰ ہجری کے علاوہ آپ نے کوئی حج نہیں کیا۔

جب حج کی فرضیت نازل ہوئی تو بغیر کسی تاخیر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لئے تیار ہو گئے کیونکہ حج سنہ ۹ ہجری یا ۱۰ ہجری میں فرض ہوا' اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے :

﴿ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ﴾

حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو۔

یہ آیت سنہ ۶ ہجری میں نازل ہوئی لیکن جیسا کہ صاف ظاہر ہے اس سے فرضیت حج ثابت نہیں ہوتی' اس میں صرف اس قدر فرمایا ہے کہ جب حج و عمرہ کی نیت کر لو تو اسے پورا کرو۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا عزم فرمایا اور لوگوں کو معلوم ہوا تو سب نے تیاریاں شروع کر دیں تاکہ آپ کا شرف معیت حاصل کریں' مدینہ کے مضافاتی علاقے کے لوگوں کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ بھی گروہ در گروہ اسی مقصد سے آنا شروع ہو گئے' راستے میں بھی لوگوں کی جماعتیں جو حد شمار سے خارج تھیں' شریک قافلہ ہوتی گئیں' آگے' پیچھے' دائیں' بائیں' حد نظر تک خلقت نظر آ رہی تھی۔

مدینہ سے آپ ۲۴ ذی القعدہ کو ظہر کی چار رکعت نماز پڑھ کر روانہ ہوئے' روانگی سے قبل ایک خطبہ دیا' جس میں احرام اور اس کے واجبات و سنن کی تعلیم دی' پھر اندر تشریف لے گئے' تیل لگایا' کنگھی کی' لنگی باندھی' چادر اوڑھی اور مقام ذوالحلیفہ پہنچ کر عصر کی دو رکعت نماز پڑھی پھر رات بھر یہیں قیام فرمایا' یہاں آپ نے پوری پانچ نمازیں پڑھیں' عصر' مغرب' عشاء اور دوسرے دن فجر اور ظہر' تمام ازواج مطہرات ہمراہ اور رفیق سفر تھیں' ایک ایک کر کے آپ سب کے یہاں تشریف لے گئے' جب احرام باندھنے کا ارادہ کیا تو دوسرا غسل کیا' حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن

اور سر پر خوشبو لگائی یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھی اور مانگ میں عطر کے اثرات نظر آرہے تھے' جسے آپ نے دھویا نہیں' پھر چادر اور لنگی سے احرام باندھا پھر ظہر کی دو رکعتیں پڑھنے کے بعد مصلے پر بیٹھے ہی حج و عمرہ کے لئے باواز بلند تکبیر کہی' اس وقت آپ سے یہ منقول نہیں کہ آپ نے احرام کے لئے الگ سے دو رکعتیں پڑھیں ہوں۔

احرام سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں کو ہار پہنا دیا تھا اور کوہان کو دائیں طرف سے چیر دیا تھا یہاں تک کہ خون رسنے لگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت حج قران کا احرام باندھا تھا جس کے ثبوت میں بیس سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے بالوں کو خطمی وغیرہ لگا کر اس طرح چپکا لیا تھا کہ بکھر نہ سکیں۔ پھر مصلے پر بیٹھ کر تلبیہ فرمایا' پھر اونٹنی پر سوار ہو کر حج و عمرہ اور کبھی صرف حج کا تلبیہ کہتے کیوں کہ عمرہ حج کا ایک جزء ہے' اس وجہ سے بعض لوگ آپ کے حج کو قران کہتے ہیں' بعض حج تمتع کہتے اور بعض افراد کہتے ہیں۔

ابن حزم کا یہ قول کہ آپ نے ظہر سے پہلے احرام باندھا تھا' وہم ہے' صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے ظہر کے بعد احرام باندھا تھا' چنانچہ کسی سے بھی ظہر سے پہلے احرام باندھنا منقول نہیں' پتہ نہیں یہ کیسے ان کو دھوکہ ہو گیا۔

پھر آپ نے ان الفاظ سے تلبیہ کہا :

«لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لاَشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ، وَالْمُلْكَ، لاَشَرِيْكَ لَكَ»

اے اللہ حاضر ہوں' حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں' میں حاضر ہوں' ہر طرح کی تعریف اور نعمتیں تیرے ہی لئے ہیں' حکومت بھی تیری ہی ہے' تیرا کوئی ساجھی نہیں۔

یہ تلبیہ آپ نے باواز بلند کہا یہاں تک کہ تمام صحابہ نے اسے سن لیا' آپ نے حسب فرمان باری تعالیٰ انہیں یہ حکم دیا کہ وہ بھی بلند آواز سے تلبیہ کہیں۔

یہ سفر حج آپ نے سواری پر کیا' جس پر کجاوہ رکھا ہوا تھا۔ کجاوہ اور ہودج وغیرہ میں بیٹھنے پر علماء میں قدرے اختلاف ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حج کی تینوں قسموں' قران' تمتع' افراد جس کا وہ چاہیں'

احرام باندھنے کا اختیار دے دیا تھا' پھر مکہ سے قریب ہونے کے وقت قربانی کا جانور ساتھ نہ رکھنے والے حضرات کو حکم دیا کہ عمرہ کرکے احرام کھول دیں اور حج قران کی نیت ختم کردیں' پھر مروہ کے پاس پہنچ کر اس کو لازمی قرار دے دیا۔

مقام شرف میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ کی اہلیہ اسماء بنت عمیس کے یہاں بچہ پیدا ہوا' یہ نومولود حضرت محمد بن ابوبکر تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ غسل کرلیں' سفر جاری رکھیں اور احرام باندھ لیں اور تلبیہ کہتی رہیں۔

اس واقعہ سے تین چیزیں ثابت ہوئیں' محرم کے لئے غسل جائز ہے' ایام حیض میں عورت غسل کر سکتی ہے' ایام حیض میں عورت احرام باندھ سکتی ہے۔

پھر آپ لبیک کا مذکورہ ترانہ پڑھتے ہوئے آگے بڑھے اور صحابہ کرام بھی قدرے کمی و زیادتی کے ساتھ اس کو دہراتے رہے لیکن آپ نے کسی پر نکیر نہ فرمائی۔

مقام روحاء میں جب یہ قافلہ پہنچا تو آپ نے ایک زخمی نیل گائے دیکھی' آپ نے صحابہ سے فرمایا اسے چھوڑ دو ممکن ہے اس کا مالک آجائے' اتنے میں وہ آگیا اور اس نے عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو پورا اختیار ہے' پھر آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو انہوں نے سب میں تقسیم کردی۔

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ محرم غیر محرم کا شکار کیا ہوا جانور کھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے لئے شکار نہ کیا گیا ہو' یہ بھی معلوم ہوا کہ شکار کی ملکیت کے لئے صرف اثبات صحیح ہے۔

پھر جب آپ مقام اثایہ جو کہ رو یثہ اور عرج کے درمیان والا علاقہ ہے' پہنچے تو ایک درخت کے سایہ میں ایک ہرن دکھائی دیا جو تیر سے زخمی تھا' آپ نے وہاں ایک شخص کو کھڑے ہو جانے کا حکم دیا تا کہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے' ہرن اور نیل کے درمیان فرق کا سبب یہ تھا کہ یہاں اس کا علم نہ تھا کہ شکار کرنے والا غیر محرم ہے۔

پھر آپ مقام عرج پہنچے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کی سواری ایک ہی تھی' اتنے میں حضرت ابوبکر کا غلام بغیر اونٹ کے پہنچا تو انہوں نے دریافت کیا کہ اونٹ کہاں ہے تو اس نے کہا کہ گم ہو گیا تو حضرت ابوبکر نے کہا ایک ہی اونٹ تھا اسے بھی گم کردیا' پھر اس کی پٹائی کرنے لگے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے فرمایا "دیکھو یہ حالت احرام میں کیا کر رہے ہیں"۔

پھر آپ وہاں سے چل کر مقام ابواء پر پہنچے تو حضرت صعب بن جثامہ نے آپ کی خدمت میں نیل گائے کی ران پیش کی تو آپ نے اسے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ہم اسے محض محرم ہونے کی وجہ سے لوٹا رہے ہیں۔

جب آپ وادی عسفان کے پاس سے گذرے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت فرمایا یہ کون سی وادی ہے تو انہوں نے عرض کیا' وادی عسفان ہے تو آپ نے فرمایا اس وادی سے حضرت ہود اور حضرت صالح سرخ اونٹوں پر بیٹھ کر گذرے ہیں تاکہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوں' امام احمد نے اسے روایت کیا ہے۔

جب آپ مقام سرف پر پہنچے تو حضرت عائشہ کو ماہواری شروع ہو گئی۔ آپ نے اس جگہ صحابہ کرام سے فرمایا' جس شخص کے پاس قربانی کا جانور نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ صرف عمرہ کا احرام باندھے (یعنی عمرہ کرنے کے بعد حلال ہو جائے) اور جس شخص کے پاس قربانی کا جانور ہو تو وہ یہ نہ کرے' یہ اختیار میقات کے پاس والے اختیار سے بڑھ کر تھا' پھر جب آپ مکہ مکرمہ پہنچ گئے تو جن کے پاس قربانی کا جانور نہ تھا' انہیں لازمی طور پر حکم دے دیا کہ اسے عمرہ میں تبدیل کر دیں اور عمرہ کے بعد حلال ہو جائیں' اور جس کے پاس جانور ہو تو وہ احرام میں رہیں' حضرت سراقہ بن مالک نے سوال کیا کہ یہ حکم صرف اسی عمرہ کے ساتھ خاص ہے یا ہمیشہ کے لئے' تو آپ نے فرمایا کہ ہمیشہ کے لئے ہے۔

پھر آپ مقام ذی طوی (جو زاہر کے کنوؤں سے مشہور ہے) پر پہنچے' وہاں چار ذی الحجہ اتوار کی شب گذاری اور فجر کی نماز ادا کر کے غسل فرمایا اور مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہو گئے' مکہ میں آپ حجون سے متصل بلند کھائی میں دن کے وقت داخل ہوئے' لیکن عمرہ کے موقع پر آپ نشیبی علاقہ سے داخل ہوئے تھے' پھر آپ آگے بڑھے اور چاشت کے وقت مسجد میں داخل ہوئے۔

امام طبری نے ذکر کیا ہے کہ آپ باب عبد مناف سے جسے باب بنی شیبہ کہا جاتا ہے' داخل ہوئے تھے' امام احمد فرماتے ہیں کہ آپ جب دار یعلی سے داخل ہوئے تو بیت اللہ کو سامنے کر کے دعا فرماتے' امام طبری نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب آپ بیت اللہ کو دیکھتے تو یہ دعاء پڑھتے تھے :

«اللَّهُمَّ زِدْ هٰذَا الْبَيْتَ تَشْرِيْفًا، وَتَعْظِيْمًا، وَتَكْرِيْمًا، وَمَهَابَةً»

اے اللہ اس گھر کو اور زیادہ عزت و عظمت اور بزرگی اور رعب عطا فرما۔

ایک اور مرسل روایت میں یہ مذکور ہے کہ آپ بیت اللہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھاتے' اللہ اکبر کہتے اور یہ دعا پڑھتے تھے :

«اللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ، حَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ، اللّٰهُمَّ زِدْ هٰذَا الْبَيْتَ تَشْرِيْفًا وَتَعْظِيْمًاوَتَكْرِيْمًا وَمَهَابَةً وَزِدْ مَنْ حَجَّهُ، أَوِاعْتَمَرَهُ تَكْرِيْمًا وَتَشْرِيْفًا وَتَعْظِيْمًا وَبِرًّا»

اے اللہ تو سلام ہے اور تجھی سے سلامتی ہے' ہمیں سلامتی دے' اے اللہ اس گھر کو اور زیادہ عزت' عظمت' کرامت اور رعب دے' اور جو اس کا حج یا عمرہ کرے اسے بھی عزت' کرامت' عظمت اور نیکی عطا کر۔

جب آپ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو بیت اللہ کے پاس تشریف لائے اور تحیتہ المسجد نہیں پڑھی کیونکہ یہاں طواف ہی تحیتہ المسجد ہے' جب حجراسود کے بالمقابل ہوئے تو اسے بوسہ دیا اور کوئی مزاحمت نہ فرمائی اور نہ رکن یمانی کی طرف بڑھے اور نہ ہاتھ اٹھاکر اشارہ کیا' اور نہ آپ نے یہ کہا کہ طواف سے میری یہ نیت ہے اور نہ اس سے پہلے اللہ اکبر کہا' اور نہ حجراسود کی طرف پورے جسم کو سامنے کیا پھر مڑ کر اس کو اپنی داہنی طرف کیا ہو' بلکہ اس کے سامنے آکر بوسہ لیا پھر دائیں جانب چلے' اس وقت آپ باب کعبہ کے پاس یا میزاب کے نیچے یا کعبہ کی پشت پر یا گوشوں کے پاس کھڑے ہو کر کوئی مخصوص دعا نہیں فرمائی اور نہ طواف کے دوران کوئی معین دعائیں مخصوص فرمائیں' البتہ دونوں رکن کے درمیان آپ سے یہ دعا پڑھنا ثابت ہے :

﴿ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِى ٱلْءَاخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ ﴾ [البقرة: ٢٠١]

اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کے تین چکروں میں رمل کیا یعنی چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہوئے چلے اور اضطباع کیا یعنی داہنا مونڈھا کھول کر بائیں مونڈھے پر چادر ڈالدی' اسی طرح داہنا کندھا کھلا ہوا تھا اور بایاں ڈھکا ہوا' آپ جب حجراسود کے سامنے ہوتے تو اس کی طرف اشارہ کرتے اور اسے خمدار عصاء سے چھو کر اسے بوسہ دیتے تھے۔

آپ سے ثابت ہے کہ آپ نے رکن یمانی کا بھی استلام کیا ہے لیکن بوسہ دینا ثابت نہیں ہے اور نہ استلام کے بعد ہاتھ کو بوسہ دینا ثابت ہے۔ آپ سے حجر اسود کو بوسہ دینا ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے اس کا ہاتھ سے استلام کیا ہے یعنی اس کو ہاتھ سے چھو کر ہاتھ کو بوسہ لے لیا ہے' اور یہ بھی ثابت ہے کہ اسے عصاء سے چھوا ہے' اس طرح یہ کل تین صورتیں ثابت ہیں۔

امام طبرانی نے ایک معتبر حوالے سے ذکر کیا ہے کہ آپ جب رکن یمانی کو چھوتے تو بسم اللہ و اللہ اکبر کہتے تھے اور جب حجر اسود کے پاس پہنچتے تو اللہ اکبر کہتے تھے اور حجر اسود اور رکن یمانی کے علاوہ کسی اور حصہ کو چھونا ثابت نہیں۔

جب آپ طواف سے فراغ ہوئے تو مقام ابراہیم کے پیچھے آئے اور یہ آیت پڑھی۔

﴿ وَٱتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبْرَٰهِـۧمَ مُصَلًّى ﴾ [البقرة: ١٢٥]

مقام ابراہیم کو مصلی بنا لیجئے۔

پھر دو رکعت نماز پڑھی' پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ الکافرون اور دوسری رکعت میں سورہ اخلاص تلاوت فرمائی' ان آیات سے یہ مراد تھی کہ یہ تمام کام اللہ ہی کے لئے ہے' نماز سے فارغ ہونے کے بعد حجر اسود کے پاس تشریف لائے اور اس کا بوسہ لیا' پھر سامنے کے دروازے سے صفا کی طرف نکل آئے اور قریب ہو کر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی :

﴿إِنَّ ٱلصَّفَا وَٱلْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ ٱللَّهِ﴾ [البقرة: ١٥٨]

صفا اور مروہ اللہ کی نشانیاں ہیں۔

پھر فرمایا :

«أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِه»

میں بھی اس سے شروع کرتا ہوں جس سے اللہ نے شروع کیا۔

پھر کوہ صفا پر چڑھ کر بیت اللہ کی طرف رخ کیا اور اللہ اکبر کہہ کر یہ دعا پڑھی :

«لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، لَه الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ، أَنْجَزَ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَهَزَمَ الأَحْزَابَ وَحْدَهُ»

اللہ واحد کے سوا کوئی خدا نہیں' اس کی عملداری ہے' اسی کے لئے ستائش ہے اور وہی ہر چیز

پر قادر ہے' اللہ واحد کے سوا کوئی خدا نہیں' اس نے اپنا وعدہ پورا کیا' اپنے بندہ کو فتحیاب کیا اور تمام جماعتوں کو تنہا شکست دی۔

اس طرح تین مرتبہ یہ دعائیں فرمائیں پھر سعی کرتے ہوئے مروہ کی طرف چلے' نشیب میں پہنچ کر دوڑنے لگے جب وادی سے نکل آئے تو معمول کے مطابق چلنے لگے۔

جب مروہ پہنچے تو اس پر چڑھ کر بیت اللہ کا رخ کر کے اللہ تعالیٰ کی تکبیر و توحید بیان کی اور جو صفا پر دعائیں کی تھیں' یہاں پر بھی کیں۔

جب صفا مروہ کی سعی سے فارغ ہو گئے تو ان تمام لوگوں کو جن کے ہمراہ قربانی کے جانور نہ تھے' ہدایت کی کہ اب احرام اتار دیں اور پوری طرح سے حلال ہو جائیں کیونکہ عمرہ کے ارکان پورے ہو گئے اور آٹھویں ذی الحجہ تک اسی طرح رہیں اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قربانی کا جانور تھا اس لئے اپنی نسبت فرمایا اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا تو قربانی کا جانور ساتھ ہرگز نہ لاتا اور صرف عمرہ کا احرام باندھتا' اسی جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال منڈوانے والوں کے لئے تین مرتبہ اور بال چھوٹے کرنے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعاء مغفرت فرمائی۔

ازواج مطہرات نے احرام کھول دیا تھا لیکن حضرت عائشہ ماہواری کی مجبوری کی وجہ سے ایسا نہ کر سکیں۔

آپ نے ان تمام لوگوں کو جن کے ساتھ قربانی کے جانور تھے' احرام میں باقی رہنے کا حکم دیا اور جن کے ساتھ نہیں تھا انہیں احرام کھولنے کا حکم دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں چار دن قیام کے دوران نماز قصر ادا فرماتے رہے اور جمعرات کے دن چاشت کے وقت مسلمانوں کے ساتھ منیٰ تشریف لے گئے جنھوں نے احرام کھول دیا تھا' وہ اپنے گھروں سے حج کا احرام باندھ کر نکلے' اس وقت وہ مسجد حرام نہیں گئے' جب آپ منی پہنچے تو وہاں ظہر و عصر کی نماز ادا کی اور وہیں شب گذاری' جب صبح ہوئی تو عرفات کو روانہ ہوئے اور ضب کا راستہ اختیار فرمایا' صحابہ کرام میں سے بعض تلبیہ کہہ رہے تھے اور بعض تکبیر' آپ دونوں کو سن رہے تھے مگر کچھ نہ کہتے تھے۔

عرفات کے مشرقی حصہ میں مقام نمرہ کے پاس آ گئے تھے' خیمہ نصب کر دیا گیا' اس میں آپ نے قیام فرمایا' سورج ڈھلنے کے بعد قصواء اونٹنی پر سوار ہو کر وادی عرنہ کے نشیبی حصہ تک گئے۔

اسی مقام سے سواری ہی پر بیٹھے ایک عظیم الشان خطبہ دیا اس میں آپ نے اسلامی اصول و قواعد کی وضاحت کی اور جاہلی رسم و رواج کی تردید فرمائی' جان و مال' عزت و آبرو کی حرمت کا اعلان فرمایا' جسے دوسرے اہل مذاہب نے بھی تسلیم کیا تھا۔

اسی خطبہ میں جاہلی معاملات اور سود کے خاتمہ کا اعلان فرمایا' اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی' ان کے حقوق اور فرائض کو بتایا اور یہ بتایا کہ خوراک اور پوشاک ان کا حق ہے لیکن اس کی کوئی تعیین و تحدید آپ نے نہیں فرمائی' شوہر کو آپ نے یہ اجازت دی کہ اگر بیوی اس کی اجازت کے بغیر کسی مرد کو گھر میں داخل کرے تو اسے مار سکتا ہے۔

اس خطبہ میں آپ نے امت کو تمسک بالقرآن کا حکم دیا اور بتایا کہ جب تک مسلمان قرآن کو تھامے رہیں گے' گمراہ نہیں ہوں گے' پھر آپ نے فرمایا کہ صحابہ سے رسول کے متعلق پوچھا جائے گا اور دریافت کیا کہ وہ کیا جواب دیں گے اور کس چیز کی گواہی دیں گے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہم گواہی دیں گے کہ بیشک آپ نے رسالت کا حق ادا فرما دیا اور امت کو نصیحت فرمائی' احکام اسلام بحسن و خوبی پہنچا دیئے تو اس پر آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین مرتبہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا اور صحابہ کرام کو حکم دیا کہ جو موجود ہیں وہ غیر موجود تک آج کی بات پہنچا دیں' اس موقع پر آپ نے ایک ہی خطبہ دیا' درمیان میں بیٹھے نہیں۔

جب آپ نے خطبہ ختم کیا تو حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم دیا چنانچہ اذان اور اقامت ہوئی پھر آپ نے سری قراءت سے ظہر کی دو رکعت ادا کی اور یہ جمعہ کا دن تھا' اس سے یہ معلوم ہوا کہ مسافر پر جمعہ کی نماز فرض نہیں پھر دوبارہ اقامت ہوئی اور آپ نے عصر کی بھی دو رکعتیں ادا فرمائیں' آپ کے ہمراہ اہل مکہ بھی تھے' انہوں نے بھی قصر اور جمع کر کے نماز ادا کی اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سفر قصر میں مسافت کی تعداد متعین نہیں۔

جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو میدان عرفات ہی میں پہاڑ کے دامن میں چٹانوں کے پاس قبلہ رخ سواری ہی پر اس طرح کھڑے ہوئے کہ جبل مشاۃ آپ کے سامنے تھا اور سورج غروب ہونے تک دعا و گریہ زاری میں مصروف رہے اور لوگوں کو حکم دیا کہ وادی عرنہ سے ہٹ جائیں' اور مزید فرمایا کہ عرفات پورے کا پورا جائے وقوف ہے اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے مشاعر میں ٹھہرے رہیں اور وہیں وقوف کریں کیونکہ یہ حضرت ابراہیم کی میراث ہے۔

دعاؤں میں آپ اپنا ہاتھ سینے تک اٹھا لیتے تھے جس طرح کوئی مسکین کھانا مانگ رہا ہو' اس موقع پر ارشاد فرمایا کہ "بہترین دعا عرفات کی دعا ہے"۔

عرفات میں آپ کی دعاؤں میں سے یہ دعائیں منقول ہیں :

«اللَّهُمَّ إِنَّكَ تَسْمَعُ كَلاَمِي، وَتَرَى مَكَانِي، وَتَعْلَمُ سِرِّي، وَعَلاَنِيَتِي وَلاَيَخْفَى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِي أَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ، الْمُسْتَغِيْثُ الْمُسْتَجِيْرُ، الوَجِلُ الْمُشْفِقُ، الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذُنُوْبِهِ أَسْأَلُكَ مَسْأَلَةَ الْمِسْكِيْنِ، وَأَبْتَهِلُ إِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ، وَأَدْعُوْكَ دُعَآءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهُ، وَفَاضَتْ لَكَ عَيْنَاهُ وَذَلَّ جَسَدُهُ، وَرَغِمَ أَنْفُهُ لَكَ، اللَّهُمَّ لاَتَجْعَلْنِي بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا، وَكُنْ بِي رَؤُوْفًا رَحِيْمًا يَاخَيْرَ الْمَسْئُوْلِيْنَ وَيَاخَيْرَ الْمُعْطِيْنَ»

اللہ تو ہی میری بات سنتا ہے' میرے مقام کو دیکھتا ہے' میرے ظاہر و باطن کو جانتا ہے' تجھ سے میرا کوئی معاملہ پوشیدہ نہیں' میں محتاج' مدد اور پناہ کا طالب' ڈرنے والا اور گناہوں کا اعتراف کرنے والا ہوں' تجھ سے مسکین کی طرح مانگتا ہوں اور ذلیل و گنہگار کی طرح عاجزی کرتا ہوں' ڈرنے والے کی طرح تجھے پکارتا ہوں' جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہے' آنکھیں بہ رہی ہیں' جسم ذلیل ہے اور ناک خاک آلودہ ہے' مجھے دعا کے بعد محروم نہ فرما' اور میرے ساتھ شفقت و رحمت کا معاملہ فرما' اے بہترین مسئول اور بہترین دینے والے' (اسے طبرانی نے ذکر کیا ہے)۔

نیز آپ کی دعاؤں میں یہ بھی ثابت ہے :

«اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَالَّذِي تَقُوْلُ، وَخَيْرًا مِمَّا نَقُوْلُ، اللَّهُمَّ لَكَ صَلاَتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي، وَإِلَيْكَ مَآبِيْ، وَلَكَ رَبِّي تُرَاثِيْ، اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَوَسْوَسَةِ الصَّدْرِ، وَشَتَاتِ الأَمْرِ، اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَجِيْءُ بِهِ الرِّيْحُ»

اے اللہ تو ہی حمد کے لائق ہے جو ہم کہہ سکتے ہیں اور ہمارے نطق و کلام سے بہتر ہے' اے اللہ میری نماز' میری قربانی اور میرا جینا مرنا تیرے ہی لئے ہے' اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے'

سب کچھ جمع کیا ہوا تیرے لئے ہے' اے اللہ عذاب قبر سے اور دل کے وسوسوں اور پراگندہ امور سے تیری پناہ چاہتا ہوں' اے اللہ میں اس شر سے جو آندھی لے کر آئے تیری پناہ چاہتا ہوں' (اسے ترمذی نے ذکر کیا ہے)۔

امام احمد نے حضرت عمرو بن شعیب کی حدیث سے نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی کہ عرفہ کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ تر یہ دعا تھی :

«لَآإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ»

اے خدائے واحد جس کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک نہیں' اسی کی بادشاہی ہے اور اس کی حمد ہے' اس کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

ان دعاؤں کی سند میں کچھ کمزوری ہے۔

اس مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی :

﴿ ٱلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًا ﴾

[المائدة : ۳]

آج ہم نے آپ کا دین مکمل کر دیا اور آپ پر اپنی نعمت پوری کر دی اور دین اسلام آپ کے لئے پسند کر لیا۔

اس دوران ایک صحابی اپنی سواری سے گر کر جاں بحق ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دو کپڑوں میں کفن دینے کا حکم فرمایا (یعنی احرام کی چادروں میں) اور ان کو خوشبو نہ لگائی جائے' ان کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیا جائے اور ان کا چہرہ اور سر نہ چھپایا جائے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو قیامت میں اس طرح لبیک کہتے ہوئے اٹھائے گا۔

اس واقعہ سے بارہ احکام مستنبط ہوتے ہیں :

(۱) میت کو غسل دینا واجب ہے۔

(۲) مرنے سے انسان ناپاک نہیں ہوتا' اگر ناپاک ہو جاتا تو غسل سے اس کی نجاست میں اضافہ ہی ہوتا۔

(۳) میت کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیا جائے۔

(۴) پاک چیزوں کی آمیزش سے پانی کی قوت طہوریت (صفائی) زائل نہیں ہوتی۔

(۵) محرم کو غسل دینا جائز ہے۔

(۶) محرم کو بھی بیری کے پتوں اور پانی سے غسل دیا جا سکتا ہے۔

(۷) میراث اور قرض دونوں سے تدفین و تکفین مقدم ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دونوں کپڑوں میں کفن دینے کا حکم دیا اور میراث اور قرض کے متعلق کچھ دریافت نہیں فرمایا۔

(۸) کفن میں دو کپڑوں پر اکتفا کرنا جائز ہے۔

(۹) محرم کو خوشبو لگانا جائز نہیں۔

(۱۰) محرم کا سر چھپانا منع ہے۔

(۱۱) محرم کا چہرہ چھپانا ممنوع ہے' چھ صحابہ کرام اس کے جواز کے قائل ہیں اور جو لوگ اس کی اباحت کے قائل ہیں ان ہی کے اقوال سے دلیل پکڑی ہے اور حدیث کے الفاظ «لَا تُخَمِّرُوْا وَجْهَهُ» یعنی اس کا چہرہ نہ چھپاؤ کو غیر محفوظ بتایا ہے۔

(۱۲) موت کے بعد بھی احرام باقی رہتا ہے۔

جب آفتاب غروب ہو گیا اور زردی بھی ختم ہو گئی اور غروب آفتاب میں کوئی شبہ نہیں رہا تو آپ عرفات سے چل پڑے اور حضرت اسامہ ابن زید کو اپنے پیچھے بیٹھا لیا اور سکینت و خاموشی سے چلتے رہے' ناقہ کی لگام اپنی طرف کھینچ لی یہاں تک کہ اس کا سر کجاوے کے قریب آ گیا' اس موقع پر آپ فرما رہے تھے "اے لوگو! سکون و اطمینان سے چلو کیونکہ تیز چلنا نیکی نہیں ہے"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مازمین کے راستے سے واپس ہوئے اور ضب کے راستے سے عرفات تشریف لائے تھے۔

عید کے موقعوں پر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت طیبہ تھی کہ آپ راستہ بدل دیا کرتے تھے' پھر آپ نے چلنے کا وہ انداز اختیار کیا جسے (سیر عنق) کہتے ہیں۔ یعنی نہ بہت آہستہ نہ بہت تیز' جب آپ کو وسیع میدان نظر آتا تو ذرا تیز ہو جاتے اور جب کسی ٹیلے پر پہنچتے تو اونٹنی کی باگ قدرے ڈھیلی چھوڑ دیتے تاکہ وہ چڑھ جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارے راستہ میں مسلسل تلبیہ کہتے رہتے تھے' راستہ میں ایک جگہ آپ نے پیشاب کر کے وضو فرمایا' حضرت اسامہ نے عرض کیا نماز پڑھنا ہے تو آپ نے فرمایا کہ "جائے نماز

آگے ہے"۔ پھر آپ مزدلفہ پہنچے اور نماز کے لئے وضو کیا اور موذن کو اذان دینے کا حکم فرمایا اور اقامت کہلوائی پھر مغرب کی نماز ادا کی' نماز کے بعد لوگوں نے سامان اتارا اور سواریوں کو بیٹھایا۔ پھر دوبارہ اقامت کہی گئی اور عشاء کی نماز ادا فرمائی' عشاء کے لئے اذان نہیں کہی' مغرب و عشاء کے درمیان آپ نے کوئی نماز نہیں پڑھی۔

پھر آپ سو گئے یہاں تک صبح ہو گئی' اس رات آپ نے کوئی عبادت نہیں کی اور نہ عیدین کی راتوں میں آپ سے کوئی عبادت ثابت ہے' اس رات چاند ڈوبنے کے بعد آپ نے کمزور اہل و عیال کو فجر سے پہلے منی روانگی کا حکم دے دیا اور ان کو تاکید فرمائی کہ آفتاب نکلنے سے پہلے کنکریاں نہ ماریں' جس میں یہ مذکور ہے کہ حضرت ام سلمہ نے فجر سے پہلے کنکری ماری وہ منکر ہے۔ امام احمد نے اس کا انکار کیا ہے اور حضرت سودہ وغیرہ کی حدیثیں ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ غور و فکر کرنے کے بعد ان حدیثوں میں ہمیں کوئی تعارض نہیں معلوم ہوا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آفتاب نکلنے سے پہلے کنکری مارنے سے بچوں کو روک دیا کیونکہ اس کے لئے ان کا کوئی عذر نہیں' البتہ عورتوں کو آفتاب نکلنے سے پہلے کنکری مارنے کی اجازت اس عذر کی وجہ سے دے دی کہ بعد میں بھیڑ ہو جائے گی اور ان کے لئے اندیشہ ہو جائے گا' احادیث سے یہی ثابت ہے کہ بیماری یا بڑھاپے کا عذر ہو تو آفتاب نکلنے سے پہلے کنکری مارنا جائز ہے' لیکن جو شخص طاقت و تندرستی رکھتا ہو اس کے لئے تقدیم جائز نہیں' حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روانگی میں جلدی چاند ڈوبنے کے بعد ہوگی' آدھی رات میں نہیں' اس کی تحدید کی کوئی دلیل نہیں۔

طلوع فجر کے بعد اول وقت میں نماز فجر ادا فرمائی اور اس کے لئے آذان و اقامت کہی گئی' پھر سوار ہو کر مشعر حرام کے پاس آئے اور قبلہ رخ ہو کر دعا و تضرع' تکبیر و تہلیل و ذکر الہی میں مشغول ہو گئے حتیٰ کہ کافی روشنی ہوئی اور مزدلفہ کی اسی جگہ کھڑے ہو کر یہ فرمایا کہ پورا مزدلفہ وقوف کی جگہ ہے۔

پھر آپ مزدلفہ سے حضرت فضل بن عباس کو پیچھے سواری پر بیٹھا کر چلے اور راستہ بھر تلبیہ کہتے رہے' اور حضرت اسامہ بن زید قریش کی جماعت کے ساتھ ساتھ پیدل جا رہے تھے۔

یہیں راستے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ رمی الجمار کے لئے سات کنکریاں چن لیں' جنہیں اسی رات پہاڑ سے نہیں توڑا تھا جس طرح آج کل لوگ لاعلمی میں کرتے ہیں اور نہ ہی رات میں چنی تھی' چنانچہ آپ انہیں اپنے ہاتھ میں اچھالنے لگے اور فرمانے لگے' ایسی ہی

کنکریوں سے رمی کرو اور دین میں غلو کرنے سے بچو اور پچھلی قومیں دین میں غلو کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔

جب آپ وادی محسر میں پہنچے تو اونٹنی کی رفتار تیز کردی' آپ کا طریقہ یہی تھا کہ جب ان مقامات میں پہنچتے جہاں قوموں پر عذاب نازل ہوا ہے تو آپ تیزی سے نکل جاتے' اس جگہ اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا جس کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ذکر کیا ہے' اسی وجہ سے اس جگہ کا نام وادی محسر رکھا گیا' محسر یعنی روک دینا اور اس جگہ ہاتھی مکہ میں داخل ہونے سے رک گئے تھے۔

اسی طرح مقام حجر سے گذرتے ہوئے بھی آپ نے کیا تھا۔ محسر' منی اور مزدلفہ کے درمیان حد فاصل ہے اور دونوں میں سے کسی میں سے نہیں ہے' اس طرح "عرنہ" عرفات اور مشعر حرام کے درمیان حد فاصل ہے' اس طرح دو مشاعر کے درمیان ایک حد فاصل ہے جو نہ اس میں داخل ہے اور نہ اس میں۔

چنانچہ منی حرم میں داخل ہے اور مشعر بھی ہے' اور محسر حرم میں داخل تو ہے لیکن مشعر نہیں' اور مزدلفہ حرم بھی ہے اور مشعر بھی ہے' اور عرنہ حل میں ہے اور مشعر نہیں ہے' اور عرفات حل میں داخل ہے اور مشعر بھی ہے۔

آپ جب منی پہنچے تو درمیانی راستہ سے جمرہ عقبہ کے پاس آئے اور جمرہ کے سامنے وادی میں اس طرح کھڑے ہوئے کہ مکہ آپ کے بائیں اور منی آپ کے دائیں ہاتھ تھا' پھر طلوع آفتاب کے بعد سواری پر سے یکے بعد دیگرے سات کنکریاں پھینکیں' ہر کنکری پر تکبیر کہتے تھے اور لبیک کہنا بند کردیا تھا' حضرت اسامہ اور حضرت بلال آپ کے ساتھ ساتھ تھے' ایک اونٹنی کی مہار تھامے تھے اور دوسرے دھوپ سے بچانے کے لئے کپڑا تانے ہوئے تھے' اس سے ثابت ہوا کہ محرم کیلئے دھوپ سے بچنا جائز ہے۔

پھر آپ منی واپس آئے اور ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا جس میں لوگوں کو قربانی کے دن کی حرمت و عظمت اور فضیلت بیان فرمائی اور مکہ مکرمہ کی تمام شہروں پر فضیلت سے آگاہ کیا اور حکم فرمایا کہ کتاب اللہ کے مطابق حکمرانی کرنے والوں کی اطاعت کریں' مزید ارشاد فرمایا کہ مجھ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) سے مناسک حج سیکھ لیں' ممکن ہے کہ یہ آپ کا آخری حج ہو' پھر لوگوں کو حج کے مسائل کی تعلیم دی اور مہاجرین اور انصار کو اپنے مرتبوں پر رکھا اور یہ حکم دیا کہ آپ کے بعد کفر کی طرف نہ لوٹیں اور ایک دوسرے کو قتل نہ کریں' آپ نے تبلیغ احکام کا حکم دیا اور بتایا کہ "اکثر سننے والے بھول جاتے ہیں اور ان

سے سیکھنے والوں کو یاد رہتا ہے" خطبہ میں آپ نے فرمایا کہ "مجرم خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے"۔

مہاجرین کو آپ نے قبلہ کے دائیں طرف اور انصار کو بائیں طرف اتارا' دوسرے لوگ ان کے ارد گرد تھے' اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اندر اتنی قوت سماعت پیدا کر دی تھی کہ اہل منیٰ نے بھی اپنے اپنے گھروں میں آپ کا خطبہ سنا۔

آپ نے خطبہ میں مزید فرمایا کہ "اپنے رب کی عبادت کرو اور پانچوں نمازیں پڑھو اور مہینے کے روزے رکھو' جب حکم دیا جائے تو اطاعت کرو اور اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ"۔

پھر آپ نے لوگوں کو الوداع کیا تو لوگ کہنے لگے یہ حجتہ الوداع ہے' پھر آپ منیٰ میں قربانی کے مقام پر تشریف لے گئے چنانچہ وہاں تریسٹھ اونٹ ذبح کئے' اونٹ کو کھڑا رکھ کر اور اس کی اگلی بائیں ٹانگ باندھ کر آپ نے نحر کیا' زندگی کے سال کے مطابق تریسٹھ اونٹ ذبح کرنے کے بعد سو میں سے بقیہ اونٹوں کو ذبح کرنے کے لئے آپ نے حضرت علی کو حکم دیا اور ان کے جھول' کھال اور گوشت کو مسکینوں میں تقسیم کر دیا' قصاب کو اجرت میں قربانی کی کوئی چیز دینے سے منع فرما دیا اور بتایا کہ ہم اسے اپنے پاس سے اجرت دیں گے' پھر فرمایا کہ جو چاہے قربانی میں سے کاٹ کر لے جائے۔

اس موقع پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر سات اونٹ ذبح کئے تو اسکی تین طرح سے توجیہ کی جا سکتی ہے۔

اول یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے سات سے زیادہ اونٹ ذبح نہیں کئے اور باقی تریسٹھ اونٹ ذبح کرنے کا کسی اور کو حکم دے دیا تھا' جب تریسٹھ اونٹ ذبح ہو گئے تو سو کا عدد پورا کرنے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا اور اس جگہ سے چلے گئے۔

دوسرے یہ کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے صرف سات ہی اونٹ ذبح کرتے ہوئے دیکھا اور حضرت جابر نے تمام اونٹوں کو' دونوں حضرات نے اپنے اپنے مشاہدے کے مطابق تعداد کا ذکر کیا ہے۔

تیسرے یہ کہ پہلے آپ نے سات اونٹ ذبح کئے پھر آپ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مل کر یکے بعد دیگرے تریسٹھ اونٹ ذبح کئے' جیسا کہ غرفہ بن حارث کندی کا بیان ہے کہ انہوں نے اس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ برچھے کا اوپری حصہ تھامے ہوئے ہیں اور حضرت علی کو نچلا حصہ پکڑنے کا حکم دیا اور ان دونوں نے مل کر جانور ذبح کئے' تریسٹھ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سو تک ذبح کئے جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے' واللہ اعلم۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کسی سے یہ منقول نہیں کہ ھدی اور قربانی ایک ساتھ کی جائے' اس موقع پر ھدی ہی قربانی ہے' منیٰ میں جو جانور ذبح کیا جائے' وہ ھدی ہے اور دوسری جگہ جو ذبح کیا جائے' وہ قربانی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یہ مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے قربانی کی تو اس سے مراد ھدی ہے' اس لئے وہ سبھی متمتع تھیں جن پر ھدی واجب تھی جو ان کی طرف سے آپ نے ذبح فرمایا۔

لیکن یہاں یہ اشکال ہے کہ امہات المومنین کی تعداد نو تھی اور گائے صرف سات افراد کے لئے کافی ہے تو اس کے متعلق حدیث میں تین الفاظ آئے ہیں' ایک یہ کہ ان کے درمیان ایک گائے ذبح کی' دوسرا یہ کہ ان کی طرف اس دن گائے کی قربانی پیش کی' تیسرا یہ ہے کہ ہمارے پاس قربانی کے دن گائے کا گوشت لائے' میں نے دریافت کیا یہ کیا ہے' جواب ملا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کی طرف سے ذبح کیا ہے۔

ایک گائے اور اونٹ میں کتنے افراد شریک ہو سکتے ہیں' اس سلسلہ میں اختلاف ہے' ایک قول ہے کہ سات آدمیوں کی طرف سے درست ہے' ایک قول دس کا بھی ہے' یہ اسحاق کا قول ہے۔

مختلف حدیثوں کا ذکر کرکے امام ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان احادیث کی تین توجیہ کی جا سکتی ہیں۔ یا تو یہ کہا جائے کہ سات کی حدیثیں بکثرت اور صحت کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہیں' یا یہ کہا جائے کہ غنیمت کی تقسیم کے وقت اونٹ دس بکریوں کے برابر سمجھا جائے گا تاکہ تقسیم منصفانہ ہو لیکن قربانی اور ہدی میں صرف سات آدمیوں کی طرف سے درست ہونے کا حکم ایک شرعی قاعدے اور اندازے کی بنا پر ہے' یا یہ کہا جائے کہ یہ اندازے اختلاف زمان و مکان یا اونٹ کے سبب مختلف ہو جاتے ہیں' واللہ اعلم۔

آپ نے منیٰ کے مذبح میں جانور ذبح کیا اور یہ فرمایا کہ پورا منیٰ کا علاقہ جائے قربانی ہے اور مکہ کی گلیاں راستہ اور منحر دونوں ہیں' یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نحر صرف منیٰ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ مکہ مکرمہ میں جہاں بھی قربانی کر دی جائے' جائز ہے' جیسے آپ نے عرفات میں وقوف کرکے فرمایا کہ ہم نے یہاں وقوف کیا لیکن سارا میدان عرفات جائے وقوف ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منیٰ میں عرض کیا گیا کہ کیا یہاں آپ کے لئے پہلے سے کوئی خیمہ

وغیرہ لگا دیا جائے تاکہ گرمی سے حفاظت ہو سکے تو آپ نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ منیٰ میں جو پہلے جہاں پہنچ گیا' وہ اس جگہ کا حقدار ہو گیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ منیٰ تمام مسلمانوں کی مشترکہ سرزمین ہے اور جو جس جگہ پہلے پہنچ جائے' اس کا حقدار ہے لیکن وہ جگہ اس کی ملکیت ہرگز نہیں البتہ روانگی تک اس کے قبضہ میں رہے گی۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قربانی سے فارغ ہو گئے تو حجام کو بلایا اور سر کا حلق کرایا' حجام سے آپ نے فرمایا "اے معمر تیرے ہاتھ میں استرا ہے اور ہم نے اپنے کان کی لو تیرے حوالے کر دی ہے تو انہوں نے عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! خدا کی قسم یہ تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس کا بڑا احسان ہے' آپ نے فرمایا : ہاں ایسی صورت میں میں تمہارے لئے اقرار کرتا ہوں" اسے امام احمد نے ذکر کیا ہے' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجام سے فرمایا کہ شروع کرو اور اپنی دائیں جانب کی طرف اشارہ فرمایا' جب وہ فارغ ہوا تو آپ نے اپنے پاس والوں پر وہ بال تقسیم فرما دیئے پھر حلاق کو اشارہ کیا تو اس نے بائیں طرف کا حلق کیا' پھر آپ نے دریافت فرمایا' ابو طلحہ یہاں ہیں' چنانچہ وہ بال ان کو عطا فرما دیئے۔

اس موقع پر آپ نے سر منڈوانے والوں کے لئے تین بار اور چھوٹے کرنے والوں کے لئے ایک بار دعائے مغفرت فرمائی' اس سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ حلق حج کی ایک عبادت ہے' صرف ممنوعات سے آزادی کا ایک ذریعہ نہیں۔

طواف افاضہ : پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے قبل سوار ہو کر مکہ مکرمہ کی طرف تشریف لے گئے اور طواف افاضہ کیا اور یہی آپ کا طواف زیارت بھی تھا' اس موقع پر نہ تو کوئی دوسرا طواف کیا اور نہ سعی کی اور یہی درست ہے۔

طواف افاضہ اور طواف وداع دونوں میں آپ نے رمل نہیں کیا بلکہ صرف طواف قدوم میں رمل کا ثبوت ہے' پھر آپ زمزم کے پاس تشریف لائے اور وہاں لوگ پانی پی رہے تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تاکہ لوگ تم پر غالب آ جائیں گے تو میں خود اتر کر تمہارے ساتھ پانی پیتا' پھر صحابہ نے آپ کو ڈول میں پانی دیا' آپ نے کھڑے ہو کر پانی پیا۔

اس واقعہ پر بعض لوگوں نے کہا کہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے ممانعت ایک استحبابی حکم ہے' بعض لوگوں کی رائے ہے کہ کھڑے ہو کر ضرورتاً پینے کی اجازت ہے اور یہی زیادہ راجح ہے۔

صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر طواف کیا' آپ چھتری سے حجر اسود چھو رہے تھے اور اسی حدیث میں ہے کہ تاکہ لوگوں کو دکھا سکیں اور لوگ آپ سے مسائل دریافت کر سکیں کیونکہ لوگوں نے آپ کو گھیر رکھا تھا اور یہ طواف وداع نہیں تھا کیونکہ آپ نے یہ رات میں طواف کیا تھا اور طواف قدوم بھی نہ تھا کیونکہ اس میں رمل نہ کیا تھا اور سواری پر سے رمل کا کوئی قائل نہیں ہے' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم منی واپس آ گئے۔

اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز منی میں ادا کی یا مکہ مکرمہ میں اور اس دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک طواف اور ایک سعی کی اور یہ ان کے حج و عمرہ کے لئے کافی ہو گیا۔

حضرت صفیہ نے بھی اسی دن طواف کیا تو اس کے بعد وہ ماہواری میں مبتلا ہو گئیں تو انہیں طواف وداع کی طرف سے یہ طواف کافی ہو گیا' چنانچہ انہوں نے طواف وداع مستقل طور پر نہیں کیا۔

اس طرح عورت کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ ہو گئی کہ اگر حج قران میں عورت کو طواف افاضہ سے قبل حیض آ جائے تو اسے ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے اور اگر طواف افاضہ کے بعد حیض آ جائے تو یہ طواف طواف وداع کی جانب سے کافی ہے اور طواف وداع کرنے کی ضرورت نہیں۔

پھر منی واپس آ کر وہیں رات گذاری' جب صبح ہوئی تو زوال آفتاب تک انتظار کیا' جب سورج ڈھل گیا تو جمرات کی طرف پیدل تشریف لے گئے اور جمرہ اولی سے شروع کیا' جو مسجد خیف سے متصل ہے' تیسرے جمرہ تک ہر ایک پر سات سات کنکریاں پھینکیں' ہر کنکری پر تکبیر کہتے اور جب سات پوری ہو جاتیں تو ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے تھے' دعا اتنی طویل کرتے جتنی سورہ البقرہ پڑھی جا سکے لیکن تیسرے جمرہ پر دعا نہیں فرمائی اور کنکریاں پھینکنے کے بعد ہی واپس آ گئے' بعض لوگوں نے اس کی یہ وجہ بتائی کہ جگہ تنگ تھی' بعض لوگوں نے کہا کہ اس موقع کی دعا اس عبادت کا ایک حصہ ہے' اس لئے رمی سے فارغ ہونے کے بعد دعا کے کوئی معنی نہیں' بلکہ عبادت کے دوران ہی کی دعا افضل ہے۔

میرے دل میں ہمیشہ اس بات کا کھٹکا رہا کہ آپ نماز ظہر سے قبل رمی کرتے تھے یا بعد میں' گمان غالب یہ ہے کہ آپ نماز سے قبل ہی رمی کرتے تھے کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے کہ جب سورج ڈھل جاتا تھا تب آپ رمی فرماتے تھے۔

فصل (۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منیٰ میں معمولات اور اسوہ حسنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حج کے دوران چھ مقامات پر دعا کے لئے ٹھہرے' کوہ صفا پر' کوہ مروہ پر' میدان عرفات میں' مزدلفہ میں' جمرہ اولی کے قریب اور جمرہ ثانیہ کے قریب۔

آپ نے منیٰ میں دو خطبے دیئے' ایک قربانی کے دن جس کا ذکر ہو چکا ہے' دوسرا ایام تشریق کے درمیانی دن میں' یہیں پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حاجیوں کو پانی پلانے کی غرض سے منیٰ کے بجائے مکہ میں رات گذارنے کی اجازت چاہی تو مرحمت فرما دی' اس طرح اونٹوں کے چرواہوں نے منی سے باہر اپنے اونٹوں کے پاس رات گذارنے کی اجازت مانگی تو آپ نے انہیں بھی اجازت دے دی اور فرمایا کہ قربانی والے دن کنکری مارلیں اور پھر بعد کے دنوں کی کنکریاں کسی ایک دن میں اکٹھی مارلیں' اور یہ ان کے حق میں ایک رخصت تھی' امام مالک فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دنوں میں سے پہلے دن رمی کے لئے فرمایا' پھر وہ آخری دن رمی کریں۔

اس حدیث کے متعلق ابن عینیہ کا قول ہے کہ چرواہوں کو آپ نے رخصت دی ہے کہ ایک دن کنکری ماریں اور ایک دن چھوڑ دیں۔

ان مذکورہ دونوں طرح کے لوگوں کے لئے حدیث سے منیٰ میں رات نہ گذارنے کی اجازت ملتی ہے لیکن کنکریاں مارنا نہ چھوڑیں بلکہ تاخیر کر کے رات میں ماریں یا دونوں کے بدلہ ایک ہی دن کنکری مارلیں۔

اگر کسی کو اپنے مال کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو یا کوئی مریض جو قافلے سے بچھڑ جانے کا خوف رکھتا ہو یا منی میں رات گذارنے پر قادر نہ ہو' ایسے تمام لوگوں کے لئے رات گذارنی ضروری نہیں بلکہ ان سے یہ حکم ساقط ہو جائے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دن میں کنکری مار کر جانے میں جلدی نہیں کی بلکہ تیسرے دن بھی رک کر پورے تین دن کنکری ماری اور منگل کے دن ظہر کے بعد وادی محصب کی طرف روانہ ہوئے جو

بلندی پر واقع ہے' اور جہاں بنی کنانہ کا خیمہ تھا' وہاں حضرت ابو رافع نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قبہ بنا رکھا تھا اور انہوں نے یہ کام ازخود محض اللہ تعالٰی کی توفیق سے کیا تھا' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایسا کرنے کا حکم نہ دیا تھا' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا فرمائی اور سو گئے پھر اٹھ کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور سحری کے وقت طواف وداع فرمایا۔

اس رات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صرف عمرہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے فرمایا بیت اللہ اور صفا و مروہ کا طواف کرلینا ان کے حج و عمرہ کی طرف سے کافی ہو جائے گا' لیکن انہوں نے مستقل اور مکمل طور پر عمرہ کرانے پر اصرار کیا تو آپ نے ان کے بھائی کو حکم دیا کہ انہیں تنعیم سے عمرہ کرالیں' چنانچہ وہ بھی رات میں اس طرح سے عمرہ کرکے فارغ ہو کر اپنے بھائی کے ساتھ وادی محصب پہنچ گئیں' آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم لوگ عمرہ سے فارغ ہو گئے' حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ ہاں' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قافلے کو روانہ ہونے کا حکم فرمایا اور لوگ روانہ ہو گئے' علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ وادی محصب میں قیام سنت طیبہ ہے یا محض ایک اتفاقی قیام تھا' اس سلسلہ میں دو قول ہیں۔

فصل (۳۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر حج سے واپسی کا طریقہ

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ بیت اللہ کے اندر داخل ہونا حج کی سنت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے' لیکن احادیث کے مجموعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کسی حج یا عمرے کے موقع پر خانہ کعبہ میں داخل نہیں ہوئے البتہ فتح مکہ کے وقت اس میں داخل ہوئے تھے' اسی طرح ملتزم کے پاس کھڑے ہو کر فتح مکہ کے موقع پر دعائیں فرمائی تھیں' رہی ابو داود کی روایت جس میں عمرو بن شعیب روایت کرتے ہیں اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے کہ انہوں نے اپنا سینہ' چہرہ' بازو' اور ہتھیلیاں ملتزم پر رکھ کر پھر پھیلا کر دعا مانگی اور فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس طرح کیا تھا۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے طواف وداع کے موقع پر ایسا کیا ہو یا پھر طواف وداع کے علاوہ کیا ہو' لیکن مجاہد وغیرہ فرماتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ طواف وداع کے بعد ملتزم کے پاس تھوڑی دیر کھڑے ہو کر دعا کی جائے' حضرت عبداللہ ابن عباس ملتزم کے درمیان کھڑے ہوتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلنے کا ارادہ کر رہے تھے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جو مریض تھیں اور طواف نہیں کیا تھا' نکلنا چاہا تو آپ نے ان سے فرمایا کہ جب لوگ فجر کی نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سوار ہو کر طواف کر لو' اور انہوں نے ایسا ہی کیا اور نماز نہ پڑھی یہاں تک کہ وہ بھی چل پڑیں۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ یہ کام یوم النحر کو ہوا ہو بلکہ یہ طواف وداع تھا۔ جس میں کوئی شک نہیں ہے' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دن فجر کی نماز آپ نے مکہ مکرمہ ہی میں ادا فرمائی' حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو نماز میں سورہ طور پڑھتے سنا۔ پھر آپ مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

جب آپ مقام روحاء پر پہنچے تو ایک سوار ملا' اس نے سلام کیا اور پوچھا' یہ کون لوگ ہیں' بتایا گیا' مسلمان لوگ ہیں' پھر دریافت کیا یہ کون ہیں' بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

پھر ایک عورت نے ایک شیر خوار بچے کو رکھ کر عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اس کا

بھی حج ہوگا' فرمایا ہاں اس کا بھی حج ہوگا اور تجھے ثواب ملے گا۔

واپسی میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحلیفہ میں رات گذاری' صبح جب مدینہ منورہ نظر آیا تو تین بار تکبیر کہی اور یہ دعا پڑھی :

«لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، آئِبُوْنَ، تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ، سَاجِدُوْنَ، لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ صَدَقَ اللهُ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الأَحْزَابَ وَحْدَهُ»

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ اکیلا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' بادشاہی اور حمد اس کی ہے' وہ ہر چیز پر قادر ہے' ہم واپس لوٹے توبہ کرتے ہوئے' عبادت کرتے ہوئے' سجدہ کرتے ہوئے اور اپنے رب کی تعریف کرتے ہوئے' اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا' اپنے بندہ کی مدد کی اور جماعتوں کو تنہا شکست دی۔

پھر آپ دن کے وقت معرس کے راستے سے مدینہ میں داخل ہوئے' جب آپ تشریف لے گئے تھے تو شجرہ کے راستے سے گئے تھے۔

فصل (۳۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قربانی دینے اور عقیقہ کرنے کا طریقہ

قربانی اور عقیقہ صرف ان آٹھ قسموں کے جانوروں کے ساتھ مخصوص ہے جن کا ذکر سورہ انعام میں موجود ہے' ان کے علاوہ اور جانوروں کی قربانی ثابت نہیں' وہ آٹھوں قسم قرآن کی ان چار آیتوں میں مذکور ہیں :

پہلی آیت کریمہ :

﴿ أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ ٱلْأَنْعَٰمِ ﴾ [المائدة: ١]

تمہارے لئے چوپائے مویشی حلال کئے گئے۔

دوسری آیت کریمہ :

﴿ لِيَذْكُرُوا۟ ٱسْمَ ٱللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ ٱلْأَنْعَٰمِ ﴾ [الحج: ٣٤]

تا کہ اللہ کے دیئے ہوئے چوپایوں پر اللہ کے نام ذکر کریں۔

تیسری آیت کریمہ :

﴿ وَمِنَ ٱلْأَنْعَٰمِ حَمُولَةً وَفَرْشًا ﴾ [الأنعام: ١٤٢]

اور خدا نے چوپایوں میں سے بعض بوجھ دار اور بعض زمین سے لگے ہوئے پیدا کئے۔

چوتھی آیت کریمہ :

﴿ هَدْيًۢا بَٰلِغَ ٱلْكَعْبَةِ ﴾ [المائدة: ٩٥]

کعبہ تک پہنچنے والی قربانی۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ کو پہنچنے والی ہدی انہیں آٹھ جوڑوں میں سے ہوگی' اسی سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا استنباط ہے۔

وہ ذبیحے جن سے اللہ کا تقرب اور اس کی عبادت مقصود ہوتی ہے' اس کی تین قسمیں ہیں' ہدی'

قربانی' عقیقہ - ہدی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری اور اونٹ دیئے' ازواج مطہرات کی طرف سے گائے ذبح فرمائی' نیز آپ نے مقام عمرہ' حج میں ہدی پیش کی' بکری کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدی میں بھیجتے تو قلادہ پہنا دیتے تھے اور نشان نہ لگاتے تھے۔

جب آپ مقیم ہوتے اور ہدی بھیجتے تو کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام نہ کرتے تھے' اور جب اونٹ بطور ہدی کے لے جاتے تو اسے قلادہ بھی ڈالتے اور نشان بھی لگاتے تھے' چنانچہ آپ اس کی کوہان کی دائیں جانب سے ذرا شق کر دیتے تاکہ خون نکل آئے' ہدی بھیجتے ہوئے آپ قاصد کو یہ حکم دیتے تھے کہ اگر کوئی جانور مرنے لگے تو اسے ذبح کر دے اور جوتے کو اس کے خون سے رنگ کر اس کے پہلو میں رکھ دے' اس کا گوشت نہ خود کھائے نہ اپنے ساتھیوں کو کھلائے' بلکہ دوسروں میں تقسیم کر دے' گوشت کے استعمال کرنے سے روکنے کا مقصد یہ تھا کہ قاصد جانوروں کی حفاظت میں کوتاہی نہ کرے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو ایک اونٹ اور ایک گائے میں سات آدمیوں کو شریک ہونے کی اجازت دی ہے اور ہدی کے لے جانے والے کو بھی اجازت دی ہے کہ اگر اور سواری میسر نہ ہو تو سہولت کے ساتھ اس پر سوار ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اسے دوسری سواری مل جائے' حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اونٹنی کا دودھ بھی استعمال کر سکتا ہے جب اس کے بچہ سے فاضل بچ جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ آپ اونٹوں کے بائیں پاؤں کو باندھ کر تین پاؤں پر کھڑا کر کے انہیں نحر کرتے اور نحر کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہتے تھے اور آپ قربانی کے جانور کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے تھے۔ بسا اوقات یہ کام کسی دوسرے کے سپرد بھی کر دیتے' جیسا کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سو میں سے بقیہ اونٹوں کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکری ذبح کرتے تو اپنا پیر اس کے چہرہ پر رکھتے پھر بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ہدی اور قربانی کے گوشت میں سے کھانے کی اور بطور تحفہ و توشہ لے جانے کی بھی اجازت دی ہے اور تین دن سے زیادہ جمع رکھنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس سال لوگوں کو تکلیف و مشقت تھی چنانچہ آپ کا خیال تھا کہ انہیں وسعت حاصل ہو جائے۔

بسا اوقات آپ نے ہدی کا گوشت تقسیم فرمایا' اور بسا اوقات یوں بھی فرمایا جو چاہے ایسا کرے' اور جو چاہے کاٹ کر لے جائے' اس اجازت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ شادی وغیرہ میں اگر کوئی چیز نچھاور کی جائے تو اسے لوٹنا جائز ہے' کچھ لوگوں نے دونوں میں فرق بتایا ہے جو کہ غیر واضح ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ عمرہ کے ہدی کو مروہ کے پاس اور حج قران کے ہدی کو منی میں ذبح کرتے تھے اور آپ نے حلال ہونے سے قبل کبھی ذبح نہیں کیا' نیز آپ ہمیشہ طلوع آفتاب اور رمی کے بعد ہی ذبح کرتے تھے۔

حاصل یہ ہے کہ یوم النحر (دسویں تاریخ) کو آپ ترتیب کے ساتھ یہ چار کام کرتے تھے' پہلے رمی دوم قربانی سوم بال منڈانا' چہارم طواف کرنا' سورج نکلنے سے قبل قربانی کی قطعاً اجازت نہیں دی ہے۔

فصل (۳۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قربانی کے جانور کے انتخاب میں اسوہ حسنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی قربانی کا ناغہ نہیں فرماتے تھے' آپ نماز کے بعد دو مینڈھوں کی قربانی کرتے تھے اور فرماتے' جس نے نماز عید سے قبل ذبح کر دیا اس کی قربانی نہیں ہوئی' بلکہ وہ ایک گوشت ہے جو اس نے اپنے گھر والوں کے لئے مہیا کیا ہے' آپ کی سنت طیبہ کا یہی مطلب ہے اور محض وقت نماز کا کچھ اعتبار نہیں۔

آپ نے یہ حکم دیا کہ بھیڑ کا ایک سال کا بچہ ذبح کیا جائے اور دوسرے جانوروں سے جانور دو دانت والا ہو چکا ہو۔ آپ سے مروی ہے کہ تشریق کے تمام دن ذبح کے دن ہیں لیکن یہ حدیث منقطع ہے' امام عطاء' امام حسن بصری' امام شافعی کا یہی مذہب ہے اور ابن منذر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

آپ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ قربانی کا جانور بہترین اور تمام عیوب سے پاک منتخب فرماتے تھے اور آپ نے کان کٹے اور سینگ ٹوٹے ہوئے جانور کی قربانی سے منع فرمایا ہے' اسے ابو داؤد نے ذکر کیا ہے' آپ نے حکم دیا ہے کہ آنکھوں اور کانوں کو دیکھ لیا جائے یعنی ان کے صحیح و سالم ہونے کا بخوبی جائزہ لے لیا جائے۔

لنگڑے جانور یا جس کا کان آگے یا پیچھے سے کٹا ہو یا جس کا کان پھٹا ہو یا جس کے کان میں سوراخ ہو' کسی کی قربانی نہیں کرنی چاہئے' امام ابوداؤد نے اسے ذکر کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ عیدگاہ میں قربانی کرنے کی تھی' ابوداؤد نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے قربانی کے دن دو سینگوں والے خوبصورت دو مینڈھے ذبح کئے' جب آپ نے انہیں لٹایا تو یہ دعا پڑھی۔

«وَجَّهْتُ وَجْهِي لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضَ حَنِيْفًا وَمَا أَنَا مِنَ

الْمُشْرِكِيْنَ، إِنَّ صَلاَتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي للهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، لاَشَرِيْكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ، اللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَأُمَّتِهِ، بِسْمِ اللهِ وَاللهُ أَكْبَرُ»

میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے کی طرف کر دیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں' میری نماز میری قربانی' میرا جینا' اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہے جو سارے جہاں کا پروردگار ہے' اس کا کوئی شریک نہیں 'مجھے اسی کا حکم ہے اور میں پہلا مسلمان ہوں' اے اللہ تیرے لئے اور تیری ہی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کی جانب سے۔

پھر آپ نے ذبح کیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ جب ذبح کریں تو اچھی طرح ذبح کریں اور جب قتل کریں تو اچھے انداز سے قتل کریں' اور مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کو فرض کیا ہے' آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ بکری ایک آدمی اور اس کے گھر والوں کی جانب سے کافی ہے۔

فصل (۳۴)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عقیقہ سے متعلق اسوہ حسنہ

موطا میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیقہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا "میں عقوق (نافرمانی) کو پسند نہیں کرتا" گویا آپ نے عقوق کے لفظ کو ناپسند فرمایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صحیح روایت سے ثابت ہے کہ "لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ہے"۔ نیز آپ نے فرمایا "ہر بچہ کے ذمہ اس کے عقیقہ کی قربانی ہے' لہٰذا چاہیئے کہ ساتویں دن اس کی طرف سے قربانی کی جائے' اس کا سر مونڈا جائے اور اس کا نام رکھا جائے"۔

حدیث میں ہے کہ "ہر لڑکا عقیقہ کا مرہون ہوتا ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ جس بچے کا عقیقہ نہ ہو' اسے والدین کی شفاعت سے روک دیا جائے گا' ظاہری معنی یہ ہے کہ بچہ اپنی ذات سے متعلق مرہون ہوگا اور ہر بھلائی سے محروم ہوگا لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آخرت میں اسے سزا ملے گی' بعض مرتبہ لڑکا والدین کی کوتاہیوں کی وجہ سے بھلائی سے روک دیا جاتا ہے جیسے جماع کے وقت بسم اللہ نہ پڑھی جائے۔

امام ابو داؤد نے مراسیل میں حضرت جعفر سے روایت کی ہے' وہ محمد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن اور حسین کے عقیقہ کے موقع پر فرمایا" دائی کے گھر میں ایک ٹانگ بھیج دو اور خود کھاؤ اور دوسروں کو کھلاؤ اور کوئی ہڈی نہ توڑو"۔

میمونی کہتے ہیں کہ ہم نے آپس میں مباحثہ کیا کہ کتنے دن کے بعد بچہ کا نام رکھا جائے تو اس پر ابو عبداللہ نے کہا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تیسرے دن نام رکھا جائے لیکن حضرت سمرہ کا قول ہے کہ ساتویں دن نام رکھنا چاہیے۔

فصل (۳۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اور کنیت کے متعلق سنت طیبہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے ذلیل اس آدمی کا نام ہے جو اپنا نام ملک الاملاک رکھتا ہے حالانکہ اللہ کے سوا کوئی بادشاہ نہیں"۔

نیز آپ کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں اور سب سے سچے حارث اور ہمام اور سب سے برے نام حرب و مرہ ہیں"۔

آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "اپنے لڑکے کا نام یسار' رباح' نجیح' افلح نہ رکھو" کیونکہ تم ضرورت کے وقت دریافت کرو گے۔ کیا وہ ہے' اگر نہ ہوا تو جواب ہو گا۔ نہیں"۔

یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے عاصیہ نام بدل کر جمیلہ رکھا' حضرت جویریہ کا پہلے نام برہ تھا' اس کو بدل کر آپ نے جویریہ رکھ دیا' حضرت زینب بنت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نام (برہ) رکھنے سے منع کیا اور فرمایا کہ اپنے آپ کو پاکیزہ مت جتاؤ' اللہ تعالیٰ تم میں سے نیکوں کو خوب جانتا ہے۔

نیز آپ نے ابوالحکم کو بدل کر ابو شریح رکھ دیا اور اصرم کو بدل کر زرعہ کر دیا اور سعد ابن المسیب کے دادا کا نام حزن سے بدل کر سہل رکھ دیا' تو انہوں نے انکار کیا' اور کہا کہ سہل کو پیروں سے روندا جاتا ہے اور ذلیل کیا جاتا ہے تو آپ نے فرمایا نہیں' اس سے خدمت لی جاتی ہے۔

ابوداؤد کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عاص' عزیز' عتلہ' شیطان' حکم' غراب' حباب' شہاب وغیرہ کے نام بدل دیئے اور شہاب کی جگہ ہشام' حرب کی جگہ سلمہ اور مضطجع کی جگہ منبعث نام رکھ دیئے اور زمین غفرہ کی جگہ خضرہ کہا' شعب ضلالت کو شعب ہدایت رکھ دیا' اور بنو مغویہ کو بنو رشدہ کا نام رکھا۔

اسماء چونکہ معانی کے قالب ہوتے ہیں اور اس کی علامت ہوتے ہیں لہٰذا حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ

ان دونوں کے درمیان ربط اور مناسبت ہو' ایسا نہ ہو کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے یکسر بے ربط اور اجنبی ہوں کیونکہ یہ چیز عقل و حکمت کے منافی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نام کا مسمی کی شخصیت پر ایک مخصوص اثر ہوتا ہے اور انسان اپنے ناموں کے حسن و قبح' ذلت و عزت' لطافت و کثافت سے ضرور متاثر ہوتا ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

قَلَّ أَنْ بَصرَتْ عَيْنَاكَ ذَا لَقَبٍ إِلَّا وَمَعْنَاهُ إِنْ فَكَّرْتَ فِي لَقَبِهِ

بہت کم ایسا ہوگا کہ تمہاری نظر کسی لقب والے پر پڑے اور اس کا معنیٰ اس کے لقب میں نہ ہو بشرطیکہ تم غور کرو۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اچھے نام پسند کرتے تھے اور اس کا حکم دیا کہ جب کوئی قاصد آپ کے پاس بھیجا جائے تو وہ اچھی شکل اور اچھے نام والا ہو' آپ نیند اور بیداری دونوں میں ناموں سے معانی کو اخذ کرتے تھے جیسا کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اور صحابہ کرام عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں اور ان کے پاس ابن طاب کی تر کھجوریں حاضر کی گئیں تو آپ نے اس کی یہ تاویل فرمائی کہ دنیا میں سرخ روئی اور آخرت میں کامیابی مسلمانوں کے لئے ہے اور جو دین ان کے لئے پسند فرمالیا ہے' وہ بار آور اور خوشگوار ہو چکا ہے۔

حدیبیہ کے دن سہیل بن عمرو کے آنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام میں سہولت و آسانی ہونے کی تاویل فرمائی۔ ایک دن آپ نے کچھ لوگوں سے بکری دوہنے کے لئے کہا' چنانچہ ایک شخص کھڑا ہوا تو آپ نے دریافت کیا' تمہارا نام کیا ہے' اس نے عرض کیا مرہ (تلخ)' آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ' دوسرا شخص کھڑا ہوا' آپ نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ حرب' آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ' پھر ایک اور شخص اٹھا تو آپ نے نام پوچھا' اس نے عرض کیا یعیش (یعنی زندہ رہے)' آپ نے دودھ دوہنے کا حکم دیا' اسی طرح آپ برے ناموں والی جگہوں اور وہاں سے گذرنے کو بھی ناپسند فرماتے تھے۔

ایک دفعہ دو پہاڑوں کے درمیان گذر رہے تھے' ان کا نام دریافت فرمایا تو لوگوں نے بتایا "فاضح و مخزی" (ذلیل اور رسوا کرنے والا)' تو یہ سن کر آپ نے راستہ بدل دیا۔

چونکہ اسم اور مسمی کے مابین وہی ربط و مناسبت ہوتی ہے جو روح و جسم اور قالب و حقیقت کے درمیان ہوتا ہے' اس لئے عقل سلیم نام سن کر مسمی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جیسا کہ ایاس ابن معاویہ وغیرہ کے بارے میں مشہور ہے کہ کسی شخص کو دیکھ کر فرماتے تھے کہ اس کا نام فلاں فلاں ہوگا اور یہ بات

غلط نہ ہوتی تھی۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے نام دریافت فرمایا' اس نے عرض کیا' جمرہ (چنگاری) پوچھا باپ کا کیا نام ہے کہنے لگا' شہاب (شعلہ) پھر آپ نے پوچھا تمہاری منزل کہاں ہے' کہنے لگا "حرۃ النار" (آگ کی گرمی) مزید حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تمہاری رہائش کہا ہے' جواب دیا "ذات لظی" (شعلہ والی جگہ میں) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سب سن کر فرمایا کہ اچھا جاؤ تب تو تمہارا گھر جل ہی گیا ہے' راوی کہتے ہیں کہ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو واقعی اس کا گھر جل چکا تھا۔

جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل کا نام سن کر معاملہ کی سہولت کو سمجھا' آپ نے اپنی امت کو اچھے نام رکھنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا کہ انہیں قیامت کے دن ان ہی ناموں سے پکارا جائیگا۔

آپ غور کریں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ناموں احمد و محمد سے ان کے اوصاف کا کس انداز سے اشتقاق ہوا' محمد کے لفظ میں صفات حمیدہ کی کثرت اور احمد میں دوسروں کی صفات سے افضلیت مقصود ہے۔

اسی طرح آپ نے ابوالحکم کو ابوجہل کی کنیت دی اور اللہ تعالیٰ نے عبدالعزیٰ کو ابولہب سے مخاطب کیا' کیونکہ اس کا ٹھکانہ آگ کے شعلے تھے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو اس کا نام یثرب تھا' آپ نے اس کا نام طیبہ رکھ دیا اور اس سے تثریب (تخریب) کے معنی ختم ہوگئے۔

چونکہ اچھا نام اپنے مسمی کا مقتضی ہوتا ہے اس لئے آپ نے بعض عربوں سے فرمایا' اے بنی عبداللہ' اللہ تعالیٰ نے تمہارا اور تمہارے باپ کا نام اچھا رکھا' اس طرح آپ نے انہیں اللہ کی بندگی کی طرف بلایا۔

بدر کے موقع پر ان چھ ناموں پر غور کرو جن سے موسوم لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ پر نکلے تھے' ایک کا نام ولید تھا جس کا معنی ہے بچہ' اس سے ابتدائی کمزوری کا پتہ چلتا ہے' دوسرے کا نام تھا شیبہ یعنی بڑھاپا' اس سے اخیر کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے' تیسرے کا نام تھا عتبہ جو عتب بمعنی غصہ سے ماخوذ ہے' یعنی اس نام سے موسوم شخص مورد عتاب ہوگا' اب مقابل کے ناموں پر غور کرو یعنی علی' ابوعبیدہ اور حارث' علی سے بلندی' ابوعبیدہ سے بندگی اور حارث سے آخرت کے لئے کوشش ثابت ہوتی ہے۔

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھے نام وہی ہیں جن کے معنی اچھے ہوں' چونکہ عبودیت اللہ کی

نظر میں زیادہ محبوب ہے اس لئے اس کے ناموں میں سے اللہ اور رحمٰن کی طرف اس کی اضافت "القادر و القاہر" کی طرف اضافت سے زیادہ محبوب ہے کیونکہ بندے اور رب کے درمیان جو تعلق ہے ' وہ رحمت خالص کا ہے' اس کی رحمت سے بندے کا وجود و کمال ہے اور جس مقصد کے لئے اسے پیدا کیا ہے' وہ یہ ہے کہ بندہ محبت ' خوف اور امید کے ساتھ اللہ کی بندگی کرے۔

چونکہ ہر بندہ ارادہ سے حرکت کرتا ہے اور ارادہ کی ابتداء قصد سے ہوتی ہے' پھر ارادے کے نتیجہ میں محنت اور کمائی ہوتی ہے' اس لئے سب سے سچا نام حارث اور ہمام ہے' اس طرح چونکہ سچی ملکیت اور بادشاہت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے زیبا ہے اس لئے اس کے نزدیک سب سے اچھا نام ملک الملوک ' سلطان السلاطین ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے اندر یہ وصف نہیں' اس لئے اس نام سے کسی کو موسوم کرنا باطل ہوگا' اللہ تعالیٰ باطل کو پسند نہیں کرتا' بعض لوگوں نے قاضی القضاۃ کو بھی اسی حکم میں شمار کیا ہے اور سید الناس کے نام سے بھی کسی کو موسوم کرنا اسی قبیل سے ہے' کیونکہ یہ وصف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے لئے زیبا نہیں۔

چونکہ حرب (لڑائی) اور مرارہ (تلخی) کا مسمی مزاج و طبیعت کو ناگوار ہے اس لئے سب سے قبیح و ناپسند نام حرب اور مرہ سمجھا گیا ہے اور یہی حکم حنظلہ اور حزن وغیرہ ناموں کا بھی ہے۔

جب کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اخلاق سب سے زیادہ اعلیٰ و احسن ہوتے ہیں اور ان کے نام بھی اچھے و بہترین ہوتے ہیں' اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو حکم دیا کہ انبیاء کرام کے نام رکھا کریں' جیسا کہ سنن ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ "انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر اپنے نام رکھو"۔

اگر اس میں کوئی دوسرا فائدہ نہ بھی ہو پھر بھی ان کے ناموں کی وجہ سے ان سے تعلق قائم رہتا ہے اور نام کی تکرار سے ان کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے' اس سے ان کے صفات حسنہ و اخلاق حمیدہ سے متصف ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لڑکے کا نام "یسار" وغیرہ رکھنے کی ممانعت ہے تو اس کا سبب دوسرا ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے "یعنی جب اس کے متعلق دریافت کرو گے کہ وہ وہاں ہے تو تم کہو گے نہیں" خدا جانے یہ ٹکڑا حدیث کے الفاظ ہیں یا اس میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

حاصل یہ کہ اس طرح کے نام بدفالی پیدا کر سکتے ہیں' اس لئے محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

نے جو کہ اپنی امت کے غیر معمولی خیر خواہ تھے' بربنائے رحمت و مصلحت یہ چاہا کہ ان اسباب سے محفوظ رکھا جائے جو ناگوار چیز کو سننے یا اس کے وقوع پذیر ہونے کو ضروری بنا دیں' اس کے ساتھ اس کا بھی امکان ہے کہ نام اپنے برعکس معنی کا مسمی بن جائے جیسے یسار ایسے شخص کا نام ہو جائے جو سراسر مشکلات کا باعث ہو یا نجیح (کامیاب) ایسے آدمی کا نام ہو جو کبھی کامیاب نہ ہوتا ہو' یا رباح (منافع) ایسے آدمی کا نام ہو جو ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہو' اس طرح یہ نسبت ان کی طرف غلط ہو گی اور اللہ تعالیٰ کی طرف بھی غلط انتساب ہو گا۔

مزید یہ کہ ایسے شخص سے لوگ نام کی طرح حسن سلوک کی توقع رکھیں گے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو پھر وہ برا بھلا کہیں گے' جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے :

سَمَّوكَ مِنْ جَهْلِهِمْ سَدِيْداً وَاللهِ مَا فِيْكَ مِنْ سَدَادِ

لوگوں نے جہالت سے تمہارا نام درست رکھ دیا ہے' حالانکہ بخدا تمہارے اندر کوئی درستگی نہیں۔

یہی صورت اس وقت ہوتی ہے جب کسی کی ایسی تعریف کی جائے جو درحقیقت اس کے لئے مذمت اور لوگوں کی نظر میں بے وقعتی کا سبب بن جائے' مثلاً اگر تعریف میں ایسی باتیں ممدوح کی طرف منسوب کی جائیں جو اس میں موجود نہیں تو سننے والے انہی صفات کا اس سے مطالبہ کریں گے اور اس کو ان صفات کا حامل مانیں گے لیکن جب تجربہ کے بعد وہ اوصاف نہیں ملیں گے تو ممدوح کی وقعت ان کے دلوں سے نکل جائے گی اور خود مدح مذمت کی شکل اختیار کرے گی' اگر ایسے شخص کو بغیر تعریف کے چھوڑ دیا جائے تو مذکورہ خرابی لازم نہیں آئے گی۔

اس میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ ایسی تعریف سن کر انسان کو اپنی پاکی اور برتری کا احساس ہو جاتا ہے' اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برہ' رشید' مطیع' طائع وغیرہ جیسے نام رکھنے سے منع فرمایا ہے' اور کفار کا اس طرح کا نام ہرگز نہ رکھنا چاہیے اور نہ ان جیسے ناموں سے انہیں پکارنا چاہیے۔

کنیت رکھنا دراصل ایک طرح سے تعظیم و تکریم کی چیز ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صہیب کو ابو یحیی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابو تراب کی کنیت مرحمت فرمائی اور حضرت انس ابن مالک کے بھائی جبکہ ابھی چھوٹے ہی تھے' انہیں ابو عمیر کی کنیت عطا کی۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت طیبہ یہ تھی کہ آپ صاحب اولاد اور بے اولاد سب کو کنیت

عطا کرتے تھے اور ابوالقاسم کے علاوہ آپ سے ثابت نہیں کہ آپ نے کسی کنیت سے منع فرمایا ہو۔

لیکن اس سلسلہ میں علماء میں اختلاف ہے' بعض لوگوں کا قول ہے کہ کسی کی یہ کنیت رکھنا جائز نہیں' بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ یہ کنیت جائز نہیں' اس کی تائید میں ایک حدیث وارد ہے جسے امام ترمذی نے صحیح کہا ہے' تیسرا قول یہ ہے کہ دونوں میں جمع کرنا جائز ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں مذکور ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد میرے گھر میں کوئی لڑکا پیدا ہوا تو میں آپ کا نام اور آپ کی کنیت رکھوں گا آپ نے فرمایا' ٹھیک ہے' امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح بتایا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ آپ کی حیات طیبہ میں آپ کی کنیت رکھنا ممنوع ہے اور وفات کے بعد جائز ہے۔

صحیح مسلک یہ ہے کہ آپ کا نام رکھنا جائز ہے اور آپ کی کنیت اختیار کرنا ممنوع ہے' اور آپ کی زندگی میں آپ کی کنیت اختیار کرنے کی ممانعت زیادہ شدید تھی اور اسی طرح نام و کنیت دونوں اختیار کرنے کی ممانعت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذکور حدیث کی صحت میں علماء نے کلام کیا ہے اور امام ترمذی کی ان حدیثوں میں سے ہے جن کی تصحیح میں تساہلی برتا گیا ہے۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رخصت دی تھی' جس کا معنی یہ ہے کہ دوسروں کے حق میں ممانعت بدستور باقی ہے۔ رہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کہ "کس چیز نے میرا نام حلال اور کنیت حرام کی ہے" تو یہ حدیث غیر معیاری ہے' اس سے حدیث صحیح کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

نیز سلف کی ایک جماعت نے "ابو عیسیٰ" کنیت رکھنے کو مکروہ بتایا ہے اور دوسروں نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ ابوداؤد نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک لڑکے کو مارا جو کہ ابو عیسیٰ کنیت رکھتا تھا' جب حضرت مغیرہ ابن شعبہ نے ابو عیسیٰ کنیت اختیار کی تو حضرت عمر نے فرمایا کہ کیا تجھے اتنا کافی نہیں کہ تم ابو عبداللہ کنیت اختیار کر لو تو انہوں نے عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری کنیت رکھی ہے' اس پر حضرت عمر نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے تھے اور ہمیں اپنا انجام معلوم نہیں' پھر وفات تک ہمیشہ ابو عبداللہ ہی کی کنیت سے یاد کئے جاتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انگور کو "کرم" کہنے سے منع کیا اور فرمایا کہ کرم تو مومن کا دل ہوتا ہے چونکہ لفظ کرم کثرت خیر و برکت پر دلالت کرتا ہے' لہٰذا ایسے امور خیر کا زیادہ مستحق مومن کا قلب ہی ہو سکتا ہے نہ کہ انگور کا درخت۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا "دیہاتیوں کے نام تمہاری نمازوں پر غالب نہ آ جائیں' دیکھو اس کا نام عشاء ہے لیکن وہ لوگ عتمہ کہتے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا "اگر انہیں معلوم ہوتا کہ عتمہ (عشاء) اور صبح کی نماز میں کس قدر اجر و ثواب ہے تو گھسیٹتے ہوئے حاضر ہوتے"۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ عتمہ کا لفظ مطلقاً استعمال کرنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ عشاء کا نام چھوڑ کر اسے اختیار کرنے سے منع فرمایا اور ایسا اس نام کی محافظت کے خیال سے کیا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس نماز کو اسی نام سے موسوم کیا ہے' لہٰذا اسے نہ چھوڑا جائے اور اس پر دوسرے اسماء غالب نہ کر دیئے جائیں' جس طرح متاخرین نے جدید اصطلاحات و الفاظ کو قدیم الفاظ پر چسپاں کر دیئے ہیں' جس کی وجہ سے اس قدر جہالت اور فساد و انتشار پیدا ہوا کہ جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

اسی طرح ان چیزوں کے مقدم کرنے پر آپ کی محافظت کا معاملہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مقدم کیا ہے' مثلاً بقر عید میں آپ نے پہلے نماز پڑھی پھر قربانی کی' اعضاء وضو کو دھونے میں پہلے چہرہ پھر دونوں ہاتھ' پھر سر کا مسح کیا' پھر دونوں پیر' اسی طرح صدقہ فطر نماز سے پہلے ادا کیا کیونکہ آیت میں پہلے صدقہ ہی کا ذکر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ ○ وَذَكَرَ ٱسْمَ رَبِّهِۦ فَصَلَّىٰ ﴾ [الأعلی : ١٤، ١٥]

کامیاب ہوا وہ جس نے پاکی حاصل کی اور اپنے رب کو یاد کیا پھر نماز پڑھی۔

فصل (۳۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز بیان اور گفتگو کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو اور تقریر کے لئے بہترین اور لطیف ترین الفاظ استعمال کرتے تھے' فحش گوئی اور ترش روئی اختیار نہیں کرتے تھے' سخت مزاج اور تند مزاج لوگوں کے انداز بیان سے بعید تھے' گفتگو کے دوران چیختے اور چلاتے نہیں تھے۔

کسی اچھے لفظ کو نااہل شخص کے لئے اور کسی ناپسندیدہ لفظ کو اچھے شخص کے لئے استعمال نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ منافق کے لئے سید اور انگور کے لئے کرم اور ابوجہل کے لئے ابوالحکم کہنے سے منع فرمایا' اسی طرح آپ نے ایک صحابی ابوالحکم کا نام بدل کر ابو شریح رکھ دیا اور فرمایا کہ "حکم تو اللہ تعالیٰ ہے اور اسی سے سارے فیصلے ہیں"۔

اس طرح آپ نے اس سے منع کیا کہ غلام اپنے آقا کو ربی کہہ کر پکارے اور آقا اسے اپنا بندہ کہے' کسی نے آپ کے سامنے طبیب ہونے کا دعویٰ کیا تو آپ نے فرمایا کہ "تم تو رفیق ہو' طبیب تو پیدا کرنے والی ذات ہے"۔

جاہل لوگ بعض فطری و قدرتی چیزوں کے جاننے والے کافروں کو حکیم کہتے ہیں حالانکہ حکیم صرف اللہ جل شانہ کی ذات پاک ہے جبکہ کافر کائنات کی سب سے زیادہ احمق مخلوق ہے۔

اسی طرح آپ نے ایک خطیب سے جس نے کہا تھا کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ گمراہ ہے تو آپ نے فرمایا کہ "تم بدترین خطیب ہو" اسی طرح آپ نے فرمایا کہ "یہ مت کہو کہ جس طرح اللہ چاہے اور فلاں بھی چاہے"۔

اسی قبیل سے ان حضرات کا قول ہے کہ جو شرک سے پرہیز نہیں کرتے اور کہتے ہیں أَنَا بِاللهِ وَبِكَ میں اللہ سے اور تم سے ہوں' أَنَا فِي حَسْبِ اللهِ وَحَسْبِكَ میں تمہاری اور اللہ کی کفایت ہوں' میرے لئے اللہ اور تمہارے سوا کوئی نہیں' یہ لوگ مزید کہتے ہیں کہ مجھے اللہ پر اور تم پر بھروسہ ہے' یہ

اللہ کی اور تمہاری طرف سے ہے' تمہاری اور اللہ کی قسم' اس طرح کے جملوں میں چونکہ کہنے والا اللہ کا ساجھی بنا دیتا ہے اس لئے ان کی ممانعت اور قباحت مَاشَآءَ اللهُ وَشِئْتَ والے جملے سے بڑھ جاتی ہے۔

البتہ اگر کوئی یوں کہے "میں اللہ سے ہوں اور پھر تم میں سے ہوں" یا "جو اللہ چاہے اور پھر تم چاہو" تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہوگی' جیسا کہ تین اشخاص کے واقعہ والی حدیث میں یہ جملہ وارد ہے "میرے لئے آج اللہ کے پھر تمہارے علاوہ کوئی سہارا نہیں"۔

رہا مذمت والے الفاظ کا ان لوگوں کے حق میں استعمال کرنا جو ان کے اہل نہیں تو اس کی مثالیں درج ذیل ہیں۔ کوئی شخص زمانہ کو گالی نہ دے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ کو گالی دینے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "اللہ ہی زمانہ ہے" ایسا کرنے میں تین خرابیاں ہیں :

اول یہ کہ غیر مستحق کو گالی دی' دوم یہ کہ اس کا گالی دینا شرک کو متضمن ہے کیونکہ اس نے فائدہ رساں اور ضرر رساں سمجھ کر گالی دی ہے اور یہ کہ زمانہ ظالم ہے' جیسا کہ بہت سے شاعروں نے اشعار میں زمانہ کو برا بھلا کہا ہے اور بہت سے جاہل تو اعلانیہ طور پر زمانہ کو لعنت و ملامت کرتے ہیں' سوم یہ کہ بدکلامی اور گالی ان کاموں کے کرنے والوں پر واقع ہوتی ہے جن سے انسان ناراض ہوتا ہے حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرے تو زمین و آسمان میں فساد پیدا ہو جائے' اور حالات جب ان کے مساعد و موافق ہو جاتے ہیں تو یہی لوگ زمانہ کی تعریف شروع کر دیتے ہیں۔

اسی قبیل سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ شیطان ہلاک ہو کیونکہ یہ سن کر شیطان پھولے نہیں سماتا اور تکبر میں کہنے لگتا ہے کہ میں نے اپنی طاقت سے بندہ کو زیر کر لیا ہے بلکہ یوں کہا کرو "بسم اللہ" اس سے وہ مکھی کی طرح چھوٹا اور حقیر ہو جاتا ہے"۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "بندہ جب شیطان پر لعنت کرتا ہے تو وہ کہتا ہے تو ایک ملعون پر لعنت کر رہا ہے" نیز اللہ تعالیٰ شیطان کو رسوا کرے اللہ شیطان کا منہ کالا کرے وغیرہ جیسے کلمات بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں' ان سب سے وہ خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ بنی آدم کو معلوم ہو گیا کہ میں نے اسے اپنی قوت سے نقصان پہنچایا ہے' اور یہ جملے اسے اور زیادہ سرکش بنا دیتے ہیں اور ذرا بھی فائدہ بخش نہیں ہوتے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس پر شیطان کا اثر ہو وہ اللہ کا ذکر کرے اور اسی کا نام لے اور شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہے' یہ چیز اس کے لئے فائدہ مند ہے اور شیطان کے

غصہ کو مزید بھڑکانے والی ہے۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو یہ بھی کہنے سے منع فرمایا کہ "میرا نفس خبیث ہو گیا" آپ نے فرمایا کہ "میرا نفس سخت ہو گیا" کہنا چاہیے' دونوں جملوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی طبیعت و عادت میں خرابی پیدا ہونا' لیکن خبیث کا لفظ برا اور بھدا ہے اس لئے اس کے استعمال کو ناپسند فرمایا۔

کسی معاملہ یا موقع کے ہاتھ سے نکل جانے پر "کاش کہ میں یوں کرتا اور یوں نہ کرتا" کہنے سے بھی آپ نے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس سے شیطان کا کام آسان ہوتا ہے' اس کی جگہ اس سے زیادہ نفع بخش کلمہ کی تعلیم دی "یہ اللہ کا فیصلہ تھا اور اللہ نے جو چاہا کیا"۔

انسان کا یہ کہنا کہ اگر میں نے ایسا ایسا کیا ہوتا تو فلاں موقع نہ کھوتا' یا جس مشکل میں پھنس گیا ہوں نہ پھنستا' یہ ایسی باتیں ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں' کیونکہ جو چیز گذر چکی ہے پھر دوبارہ نہیں لوٹ سکتی' اور اگر مگر سے لغزش کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

انسان کے اندر یہ بات چھپی ہوتی ہے کہ اگر اس کے مرضی و منشأ کے مطابق کام ہو جاتا تو قضاء الٰہی کے خلاف ہوتا حالانکہ نوشتہ تقدیر کے خلاف کسی کام کا ہونا ناممکن ہے اور اس کی یہ سوچ انتہائی جھوٹی' نادانی اور ناممکنات پر مبنی ہے' اور اگر اس سے تقدیر کی تکذیب نہ بھی لازم آئے تو کم از کم اگر مگر سے اس کی مخالفت کا ارتکاب ضرور لازم آئے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس طرح کے کلام میں جن اسباب کی تمنا کرتا ہے وہ بھی تو نوشتہ تقدیر ہی میں داخل ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ صحیح ہے' لیکن اس کا فائدہ ناپسندیدہ مقدر کے واقع ہونے سے پہلے ہو سکتا ہے' اگر وہ واقع ہو جائے تو اسے روکنا یا ہلکا کرنا ممکن نہیں' بلکہ بندے کا کام یہ ہونا چاہیے کہ اس فعل کا سامنا کرے جس سے اس واقع چیز کو دور کر سکتا ہو یا اس کے اثر کو کم کر سکتا ہو' جس صورت کے واقع ہونے کا امکان نہیں' اس کی تمنا سے کوئی فائدہ نہیں' ایسا کرنا محض عاجزی ہے' اور اللہ تعالیٰ عاجزی پر عتاب کرتا ہے اور ہوشمندی کو پسند کرتا ہے' اس کی صورت یہ ہے کہ انسان اسباب کو استعمال کرے' انہی سے خیر کا دروازہ کھلتا ہے اور عاجزی شیطان کو دخل اندازی کا موقع دیتی ہے گویا یہ بندہ فائدہ مند اعمال سے عاجز آگیا اور باطل امیدوں کے انتظار میں بیٹھ گیا ہے' اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے پناہ مانگی ہے کیوں کہ ان دونوں میں برائی کی جڑ ہے اور انہی سے غم و رنج' بخل' قرض' بزدلی' مغلوبیت جیسے حالات و صفات پیدا ہوتے ہیں' چنانچہ ان سب چیزوں کا مصدر عاجزی اور

کسل مندی ہے اور کلمہ "اگر مگر" اس کی علامت ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلمہ "اگر" شیطان کی کنجی ہے ایسی تمنائیں کرنے والا شخص سب سے زیادہ لاچار اور مفلس ہوتا ہے اور ہر گناہ کی جڑ عاجزی ہی ہے' کیونکہ بندہ جب طاعات کے اسباب اور گناہوں سے بچنے کے اسباب سے عاجز ہو جاتا ہے جو اسے گناہوں سے روکیں' تو بہرحال وہ گناہوں میں ڈوب جاتا ہے۔

ایک حدیث کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شر کی اصل اس کی شاخوں' اس کی ابتداء و انتہاء اور اس کے منبع و مصدر کا احاطہ کرکے' جو کہ آٹھ خصلتوں پر مشتمل ہے' سے پناہ مانگی ہے' جن میں ہر دو خصلتیں ایک ساتھ ہوتی ہیں اور وہ اس طرح وارد ہوئی ہیں أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ میں تیری پناہ چاہتا ہوں رنج و غم سے۔

یہ دونوں وصف ایک ساتھ ہوتے ہیں کیونکہ دل پر جو ناپسندیدگی طاری ہوتی ہے' اس کا سبب یا تو کوئی گزشتہ امر ہوتا ہے جس سے حزن پیدا ہوتا ہے' یا مستقبل میں متوقع امر جس سے ھم یعنی رنج پیدا ہوتا ہے' اور یہ دونوں چیزیں عاجزی کی دلیل ہیں۔

جو چیز گذر چکی ہے وہ غم سے دور نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی تلافی' رضا .نقضاء حمد باری' صبر جمیل اور ایمان بالقدر سے ہو سکتی ہے اور یہ کہکر کہ "یہ اللہ کا فیصلہ ہے' اللہ نے جو چاہا کیا"۔

اسی طرح جو چیزیں مستقبل میں ہونے والی ہیں' انہیں الجھن اور رنج و غم کے ذریعے دور نہیں کیا جا سکتا' اگر اس کو روکنے کی تدبیر ہو تو پھر عاجز نہیں بنا چاہیے اور اگر تدبیر نہ ہو تو گریہ و زاری اور پریشانی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے بلکہ توحید' توکل اور رضائے الٰہی کے سہارے برداشت کرنا چاہیے۔

رنج و غم سے انسان کا عزم کمزور ہوتا ہے' دل میں سستی پیدا ہوتی ہے' یہ دونوں اوصاف بندے کو منفعت بخش کام سے روک دیتے ہیں' ان کی حیثیت انسان کی پشت پر بھاری بوجھ کی سی ہے۔

خدائے عزیز و حکیم کی یہ حکمت ہے کہ اس نے ان چیزوں کو اپنی ذات سے اعراض کرنے والے دلوں پر مسلط کیا تاکہ بہت سی نافرمانیوں سے اسے روک سکیں' ایسے دلوں کی اس قید کا سلسلہ توحید کی فضا میں پہنچنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے تک جاری رہتا ہے' اس قید سے دل کے چھٹکارے کا صرف یہی ذریعہ ہے' اللہ تعالیٰ کے بغیر یہ مقصود حاصل نہیں ہو سکتا' اس تک پہنچنے کے لئے اس کی قدرت کا سہارا لینا ضروری ہے' اس کے علاوہ اور کوئی اس سلسلہ میں رہنمائی نہیں کر سکتا۔

بندے کو اللہ تعالیٰ جس مقام میں رکھتا ہے تو حمد اور اس کی حکمت کے سبب بندے کو اس میں مقیم رکھتا ہے بندے کا کوئی حق اللہ تعالیٰ اس سے روکتا نہیں اور جو روکتا ہے تو اس لئے روکتا ہے کہ بندہ اس کی محبوب چیزوں کو اس کی طرف وسیلہ بنا کر پہنچے' پھر اللہ تعالیٰ اسے دے' اسے اپنی طرف لوٹانے کے لئے روکتا ہے' عزت دینے کے لئے اپنے سامنے ذلیل کراتا ہے' اپنا محتاج بنا کر غنی بناتا ہے' اپنے سامنے انکسار کے ذریعہ اسے قوی بناتا ہے' ہر طرف سے معزول کر کے بہترین ولایت دیتا ہے' اپنی قدرت میں حکمت اور عزت و غلبہ میں رحمت کا مشاہدہ کراتا ہے' اس کا روکنا عطیہ کا پیش خیمہ ہے' اس کی سزا تادیب ہے دشمنوں کو مسلط کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانے والے کی طرح ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے انعامات کے محل کو خوب جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کہاں پر اپنے رسول بھیجے' ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ :

﴿ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوٓا۟ أَهَٰٓؤُلَآءِ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَيْهِم مِّنۢ بَيْنِنَآ ۗ أَلَيْسَ ٱللَّهُ بِأَعْلَمَ بِٱلشَّٰكِرِينَ ﴾ [الأنعام : ٥٣]

اس طرح ہم نے آزمایا بعض کو بعض کے ذریعہ تاکہ وہ یہ کہیں' کیا یہی لوگ ہیں جن پر ہمارے بیچ اللہ نے احسان کیا ہے' کیا اللہ شکر گذاروں کو جانتا نہیں۔

اللہ تعالیٰ تخصیص کے مقام کو خوب جانتا ہے' نہ دینے سے اگر کوئی شخص اللہ کا محتاج بن جائے تو یہ محرومی اس کے حق میں عطیہ ہے اور اگر کوئی شخص عطیہ کے سبب اس سے اعراض کرے تو یہ محرومی ہے' اللہ تعالیٰ ہم سے استقامت کا طالب ہے اور یہ کہ ہم اس کا راستہ اپنائیں اور اس نے ہم کو یہ بتایا ہے کہ یہ مقصد بغیر اس کی مشیت و مدد کے حاصل نہیں ہو سکتا' ارشاد باری ہے کہ :

﴿ وَمَا تَشَآءُونَ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ رَبُّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴾ [التکویر : ٢٩]

تمہارا چاہنا اللہ رب العزت کے چاہنے کے بغیر نہیں ہے۔

پس اگر بندے کے ساتھ ایک دوسری روح ہو جس کا اس کی روح سے وہی تعلق ہو جو اس روح کا اس کے بدن سے ہے اور روح کے ذریعہ ارادہ الٰہی بندے سے چاہے کہ وہ کوئی فعل انجام دے تو بھی بندہ انجام نہیں دے سکتا' ورنہ اس کا محل عطیہ کے قابل نہیں' اور اس کے ساتھ ایسا کوئی پیمانہ نہیں جس میں عطیہ رکھا جائے اور جو بھی بغیر پیمانہ کے آئے گا' محروم لوٹے گا' پس اسے صرف خود کو ملامت کرنا چاہیے قصہ کوتاہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رنج و غم سے پناہ مانگی ہے اور یہ دونوں ایک

دوسرے کے ساتھی ہیں' اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاجزی اور کسل مندی سے پناہ مانگی ہے' اور یہ دونوں بھی باہم دیگرے ساتھی ہیں' کیونکہ بندے کی کامیابی اور اس کے عروج و کمال کا حاصل نہ ہونا یا تو عدم قدرت و استطاعت سے ہوتا ہے اور اسی کو عاجزی کہتے ہیں' اور یا قدرت و استطاعت تو ہوگی لیکن بندے کے اندر اس کے حصول کی طلب و تڑپ نہ ہوگی' اسی کو کسل مندی اور سستی کہتے ہیں۔

ان دونوں اوصاف سے ہر طرح کی بھلائی ضائع ہو جاتی ہے اور برائی پیدا ہوتی ہے' اس برائی کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے بدن سے نفع اندوز نہیں ہوتا' جسے بزدلی کہتے ہیں اور اسی طرح اپنے مال سے نفع اندوز نہیں ہوتا جسے بخل کہتے ہیں' چنانچہ اس کی وجہ سے دو طرح کی مغلوبیت مسلط ہو جاتی ہے' ایک کسی کے حق کا غلبہ جسے غلبہ دین کہتے ہیں' دوسرے باطل کے باعث غلبہ یعنی انسانوں کا غلبہ' اور یہ تمام مفاسد عاجزی اور کسل اور سستی کا نتیجہ ہیں۔

یہی مفہوم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صحیح حدیث کا ہے جس میں آپ نے اس شخص کے لئے جس کے خلاف فیصلہ ہوا تو یہ کہا «حَسْبِيَ اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ» آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ عاجزی پر سرزنش کرتا ہے اور تمہیں عقل و شعور سے کام لینا چاہیے' پھر بھی اگر کوئی امر تم پر غالب آ جائے تو «حَسْبِيَ اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ» کہو' اس شخص نے تھک ہار کر یہ کلمہ پڑھا تھا اور ذرا بھی عقل و شعور سے کام نہیں لیا تھا' اگر عقل مندی سے کام لیتا تو فیصلہ اس کے موافق ہوتا حالانکہ اگر ان اسباب کو ہوشمندی سے بروئے کار لاتا اور پھر بھی مغلوب ہو جاتا' اس صورت میں یہ جملہ واقعتہ اپنے مقام پر درست ہوتا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام مامور بہ اسباب کو اختیار کیا' کسی کو ترک نہیں کیا اور نہ عجز اختیار کیا' پھر بھی جب دشمن غالب آگئے اور انہیں آگ میں ڈال دیا تو انہوں نے اس حالت میں «حَسْبِيَ اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ» کہا' چنانچہ یہ کلمہ جب اپنے مقام پر پڑھا تو فوراً اثر ہوا اور اس کا مقتضیٰ ظاہر ہوا۔

اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے احد کے دن یہ کہا گیا کہ :

﴿إِنَّ ٱلنَّاسَ قَدۡ جَمَعُواْ لَكُمۡ﴾ [آل عمران : ۱۷۳]

لوگوں نے تمہارے لئے جمع کر لیا ہے۔

ان لوگوں نے پوری تیاری کر کے دشمن کے مقابلے کے لئے نکلے' پھر مذکورہ کلمہ کہا اور اس نے اپنا پورا اثر دکھایا' اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّهُۥ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُۥٓ ۚ ﴾ [الطلاق: ۲، ۳]

اور جو اللہ سے ڈرتے رہے ' اللہ اس کے لئے نکلنے کی راہ بنا دے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں اس کا گمان بھی نہ ہو اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو کافی ہے۔

مزید ارشاد ہے :

﴿ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ وَعَلَى ٱللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ ٱلْمُؤْمِنُونَ ﴾ [المائدۃ: ۱۱]

اور اللہ سے ڈرو مومنوں کو چاہیے کہ اللہ پر توکل کریں۔

اسباب دنیا اختیار کئے بغیر توکل کرنا اور اللہ تعالیٰ کو کارساز سمجھنا یہ محض عاجزی ہے' اگرچہ اس پر قدرے توکل چھایا نظر آتا ہے' لیکن یہ توکل عجز ہے لہٰذا بندے کو چاہیے کہ اپنے توکل کو عاجزی اور عاجزی کو توکل نہ بنائے' بلکہ توکل کو بھی اسباب ماموره سمجھ کر اسے اختیار کرے' جس کے بغیر کوئی کام سر انجام نہیں پا سکتا' اس مقام پر دو گروہ غلطی کے شکار ہوئے ہیں۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ حصول مراد کے لئے تنہا توکل ہی کافی اور مستقل سبب ہے' چنانچہ انہوں نے تمام وسائل اور اسباب کو معطل کر دیا' جس کی خود حکمت الٰہی مقتضی ہے اور مسبب تک پہنچنے کا ذریعہ تھے' چنانچہ یہ گروہ ضعیف توکل اور ترک اسباب کے باعث عجز اور تفریط کا شکار ہو گیا۔

دوسرے گروہ نے اسباب پر اعتقاد رکھا اور اس کو اختیار کیا لیکن توکل سے اعراض کیا۔

یہاں مقصود یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی کمال کی جانب بندوں کی رہنمائی کی ہے اور بتایا ہے کہ نفع بخش چیزوں پر دھیان ضروری ہے اور کوشش کرنا بھی لازم ہے' اسی صورت میں حَسْبِيَ اللهُ پڑھنے کا فائدہ ہو گا لیکن کوشش میں کوتاہی کے بعد حَسْبِيَ اللهُ کہنے پر اللہ تعالیٰ بندہ سے ناخوش ہوتا ہے اور اس کے لئے کفایت کا انتظام نہیں فرماتا' وہ تو صرف ان لوگوں کے لئے کافی اور کارساز ہے جو اس سے ڈریں پھر اس پر توکل کریں۔

فصل (۳۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنے کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے زیادہ کرتے تھے بلکہ آپ کا ہر کلام اللہ کے ذکر اور اس کی فکر میں ہوتا تھا' آپ کا امت کو حکم کرنا' روکنا اور اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات اور اس کے احکام اور وعد و وعید کی تعلیمات سب کی سب ذکر الٰہی کے قبیل سے ہیں' اسی طرح اس کی بے حساب نعمتوں پر حمد و ثناء اور تسبیح و تمجید بھی ذکر اللہ تھا' اللہ تعالیٰ سے سوال و دعا اور خوف و خشیت بھی ذکر ہی تھا بلکہ آپ کی خاموشی تک بھی قلبی طور پر ذکر الٰہی کی متضمن تھی' جس طرح ذکر اللہ سے رطب اللسان تھے' اسی طرح قلب و جگر بھی اس سے سرشار تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ آپ ہر آن' ہر حالت میں ذاکر و شاغل رہتے تھے اور ذکر اللہ آپ کی سانس کے ساتھ جاری و ساری رہتا' اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے' سوار ہوتے' اترتے' سفر و حضر ہر وقت اور ہر حال میں آپ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے اور اس کے ذکر و فکر میں رہتے تھے۔

جب آپ نیند سے بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے :

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ»

تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم کو مارنے کے بعد زندہ کیا اور اس کے پاس اٹھ کر جانا ہے۔

پھر اس کے بعد علامہ ابن قیم نے وہ حدیثیں ذکر کی ہیں' جن میں مندرجہ ذیل مواقع کی دعائیں مذکور ہیں' جب نیند سے بیدار ہو' جب نماز شروع کرے' جب گھر سے نکلے' جب مسجد میں داخل ہو' صبح و شام کی دعا اور جب کپڑے تبدیل کرے' جب گھر میں داخل ہو' جب بیت الخلاء میں داخل ہو' وضوء کی دعاء' اذان کی دعا' رویت ہلال کی دعاء' کھانے کی دعاء' اور چھینکنے کی دعا۔

فصل (۳۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر میں داخل ہونے کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اچانک گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ آگاہی کے بعد اندر جاتے تھے اور داخل ہونے کے وقت سلام کرتے تھے اور مسواک فرماتے تھے' احوال دریافت فرماتے اور پوچھتے کیا کچھ ہے۔ کبھی پوچھتے' دوپہر کا کھانا ہے اور کبھی خاموش رہتے حتی کہ ماحضر پیش کر دیا جاتا۔

آپ سے ثابت ہے کہ ایک شخص نے پیشاب کرنے کی حالت میں سلام کیا تو آپ نے جواب نہیں دیا اور پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسی حالت میں بات چیت کرنا پسند نہیں کرتا ہے۔ آپ پیشاب پاخانہ کے وقت قبلہ رخ یا پشت نہیں کرتے تھے۔ ایسا کرنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع بھی فرمایا ہے۔

فصل (۳۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اذان میں سنت طیبہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اذان ترجیع اور بغیر ترجیع ہر طرح سے ثابت ہے۔ اور اقامت ایک ایک مرتبہ اور دو دو مرتبہ مشروع کیا ہے لیکن «قَدْقَامَتِ الصَّلاَةُ» کا کلمہ آپ سے دو ہی مرتبہ کہنا ثابت ہے۔ ایک دفعہ کہنا قطعاً ثابت نہیں۔ اس طرح اذان کے شروع میں اللہ اکبر چار بار کہنا ثابت ہے' دو بار نہیں۔

اذان کے وقت اور اس کے بعد پانچ قسم کے اذکار کی آپ نے امت کو تعلیم دی ہے :

۱۔ ایک یہ کہ سننے والا موذن کے کلمات و الفاظ دوہراتا جائے' سوائے «حَيَّ عَلَى الصَّلاَةِ» اور «حَيَّ عَلَى الْفَلاَحِ» کے کہ اس وقت «لاَحَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ» کہنا چاہیے اور نہ دونوں میں جمع اور نہ صرف «حَيَّ عَلَى الصَّلاَةِ وَحَيَّ عَلَى الْفَلاَحِ» پر اکتفا کرنا چاہیے۔

یہی حکمت کا تقاضا ہے' کیونکہ اذان کے کلمات ذکر ہیں اور «حَيَّ عَلَى الصَّلاَةِ وَالْفَلاَحِ» نماز کی دعوت ہے۔ اس لئے سننے والے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مسنون قرار دیا ہے کہ اس دعوت کو سن کر وہ اعانت کے کلمہ سے استعانت چاہیے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ «رَضِيْتُ بِاللهِ رَبًّا وَبِالإِسْلاَمِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا (ﷺ)» کہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے یہ دعا پڑھی اس کے گناہ بخش دیئے گئے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ موذن کی اذان کا جواب دینے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجے اور کامل ترین وہ درود ہے جو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس امت کو سکھلایا ہے۔

۴۔ چوتھے اذان کے بعد یہ دعا پڑھے :

«اللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلاَةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُوْدًا»

اے اللہ مکمل پکار اور ہمیشہ قائم رہنے والی نماز کے پروردگار! تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ اور بزرگی دے اور آپ کو مقام محمود پر پہنچا۔

۵- پانچویں یہ کہ اس کے بعد اپنے لئے دعا کرے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو طلب کرے۔

سنن میں آپ سے مروی ہے کہ اذان اور اقامت کے مابین کی دعا رد نہیں ہوتی۔ صحابہ نے پوچھا کہ ہم اس وقت میں کیا دعا کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کا سوال کرو۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

آپ ذی الحجہ کے عشرہ میں بکثرت دعا کرتے تھے اور تکبیر و تحمید اور تہلیل کی تاکید فرماتے۔

آپ یوم عرفہ کی نماز فجر سے لے کر آخری یوم تشریق کی عصر تک ان الفاظ کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔

«اللهُ أَكْبَرُ، اللهُ أَكْبَرُ، لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ، اللهُ أَكْبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ»

اس حدیث کی اسناد اگرچہ صحیح نہیں لیکن عمل اس پر ہوتا رہا ہے۔ اس میں اللہ اکبر مکرر ہے۔

حضرت جابر اور حضرت ابن عباس کی روایت میں تین مرتبہ اللہ اکبر کہنا صرف ان کا اپنا عمل ہے' اور دونوں صورتیں مستحسن ہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر یوں کہے «اللهُ أَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللهِ بُكْرَةً وَأَصِيْلًا» تو یہ بھی بہتر ہے۔

فصل (۴۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا کھانے کا طریقہ

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھانا شروع کرتے تو "بسم اللہ" کہتے اور لوگوں کو اس کا حکم دیتے۔ اور آپ فرمایا کرتے کہ جب تم میں سے کوئی کھانا کھانے کے وقت بسم اللہ کہنا بھول جائے تو یہ کہے «بِسْمِ اللهِ فِي أَوَّلِهِ وَآخِرِهِ» اور یہ صحیح ہے کہ کھانا کھاتے وقت بسم اللہ کہنا واجب ہے اور جو یہ کہنا چھوڑ دیتا ہے تو اس کے کھانے پینے میں شیطان شریک ہو جاتا ہے۔

بسم اللہ کہنے کے متعلق احادیث صحیح اور صریح وارد ہوئی ہیں۔ نہ اس کے مخالف کوئی حدیث ہے ' نہ اجماع امت۔

اگر اجتماعی کھانے کے وقت ایک آدمی بسم اللہ پڑھ لے تو کیا باقی لوگوں سے یہ وجوب ساقط ہو جائے گا اور شیطان کی شرکت ختم ہو جائے گی۔ تو امام شافعی فرماتے ہیں کہ ایک آدمی کا پڑھ لینا سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص بسم اللہ پڑھے گا صرف اسی کے کھانے سے شیطان کی شرکت ختم ہوگی۔

امام ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو صحیح بتا کر نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چھ آدمیوں کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ اتنے میں ایک اعرابی آیا اور سارا کھانا دو لقمے میں صاف کر دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا "اگر یہ بسم اللہ پڑھ لیتا تو یہ کھانا تم سب کو کافی ہو جاتا"۔

یہ یقینی بات تھی کہ آپ اور صحابہ کرام بسم اللہ پڑھ چکے تھے' اور حضرت حذیفہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک کھانے میں شریک تھے کہ اچانک ایک لڑکی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنے لگی' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر اس کے بعد ایک اعرابی آیا' آپ نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ شیطان اس کھانے کو حلال سمجھ لیتا ہے جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اور وہ اس لڑکی کو اس لئے ساتھ لایا تھا تاکہ اس کے ذریعہ کھانا اپنے

لئے حلال کرے۔ تو جب میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو پھر اسی مقصد کے لئے اعرابی کو لے آیا لیکن میں نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا۔ بخدا اس وقت شیطان کا ہاتھ دونوں ہاتھوں کے ساتھ میرے ہاتھ میں تھا' پھر بسم اللہ پڑھ کر آپ نے کھانا تناول فرمایا"۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سب کا پڑھنا ضروری ہے۔

لیکن اس حدیث کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کھانا شروع نہیں فرمایا تھا اور اس لڑکی نے پہلے شروع کر دیا تھا۔ اس لئے آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

رہا سلام کرنے اور چھینکنے والے کے جواب کا مسئلہ تو محل نظر ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی چھینکے اور الحمد للہ کہے تو ہر سننے والے مسلمان کا فرض ہے کہ اس کا جواب دے"۔

اگر دونوں میں حکم تسلیم کر لیا جائے تو بھی ان کے اور کھانے کے مسئلہ کے مابین فرق ظاہر ہے۔ اس لئے کہ شیطان کو کھانے والے کی مشارکت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ بسم اللہ نہ پڑھے' اور دوسرا جب بسم اللہ پڑھے گا تو صرف اس کے حق میں مشارکت ختم ہو گی' لیکن نہ پڑھنے والے کے حق میں باقی رہے گی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب برتن میں پانی پیتے تو تین سانس میں پیتے اور ہر سانس پر اللہ کی تعریف کرتے اور آخر میں الحمد للہ کہتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے کو برا نہیں کہا' اگر آپ کو ناپسند ہوتا تو چھوڑ دیتے اور خاموش رہتے اور کبھی یہ بھی فرما دیتے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں ہے۔ کبھی کھانے کی تعریف بھی فرماتے تھے۔ جیسے ایک حدیث میں فرمایا "بہترین سالن سرکہ ہے" یہ آپ نے اس شخص سے فرمایا تھا جس نے کہا تھا' ہمارے پاس پیش خدمت کے لئے صرف سرکہ ہی ہے۔ یہ ارشاد اس کی دلجوئی کے لئے تھا' اس سے مقصود سارے کھانوں پر افضلیت نہ تھی۔

جب آپ کی خدمت میں کھانا پیش کیا جاتا اور آپ روزے سے ہوتے تو فرماتے کہ "میرا روزہ ہے" اور ارشاد فرمایا کہ اگر روزے دار کو کھانا پیش کیا جائے تو کھانا پیش کرنے والے کو دعائیں دو اور اگر روزے سے آپ نہ ہوتے تو تناول فرماتے تھے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے پر مدعو کیا جاتا اور کوئی دوسرا بھی آپکے ہمراہ ہو جاتا تو آپ میزبان کو مطلع کرتے اور فرماتے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ اگر تم چاہو تو اسے اجازت دو ورنہ واپس لوٹا

دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھانا کھاتے وقت باتیں بھی کر لیتے تھے' چنانچہ ایک دفعہ آپ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ "بسم اللہ کہو اور اپنے سامنے سے کھاؤ"۔

بسا اوقات مہمانوں کو مزید کھانے کی پیشکش اور اصرار فرماتے' جس طرح کہ مہمان نواز اہل کرم کیا کرتے ہیں۔ جس طرح دودھ پینے کا واقعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا کہ آپ ان سے بار بار پیو اور پیو فرماتے رہے۔

جب آپ کسی کے یہاں کھانا نوش فرماتے تو ان کے لئے دعائیں دیئے بغیر تشریف نہ لے جاتے' جیسا کہ امام ابوداؤد نے آپ سے ابوالہیثم کے واقعہ میں روایت کیا ہے کہ لوگ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "أثیبوا اخاکم" اپنے بھائی کو ثواب پہنچاؤ۔" لوگوں نے عرض کیا' کس طرح ثواب پہنچائیں تو آپ نے فرمایا کہ آدمی جب کسی کے گھر بلایا جائے اور کھانے پینے سے فارغ ہو جائے تو اس کے لئے دعا کرے اور یہی ثواب پہنچاتا ہے"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ ایک دفعہ آپ رات کے وقت گھر میں تشریف لائے اور کھانا تلاش کیا لیکن کچھ نہیں ملا۔ اس وقت آپ نے یہ دعا فرمائی :

«اللَّهُمَّ أَطْعِمْ مَنْ أَطْعَمَنِي وَاسْقِ مَنْ سَقَانِي»

اے اللہ جو مجھے کھلائے' تو اسے کھلا اور جو پلائے تو اسے پلا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے لئے دعا فرماتے تھے جو فقراء و مساکین کو کھانا کھلاتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے ساتھ بھی بیٹھ کر کھانا تناول فرمانے میں اجتناب نہیں فرماتے تھے' چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا' آزاد ہو یا غلام۔

آپ دائیں ہاتھ سے کھانے کا حکم دیتے تھے اور بائیں ہاتھ سے کھانے کو منع فرماتے تھے اور فرمایا کرتے کہ "شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور اسی سے پیتا ہے"۔ اس حدیث سے بائیں ہاتھ سے کھانے کی حرمت ثابت ہوتی ہے اور یہی صحیح ہے۔

کچھ لوگوں نے آپ سے عدم آسودگی کی شکایت کی تو آپ نے ان کو بتایا کہ وہ ساتھ مل کر کھائیں اور الگ الگ نہ کھائیں اور بسم اللہ پڑھ لیا کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ "اپنے کھانے کو اللہ کے ذکر کے ساتھ ہضم کیا کرو اور کھا کر فوراً نہ سویا کرو۔ اس سے تمہارا دل سخت ہو جائے گا"۔ یہ حدیث صحیح معلوم ہوتی ہے۔ تجربہ سے بھی اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

فصل (۴۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام اور اس کے جواب کا طریقہ

صحیحین میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بہترین اسلام یہ ہے کہ تم کھانا کھلاؤ اور جاننے والے اور نہ جاننے والے سب کو سلام کرو"۔ نیز صحیحین میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان سے فرمایا کہ ان فرشتوں کے پاس جاؤ اور انہیں سلام کرو اور سنو کہ وہ تمہیں کس طرح سلام کا جواب دیتے ہیں کیونکہ وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام و جواب ہوگا۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے جا کر السلام علیکم کہا۔ فرشتوں نے جواب میں السلام علیکم و رحمتہ اللہ کہا اور ان کے جواب میں ورحمتہ اللہ کا اضافہ تھا۔

نیز آپ نے سلام کو عام کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب وہ سلام کو عام کریں تو ان کی آپس میں محبت پیدا ہو جائے گی اور لوگ بغیر ایمان کے جنت میں داخل نہ ہوں گے اور ایمان بغیر محبت کے پیدا نہیں ہو سکتا۔

صحیح بخاری میں حضرت عمار کا یہ قول مذکور ہے کہ تین باتیں جس نے جمع کر لیں اس نے ایمان کو حاصل کر لیا۔ اول اپنے آپ سے انصاف کرنا، دوم سلام کرنا، سوم تنگی کے وقت خرچ کرنا۔

ان کلمات میں چھوٹی بڑی تمام بھلائیاں سمٹ گئی ہیں۔ اس لئے کہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ اور بندوں کے تمام حقوق کو ادا کرے اور لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرے جسے اپنے لئے پسند کرے۔ اس میں اپنی ذات کے ساتھ انصاف کی بات بھی داخل ہے۔ اس لئے اپنے بارے میں انسان کو کسی ایسے وصف کا دعوی نہیں کرنا چاہیے جو موجود نہ ہو اور نہ نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے پلید کرنا چاہیے۔

حاصل یہ ہے کہ اس انصاف سے اللہ تعالی کی اور اپنی معرفت حاصل ہوگی۔ بندہ کو نفس کے ذریعہ اس کے خالق سے مزاحمت نہیں کرنی چاہیے۔ اور اپنی مراد کو اللہ تعالیٰ اور نفس کی مراد کے مابین تقسیم

نہیں کرنا چاہیے' کیونکہ یہ ظالمانہ تقسیم ہے۔ ایسی تقسیم مشرکین کرتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے :

﴿ هَٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا ۖ فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴾ [الأنعام: ١٣٦]

یہ ان کے خیال میں اللہ کا ہے اور یہ ہمارے شرکاء کا اور جو شرکاء کا ہے وہ اللہ تک نہیں پہنچتا اور جو اللہ کا ہے وہ شرکاء تک پہنچتا ہے۔ ان کا فیصلہ کس قدر برا ہے۔

بندے کو غور کرنا چاہیے کہ وہ ایسی تقسیم کرنے والوں میں داخل نہ ہو جائے جو اپنی ذات اپنے شرکاء اور اللہ تعالی کے درمیان تقسیم کرتے ہیں' ورنہ وہ غیر شعوری حالت میں شک و شبہ میں پڑ جائے گا' کیوں کہ پیدائشی طور پر وہ ناداں اور ظالم ہے اور جو خود ظالم و جاہل ہو اس سے انصاف کا مطالبہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ مخلوق کے معاملہ میں وہ شخص کیونکر انصاف کر سکتا ہے جو خالق کے معاملہ میں انصاف نہ کر سکا۔

ایک روایت میں ہے کہ ابن آدم تم نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ہماری نعمتیں تم تک پہنچ رہی ہیں اور تمہاری برائیاں ہم تک آرہی ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ابن آدم : تم نے ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ہم نے تم کو پیدا کیا تم ہمارے علاوہ کسی اور کی عبادت کرتے ہو۔ ہم تم کو رزق دیتے ہیں ___ تم دوسرے کا شکر ادا کرتے ہو۔ پھر کیسے اپنے ساتھ بے انصافی کرنے والا دوسروں کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے بلکہ اس نے اس کے ساتھ بدترین ظلم کیا حالانکہ خام خیالی میں سمجھ رہا ہے کہ وہ اکرام کر رہا ہے۔

سلام کرنے کا مطلب تواضع و انکساری ہے۔ ایسا آدمی کسی کے سامنے تکبر نہیں کرتا۔ محتاجی میں خرچ اسی وقت ہو گا جب اللہ تعالی پر پورا بھروسہ اور یقین کامل 'توکل' رحم و کرم' جود و سخا کی صفات سے متصف ہو گا اور بندہ شیطان کی تکذیب کرے جو فقر و فاقہ سے ڈراتا ہے اور برائیوں کا حکم دیتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جب آپ بچوں کے پاس سے گذرتے تو سلام کرتے تھے' اور ترمذی نے روایت کیا ہے کہ آپ ایک دن عورتوں کی ایک جماعت کے پاس سے گذرے تو آپ نے انہیں ہاتھ کے اشارہ سے سلام کیا۔

ابوداؤد نے حضرت اسماء بنت یزید سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ہم عورتوں

کی ایک جماعت کے پاس سے گذرے تو سلام کیا۔ ترمذی کی بھی یہی روایت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ایک ہی ہے اور آپ نے ان کو ہاتھ کے اشارہ سے سلام کیا تھا۔

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام جمعہ کے دن نماز سے لوٹتے ہوئے ایک بڑھیا کے پاس سے گذرتے تھے تو اسے سلام کرتے تھے اور وہ انہیں کچھ کھانا وغیرہ پیش کرتی تھیں۔

عورتوں کو سلام کرنے کے سلسلہ میں صحیح قول یہی ہے کہ بوڑھی اور محرم عورتوں کو سلام کیا جائے۔ ان کے علاوہ کسی کو نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ "چھوٹا بڑے کو اور چلنے والا بیٹھے ہوئے کو اور سوار پیدل چلنے والے کو اور تھوڑے افراد زیادہ کو سلام کریں"۔ ترمذی میں ہے کہ "چلنے والا کھڑے کو سلام کرے" اور مسند بزار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "دو چلنے والوں میں سے جو پہل کرے وہ افضل ہے"۔ سنن ابو داؤد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "جو سلام میں ابتداء کرے وہ اللہ کے یہاں تمام لوگوں سے بہتر ہے"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ کسی جماعت کے پاس آتے تو سلام کرتے اور جب واپس ہوتے تو بھی سلام کرتے تھے' نیز آپ نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی بیٹھے تو سلام کرے اور جب کھڑا ہو تو سلام کرے اور پہلا دوسرے سے زیادہ حقدار نہیں"۔

ابوداؤد نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ جب تم میں سے کوئی اپنے رفیق سے ملے تو سلام کرے اگر دونوں کے بیچ میں درخت یا دیوار حائل ہو جائے پھر سامنا ہو تو اس وقت پھر سلام کرے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام چلتے رہتے تھے تو راہ میں اگر کوئی پتھر یا درخت آ جاتا تو دائیں بائیں ہٹ جاتے اور جب دوبارہ ملتے تو ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ ہے کہ مسجد میں آنے والا سب سے پہلے تحیتہ المسجد دو رکعت نماز پڑھے پھر آئے اور لوگوں کو سلام کرے۔ اس طرح تحیتہ المسجد' تحیتہ القوم سے مقدم ہو جائے گا' کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور سلام بندوں کا' اور ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کا حق مقدم کیا جائے گا۔ بخلاف مالی حقوق کے تو ان میں نزاع پایا جاتا ہے اور دونوں کے درمیان فرق آدمی کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتا ہے' اور یہ دیکھ کر کہ مال میں دونوں قسم کے حقوق کو ادا کرنے کی وسعت ہے یا نہیں۔

اس طرح مسجد میں آنے والے کے لئے تین باتیں ترتیب وار ضروری ہیں جبکہ مسجد میں کوئی جماعت بھی بیٹھی ہوئی ہو :

اوّل یہ کہ داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھے :

«بِسْمِ اللهِ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُوْلِ اللهِ»

دوم یہ کہ تحیتہ المسجد کی دو رکعت نماز ادا کرے۔ سوم یہ کہ اس کے بعد لوگوں کو سلام کرے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اپنے گھر میں داخل ہوتے تو اس طرح سلام کرتے کہ جاگنے والا سن لے اور جو سویا ہو وہ نہ جاگے۔ (رواہ مسلم)' امام ترمذی نے یہ روایت ذکر کی ہے کہ "کلام سے قبل ہی سلام کیا جائے گا"۔

امام احمد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ "سوال سے قبل ہی سلام ہونا چاہئے"۔ اس لئے جو سلام سے پہلے سوال کرے اس کا جواب نہ دو۔ آپ سے یہ بھی منقول ہے کہ "اس شخص کو اجازت نہ دو جو سلام سے ابتداء نہ کرے"۔

جب آپ کسی کے دروازے پر تشریف لاتے تو دروازے کے بالمقابل کھڑے نہ ہوتے بلکہ دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور السلام علیکم کہتے تھے۔ جو آپ کے سامنے آتا آپ خود اس کو سلام کرتے۔ آپ دوسروں کو سلام پہنچاتے بھی تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سلام پہنچایا تھا اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ حضرت جبریل تمہیں سلام کہتے ہیں۔

آپ کی سنت مبارکہ یہ تھی کہ آپ سلام کو وبرکاتہ پر ختم کرتے تھے۔ بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے کہ آپ تین بار سلام کرتے تھے' لیکن ایسا شاید اس وقت ہوتا تھا جب لوگ زیادہ ہوتے تھے اور ایک بار میں سب کو سلام نہیں پہنچ پاتا تھا۔ آپ کو جب یہ خیال ہوتا کہ پہلی اور دوسری بار سن نہیں سکے ہیں تو سہ بارہ سلام کرتے۔ آپ کی سنت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلام کا تکرار عارضی چیز تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس سے ملتے تو خود سلام کرتے' اور جب کوئی آپ کو سلام کرتا تو اس کا ویسا ہی یا اس سے بہتر جواب فورا دیتے۔ ہاں اگر کوئی عذر ہوتا جیسے قضاء حاجت وغیرہ تو جواب میں تاخیر کرتے۔ آپ سلام کا جواب ہاتھ سر یا انگلی کے اشارے سے نہ دیتے سوائے نماز کے' کیونکہ اگر نماز کی

حالت میں سلام کیا جاتا تو آپ اشارہ سے جواب دیتے تھے' اور یہ متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام کی ابتداء "السلام علیکم و رحمتہ اللہ" کے کلمات سے کہتے تھے اور ابتداء میں سلام کرنے والے کو "علیک السلام" کہنے کو ناپسند کرتے تھے۔ سلام کرنے والے کا جواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم "وعلیکم السلام" سے دیتے تھے۔ جواب سے اگر واؤ کو حذف کر دیا جائے تو ایک جماعت کا خیال ہے کہ جواب کا فرض ادا نہ ہوگا کیونکہ یہ سنت کی مخالفت ہے' نیز اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس نے جواب دیا ہے یا سلام کیا ہے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح کا جواب صحیح ہوگا۔ امام شافعی نے اس کی وضاحت کی ہے۔ اور اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ﴿ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ ﴾ (ذاریات) لیکن اس جگہ جواب میں واؤ اس لیے حذف کیا گیا کہ ابتداء میں بھی جملہ میں کچھ حذف ہے۔ امام شافعی کے خیال کی تائید آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے جواب سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں واؤ نہیں تھا۔

فصل (۴۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اہل کتاب کو سلام کرنے کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا' اہل کتاب سے سلام کی ابتداء نہ کرو۔ جب تم راستہ میں ان سے ملو تو انہیں تنگ راہ کی طرف مجبور کرو' لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ حکم ایک خاص موقع کا ہے' جب آپ بنی قریظہ کی طرف گئے تو فرمایا' انہیں سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔ اب یہ سوال ہے کہ یہ حکم تمام حالات کے لیے ہوگا یا کسی اور قوم کے لیے مخصوص ہے' یہ محل نظر ہے۔

صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' یہودیوں اور عیسائیوں کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔ اگر انہیں کسی راستہ میں ملو تو انہیں تنگ راہ کی طرف جانے پر مجبور کردو۔

بظاہر یہ حکم عام ہے لیکن علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور اکثریت اس طرف ہے کہ ان کو سلام کرنے میں پہل نہ کی جائے۔ سلام کے جواب دینے کے متعلق صحیح قول یہ ہے کہ جواب دینا واجب ہے' اور ان میں اور اہل بدعت میں یہ فرق ہے کہ ہمیں اہل بدعت سے قطع تعلق کا حکم ہے (تاکہ اس سے انہیں تعزیر و زجر کی جائے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ ایک مجلس سے آپ کا گذر ہوا جس میں مسلمان اور مشرکین سب بیٹھے تھے۔ آپ نے ان سے سلام کیا۔ اسی طرح ہرقل وغیرہ کے نام خط لکھا تو «سَلاَمٌ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى» لکھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی منقول ہے کہ گذرنے والی جماعت میں سے ایک شخص اگر سلام کرے تو کافی ہوگا۔ اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص جواب دیدے تو یہ بھی کافی ہوگا۔ اس کی طرف وہ لوگ گئے ہیں جو جواب کو فرض کفایہ کہتے ہیں' لیکن اگر یہ حدیث ثابت ہو تو مذکورہ قول بہت خوب ہے مگر اس کی سند میں سعید بن خالد ہیں جن کے بارے میں ابوزرعہ کا قول ہے کہ ضعیف ہیں اور یہی ابوحاتم نے بھی کہا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ بھی تھی کہ جب کوئی آپ کو کسی کا سلام پہنچاتا تو اس کو اور پہنچانے والے دونوں کو آپ جواب دیتے تھے۔ اگر کسی سے خلاف شرع کام ہو جاتا تو اس کے توبہ کرنے تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ اس سے سلام کرتے اور نہ اس کے سلام کا جواب دیتے تھے۔

فصل (۴۳)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجازت طلبی کا طریقہ

صحیح روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا "اجازت تین بار طلب کی جائے اگر اجازت مل جائے تو بہتر ہے ورنہ واپس چلے جاؤ"۔ اور یہ بھی فرمایا کہ "اجازت طلبی محض دیکھنے سے بچنے کے لیئے ہے"۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے اس شخص کی آنکھ پھوڑنے کا ارادہ فرمایا جو حجرہ کے دروازے سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر فرمایا کہ : "اجازت طلبی اس لیے ہے کہ آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت نہ رہے"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ اجازت چاہنے سے قبل سلام کرتے تھے اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے اجازت طلب کرتے ہوئے عرض کیا' کیا میں اندر آ جاؤں' تو آپ نے ایک شخص کو بھیجا کہ جاؤ اسے اجازت طلب کرنے کا طریقہ بتاؤ اور کہو کہ پہلے السلام علیکم کہے پھر اندر آنے کے لئے پوچھے ۔ آپ کو یہ فرماتے ہوئے اس شخص نے سن لیا تو اس نے اسی طرح سے کیا۔ چنانچہ آپ نے اجازت مرحمت فرمادی اور وہ اندر داخل ہوا۔

اس حدیث سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ پہلے اجازت طلب کی جائے پھر سلام کیا جائے' اور ان کی بھی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر صاحب مکان پر داخلہ سے پہلے نظر پڑ جائے تو پہلے سلام کرے گا ورنہ پہلے اجازت طلب کرے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ بھی تھی کہ تین بار اجازت طلبی کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ جاتے۔ اس میں ان کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر صاحب خانہ نہ سن سکیں تو تین بار سے زیادہ اجازت طلب کر سکتا ہے اور دوسرے الفاظ میں اجازت چاہ سکتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ جب اجازت طلب کرنے والے سے دریافت کیا جائے کہ تم کون ہو تو جواب میں فلاں بن فلاں یا اپنی کنیت بتائے اور یہ نہ کہے کہ میں ہوں۔

ابو داود نے آپ سے روایت کیا ہے کہ "آدمی اگر کسی کے پاس اپنا قاصد بھیجے تو یہ اس کی اجازت کی دلیل ہے"۔ اس حدیث کو امام بخاری نے تعلیقاً ذکر کیا ہے پھر ایک حدیث ذکر کی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اجازت طلب کرنے کا اعتبار دعوت دینے کے بعد بھی ہوگا۔ اس حدیث میں اصحاب صفہ سے متعلق ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں نے انہیں دعوت دی' وہ لوگ آئے اور اجازت طلب کی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مدعو فوراً آجائے تو اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر دعوت کے کچھ دیر بعد آئے تو پھر اجازت طلب کرنی ہوگی۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ داعی کے پاس مدعو کے آنے سے پہلے کچھ ایسے لوگ ہوں جن کو وہ دعوت دے چکا ہو تو اب مدعو کو اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہ ہوگی ورنہ وہ اجازت طلب کرے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب تخلیہ کے لئے کسی کے گھر جاتے تو کسی کو دروازے پر مقرر کردیتے پھر کوئی بلا اجازت آپ کے پاس جا نہیں پاتا تھا۔

رہی وہ اجازت طلبی جو اللہ تعالیٰ نے غلاموں کو اور ان بچوں کو حکم دیا ہے جو ابھی رشد و بلوغ کو نہیں پہنچے 'اس کے تین مواقع ہیں۔ فجر سے قبل' دوپہر کے وقت' اور سوتے وقت۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کا حکم فرمایا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ لوگوں نے اس پر عمل ترک کر رکھا ہے۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے لیکن انہوں نے اس کی کوئی دلیل نہیں پیش کی۔

ایک جماعت کا قول ہے کہ مستحب ہے' لیکن امر کے صیغہ سے ظاہری طور پر وجوب کو نہ ماننے کی ان کے پاس بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ایک جماعت کا مسلک ہے کہ یہ حکم صرف عورتوں کیساتھ مخصوص ہے اور یہ بات بالکل غلط ہے۔

ایک اور جماعت کا خیال ہے کہ یہ صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ ان کا استدلال "الذین" کے کلمہ سے ہے جو مردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن کلام کا سیاق و سباق اس کے منافی ہے۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ حکم ضرورت کی وجہ سے تھا جب ضرورت ختم ہو گئی تو حکم بھی باقی نہ رہا۔ چنانچہ امام ابوداؤد نے سنن میں ذکر کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ آپ کا اس آیت کے بارے میں کیا خیال ہے' ہمیں اس کا حکم ہوا ہے لیکن اس پر کوئی عمل نہیں کرتا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مومنوں پر شفیق و رحیم ہے۔ اسے پردہ پسند ہے۔ پہلے لوگوں کے گھروں میں پردے کا انتظام نہ تھا۔ اکثر خادم 'لڑکے زیر پرورش 'یتیم گھر

میں ایسی حالت میں داخل ہو جاتے جب مرد اپنی بیوی کیساتھ ہوتا' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مذکورہ اوقات میں اجازت لینے کا حکم دیا۔ پھر لوگوں میں پردے کا انتظام ہو گیا تو کسی کو اس آیت پر عمل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

بعض لوگوں نے اس حدیث کی صحت کا انکار کیا ہے اور عکرمہ کو مطعون کیا ہے لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا اور اسی طرح راوی عمرو بن ابی عمرو کو بھی مطعون کیا ہے لیکن اس طعن و تشنیع سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ اصحاب صحیحین نے ان کی روایتوں کو لیا ہے' اس لئے مذکورہ طعن بے جا اور بے سود ہے۔

ایک اور جماعت کا خیال ہے کہ مذکورہ آیت محکم ہے اور اس کا کوئی معارض نہیں لیکن صحیح قول یہ ہے کہ آیت کا حکم ایک سبب سے متعلق ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ موجود ہے یعنی اگر اجازت کے قائم مقام کوئی چیز موجود ہو مثلاً دروازہ کھول دیا جائے یا پردہ اٹھا دیا جائے یا لوگ آ رہے ہوں تو ایسی صورت میں اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر اجازت طلب کرنا ضروری ہے اور آیت کا حکم برقرار ہے۔

فصل (۴۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چھینکنے میں اسوہ حسنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ چھینک کو پسند کرتا ہے اور جمائی کو ناپسند کرتا ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو سننے والے مسلمان پر حق واجب ہے کہ جواب میں یر حمک اللہ کہے۔ رہی جمائی تو یہ شیطان کی طرف سے ہے' لہٰذا جب تم میں سے کسی کو جمائی آئے تو چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے اسے روکے کیونکہ جب تم میں سے کوئی جمائی لیتا ہے تو شیطان ہنستا ہے۔ (بخاری)۔

امام بخاری نے مزید روایت کیا ہے کہ "جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو اسے چاہیے کہ وہ الحمد للہ کہے اور اس کے بھائی اور ساتھی کو چاہیے کہ جواب میں یر حمک اللہ کہے اور جب یر حمک اللہ کہہ چکے تو پہلے شخص کو چاہیے کہ «يَهْدِيْكُمُ اللهُ وَيُصْلِحْ بَالَكُمْ» کہے یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت دے اور تمہارے حالات درست کر دے۔

صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی چھینکے اور الحمدللہ کہے تو تم یر حمک اللہ کہو اور اگر وہ الحمدللہ نہ کہے تو اس کا جواب نہ دو"۔

صحیح مسلم ہی میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں۔ جب تم اس سے ملو تو سلام کرو' جب تمہیں دعوت دے تو قبول کرو' جب نصیحت طلب کرے تو نصیحت کرو' جب چھینکے اور الحمدللہ کہے تو یر حمک اللہ کہو' جب مر جائے تو جنازہ میں شرکت کرو اور جب بیمار ہو جائے تو عیادت کرو۔

امام ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں چھینکنے کے وقت یہ کہنے کی تعلیم دی ہے "الحمد للہ علی کل حال" امام مالک نے نافع سے اور انہوں نے ابن عمر سے روایت کیا ہے جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے اور اس کے جواب میں یر حمک اللہ

کہا جائے تو چھینکنے والے کو "یرحمنا اللہ وایاکم و یغفرلنا و لکم" کہنا چاہیے۔

ابتداء میں جو حدیث مذکور ہوئی ہے' اس کا مفہوم یہ ہے کہ چھینکنے والے کا جواب دینا فرض عین ہے۔ ابن ابی زید نے اسی کو اختیار کیا ہے اور اس کا کوئی معارض بھی نہیں ہے۔

چونکہ چھینکنے والے کو چھینک سے نعمت ملتی ہے اور جسم میں پھنسے ہوئے بخارات کے نکلنے سے فائدہ ہوتا ہے اور صحت نصیب ہوتی ہے اس لئے اس نعمت کے حصول پر اللہ تعالیٰ کی تعریف اس کے لئے مشروع کی گئی ہے۔ زمین کو جس طرح زلزلہ سے جھٹکا لگتا ہے اسی طرح کا جھٹکا چھینک سے بدن کو لگتا ہے مگر اللہ کا احسان ہے کہ اس جھٹکے کے باوجود تمام اعضاء اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب چھینک آتی تھی تو آپ اپنا ہاتھ یا کپڑا چہرہ انور پر رکھ لیتے یا سر نیچا کر لیتے اور آواز پست فرما لیتے تھے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ بڑی جمائی اور باآواز بلند چھینک شیطان کی جانب سے ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ ایک آدمی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں چھینک آئی تو آپ نے یرحمک اللہ فرمایا پھر دوبارہ چھینک آئی تو آپ نے فرمایا کہ اس آدمی کو زکام ہے۔ یہ امام مسلم کی روایت میں ہے اور امام ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ نے تیسری مرتبہ فرمایا کہ اس آدمی کو زکام ہے اور انہوں نے اس حدیث کو صحیح بتایا ہے۔

امام ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ تمہارے بھائی کو اگر تین بار چھینک آئی تو وہ واقعی چھینک تھی اور جو اس سے زیادہ چھینکا تو وہ زکام ہے۔ اور چھینک میں تین بار جواب دینا سنت ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ زکام کی حالت میں انسان دعا کا زیادہ محتاج ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ایسے شخص کو مریض والی دعاء دینا چاہیے' لیکن چھینک جو اللہ کو پسند ہے اور جسے نعمت بتایا گیا ہے' وہ تین چھینکوں ہی تک ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص کے لئے فرمایا کہ وہ مزکوم ہے تو اس سے اس بات پر تنبیہہ مقصود تھی کہ اس کے حق میں عافیت کی دعا کرنی چاہیے اور یہ معذرت بھی تھی کہ تین مرتبہ کے بعد جواب کیوں نہیں دیا۔

جب کسی چھینکنے والے نے الحمدللہ کہا تو بعض حاضرین نے سنا اور بعض نے نہیں سنا تو جس نے نہیں

سنا' انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اس میں صحیح بات یہ ہے کہ جب یقین ہو جائے کہ اس نے حمد کی ہے تو سب کو اس کا جواب دینا چاہیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جب کوئی "الحمدللہ" کہے تو اس کا جواب دو۔ اور جب کوئی چھینکنے والا "الحمدللہ" نہ کہے یا بھول جائے تو ابن العربی کا قول ہے کہ اس کو یاد دہانی نہ کرائی جائے۔ اور ظاہری الفاظ حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو یاد دہانی اس موقع پر نہیں کرائی حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنت پر عمل کرنے اور اس کے سیکھنے پر بہت زور دیتے تھے۔ اس کار خیر میں تعاون کرنے کے زیادہ اہل تھے۔

حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہود' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس امید پر چھینکتے تھے کہ آپ ان کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہیں گے لیکن آپ یہ نہ کہتے' صرف «يَهْدِيْكُمُ اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ» کہتے تھے۔

فصل (۴۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر کے دوران اسوہ حسنہ

صحیح روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی کسی کام کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ دو رکعت نماز پڑھے" چنانچہ آپ نے دور جاہلیت کے غلط اوہام کے بجائے یہ طریقہ حسنہ پیش فرمایا کیونکہ وہ لوگ پرندوں اور تیروں سے شگون لیتے تھے اور قرعہ کے ذریعہ یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ غیب میں ان کے حصہ میں کیا تقسیم ہو چکا ہے اور اس طریق کار کو استقسام کہا کرتے تھے اور اس کی جگہ ایسی دعا تعلیم فرمائی جو توحید 'اللہ تعالی کی بندگی' احتیاج اور توکل پر مشتمل ہے۔ اس ذات پاک سے سوال کرنا ہے جس کے ہاتھ میں تمام خیر اور بھلائی ہے اور اس کے سوا نہ کسی سے بھلائی پہنچ سکتی ہے اور نہ اس کے سوا کوئی دکھوں کو دور کر سکتا ہے۔

یہ دعا اہل سعادت کے لئے نشان سعادت و برکت ہے اور ایسے بدبخت مشرکین کے لئے اس میں کچھ حصہ نہیں جو اللہ کے ساتھ ساتھ اوروں کو بھی معبود بتاتے ہیں۔

﴿ ٱلَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ ٱللَّهِ إِلَٰهًا ءَاخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴾

جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی معبود قرار دیتے ہیں عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

اس دعا میں اللہ تعالی کی صفات کاملہ اور ربوبیت عامہ کا اقرار ہے۔ اس پر توکل کا اعلان ہے اور اپنی مصلحتوں سے ناواقفیت اور ان پر عدم قدرت کا اعتراف ہے۔

مسند احمد میں حضرت سعد بن ابی وقاص سے مرفوعا روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ "اللہ تعالی سے استخارہ کرنا اور اس کی قضا پر راضی ہو جانا بنی آدم کی سعادت کی علامت ہے اور استخارہ کو ترک کر دینا اور اللہ تعالی کے فیصلے پر ناراض ہونا بنی آدم کی بدبختی کی علامت ہے"۔

یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ مقدر دو صفتوں کے درمیان مذکور ہے۔ ایک توکل جو مقدور سے پہلے

استخارہ کا مضمون ہے اور دوم اللہ کے فیصلہ پر رضامندی جو مقدور کے بعد کی چیز ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر بیٹھتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر یہ دعا پڑھتے :

«سُبْحَانَ اللهِ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْنَ، وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ»

پاک ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارے لئے مسخر کیا اور ہم اسے زیر نہ کر سکتے تھے' ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھتے تھے :

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ فِي سَفَرِي هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوَى، وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضَى اللَّهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا السَّفَرَ وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهُ اللَّهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الأَهْلِ، اللَّهُمَّ اصْحَبْنَا فِي سَفَرِنَا وَاخْلُفْنَا فِي أَهْلِنَا»

اے اللہ اس سفر میں تجھ سے نیکی و تقویٰ کا سوال کرتا ہوں اور ایسے عمل کا جس کو تو پسند کرے۔ اے اللہ سفر آسان کر اور اس کی دوری سمیٹ دے۔ اے اللہ تو سفر کا ساتھی اور گھر والوں کا محافظ ہے۔ اے اللہ سفر میں ہمارے ساتھ رہ اور گھر والوں کی حفاظت فرما۔

اور جب سفر سے واپس ہوتے تو یہ دعا پڑھتے :

«آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ، عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ»

ہم لوٹ کر آتے ہیں' اللہ کے آگے توبہ کرتے ہیں اور اس کی عبادت اور تعریف کرتے ہیں۔

امام احمد رحمتہ اللہ علیہ۔ نے ذکر کیا ہے کہ جب آپ شہر میں داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھتے :

«تَوْبًا تَوْبًا لِرَبِّنَا أَوْبًا لاَيُغَادِرُ حَوْبًا»

ہم لوٹ کر آتے ہیں' اللہ کے آگے توبہ کرتے ہیں' وہ ہمارے تمام گناہوں کو معاف کر دے گا۔

جب آپ سواری پر چڑھنے کے لئے رکاب میں پیر رکھتے تو بسم اللہ کہتے اور جب اس کی پشت پر سوار ہو جاتے تو "الحمد للہ" کہتے' پھر «سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْنَ» والی دعا پڑھتے تھے۔ جب آپ سفر پر جانے والے کسی صحابی کو رخصت کرتے تو یہ دعا پڑھتے :

«اَسْتَوْدِعُ اللهَ دِيْنَكَ وَأَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ»

میں تیرا دین تیری امانت اور تیرے عمل کا انجام اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔

ایک شخص خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں تو آپ نے فرمایا "میں تجھے اللہ سے ڈرنے اور اونچی جگہ پر اللہ اکبر کہنے کی وصیت کرتا ہوں"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب کسی بلندی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے اور جب نشیبی جگہ اترتے تو تسبیح کہتے' اسی حیثیت میں نماز بھی رکھی گئی ہے۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی اونچی جگہ یا ٹیلہ پر چڑھتے تو یہ دعا پڑھتے :

«اللَّهُمَّ لَكَ الشَّرَفُ عَلَى كُلِّ شَرَفٍ وَلَكَ الْحَمْدُ عَلَى كُلِّ حَالٍ»

اے اللہ ہر بلندی پر تجھے ہی بلندی حاصل ہے اور ہر حالت میں تیری ہی حمد ہے۔

اور آپ فرماتے تھے کہ "فرشتے ایسے قافلے کے ساتھ شریک نہیں ہوتے' جس میں کتا یا گھنٹی اور باجا ہو"۔

آپ اس بات کو ناپسند فرماتے تھے کہ مسافر تنہا رات کو سفر کرے۔ آپ نے فرمایا کہ "اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ تنہا سفر کرنے میں کتنی قباحت ہے تو وہ رات کو تنہا سفر نہ کریں"۔ بلکہ آپ تنہا سفر ہی ناپسند فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے کہ "ایک مسافر ایک شیطان ہے' دو مسافر دو شیطان اور تین سے قافلہ بنتا ہے"۔

آپ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کسی جگہ اترے تو یہ دعا پڑھے :

«أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ»

ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی' اللہ کے کلمات کے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں۔

پھر اسے کچھ ضرر نہ پہنچے گا' یہاں تک کہ وہ اس جگہ سے روانہ ہو جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جب تم سبزہ زاروں میں سفر کرو تو اونٹوں کو بھی زمین میں سے ان کا حصہ دیا کرو اور جب تم ویران مقام میں سفر کرو تو جلدی سے اسے عبور کر جاؤ۔ اور جب رات میں اترو تو راستوں سے بچو کیونکہ وہ چلنے والوں کا راستہ اور رات میں زہریلے جانوروں کا ٹھکانہ ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسافر کو دشمن کے علاقے میں قرآن لے جانے سے منع فرماتے تھے کہ کہیں دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے اور اس کی بے حرمتی کا مرتکب ہو۔ آپ عورت کو بغیر محرم کے سفر کرنے

سے منع فرماتے تھے اگرچہ یہ برید (۱۲ میل) کی مسافت ہی کیوں نہ ہو۔

آپ مسافر کو حکم دیتے کہ جب سفر میں کام ختم ہو جائے تو جلدی سے اپنے گھر لوٹ آئے اور طویل سفر سے واپسی میں رات کے وقت گھر آنے سے منع فرمایا ہے۔

جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے تو اہل بیت کے بچوں سے ملتے۔ اور سفر سے واپس آنے والے کے ساتھ آپ معانقہ فرماتے تھے اور اگر اہل بیت میں سے ہوتا تو اس کا بوسہ لیتے تھے۔

شعبی کا قول ہے کہ صحابہ کرام جب سفر سے واپس آتے تو معانقہ کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے آتے تو پہلے مسجد جا کر دو رکعت نماز ادا فرماتے تھے۔

فصل (۴٦)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبۃ الحاجۃ کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے صحابہ کرام کو خطبہ حاجت کی اس طرح تعلیم دی :

«إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ»

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، ہم اسی کی حمد کرتے ہیں، اسی سے مدد چاہتے ہیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں اور ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، نفس کی برائیوں اور برے اعمال سے۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گمراہ کرے اسے کوئی راستہ نہیں دکھا سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔

پھر درج ذیل تین آیتیں پڑھتے :

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِۦ . . . ﴾ [آل عمران : ١٠٢]

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جتنا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ ﴾ [النساء : ١]

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَقُولُواْ قَوْلًا سَدِيدًا ﴾ [الأحزاب : ٧٠]

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔

شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو اسحاق سے دریافت کیا کہ آیا یہ خطبہ نکاح ہے یا کچھ اور ہے؟ انہوں نے جواب دیا' یہ ہر ضرورت کے لئے ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی عورت یا غلام یا جانور حاصل کرے تو وہ اس کی پیشانی پکڑ کر اللہ سے برکت کی دعا کرے اور بسم اللہ کہے اور یہ دعا پڑھے :

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَهَا وَخَيْرَ مَا جُبِلَتْ عَلَيْهِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا جُبِلَتْ عَلَيْهِ»

اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں' اس کی بھلائی اور جس پر یہ پیدا کی گئی ہے' اس کی بھلائی مانگتا ہوں اور اسکی برائی اور جس پر یہ پیدا کی گئی ہے اسکی برائی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

نکاح کرنے والے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے :

«بَارَكَ اللهُ لَكَ وَبَارَكَ عَلَيْكَ وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا فِي خَيْرٍ»

اللہ تمہارے لئے برکت دے اور تم پر برکت نازل کرے اور تم دونوں کو بھلائی پر جمع کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا' جو آدمی بھی کسی مریض کو دیکھے اور یہ دعا پڑھ لے' تو اسے وہ مرض کبھی نہ ہو گا چاہے کچھ بھی ہو۔ دعا یہ ہے :

«اَلْحَمْدُ للهِ الَّذِي عَافَانِي مِمَّا ابْتَلاَكَ بِهِ، وَفَضَّلَنِي عَلَى كَثِيْرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلاً»

سب تعریفیں اللہ کے لئے جس نے مجھے اس مرض سے محفوظ رکھا' جس میں تجھے مبتلا کیا اور مجھے بہت سی مخلوقات پر بطور خاص افضلیت دی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شگون کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس میں بہتر فال ہے لیکن یہ مسلمان کو نقصان نہیں دے سکتی۔ جب تم کوئی برا شگون دیکھو' جسے تم برا سمجھتے ہو تو یہ دعا پڑھو :

«اللَّهُمَّ لاَيَأْتِي بِالْحَسَنَاتِ إِلاَّ أَنْتَ، وَلاَيَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ إِلاَّ أَنْتَ، وَلاَحَوْلَ وَلاَقُوَّةَ إِلاَّ بِكَ»

اے اللہ تو ہی بھلائیاں عطا کرتا ہے اور صرف تو ہی تکالیف رفع کرتا ہے اور تیرے سوا نہ توفیق ہے اور نہ قوت ہے۔

فصل (۴۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب دیکھنے کے متعلق اسوہ حسنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ اچھے خواب اللہ کی جانب سے ہیں اور برے خواب شیطان کی طرف سے ہیں اس لئے جو شخص کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو بائیں جانب معمولی تھوک کے ساتھ پھونک مار دے اور "اعوذ باللہ.....الخ" پڑھ لے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور کسی کو اس کی خبر نہ دے۔ اور اگر خواب اچھا دیکھے تو خوش ہو اور صرف اسی کو خبر دے جس سے محبت ہو۔

آپ نے برا خواب دیکھنے والے کو پہلو بدلنے اور نماز پڑھنے کا بھی حکم دیا ہے۔ اس طرح کل پانچ چیزوں کا حکم دیا گیا ہے۔ (۱) بائیں طرف پھونک مارنے کا (۲) اعوذباللہ پڑھنے کا (۳) کسی کو خبر نہ دینے کا (۴) کروٹ بدلنے کا (۵) نماز پڑھنے کا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب کی جب تک تعبیر نہ کی جائے' اڑتا رہتا ہے اور جب تعبیر بیان کر دی جاتی ہے تو واقع ہو جاتی ہے' لہٰذا خواب دیکھنے والا صرف اسی کو بتائے جس سے محبت ہو یا جو صاحب رائے ہو' نیز آپ سے منقول ہے کہ خواب دیکھنے والے سے آپ پہلے یہ فرما دیتے تھے کہ تم نے اچھا خواب دیکھا ہے' پھر اس کی تعبیر بیان فرماتے تھے۔

فصل (۴۸)

وساوس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت ہے کہ انسان کے دل میں ایک القاء فرشتہ کی طرف سے ہوتا ہے اور ایک شیطان کی طرف سے' فرشتہ بھلائی کا وعدہ کرتا ہے' حق کی تصدیق کرتا ہے اور ثواب کی امید دلاتا ہے' اور شیطان کا القاء' برائی کے وعدے' حق کی تکذیب اور بھلائی سے مایوسی پر مشتمل ہوتا ہے' لہٰذا تم جب فرشتے کا القاء محسوس کرو تو اللہ کی تعریف کرو اور اس کی مہربانی کا سوال کرو' اور جب شیطان کا القاء محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگو اور اس سے بخشش طلب کرو۔

حضرت عثمان بن ابی العاص نے عرض کیا کہ میرے اور میری نماز اور قراءت کے درمیان شیطان حائل ہو جاتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا نام خنزب ہے' جب تم اسے محسوس کرو تو اللہ کی پناہ طلب کرو اور اپنی بائیں جانب تین بار تھوک دو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے شکایت کی کہ ان کے دل میں ایسے خیالات آتے ہیں جن کے اظہار کے مقابلے میں جل کر راکھ ہونے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ اکبر' اللہ اکبر سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے شیطان کی چال کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا۔

کائنات کی خلقت وغیرہ کے سلسلہ میں کسی کو وسوسہ پیدا ہو اور یہ خیال آئے کہ اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا تو ایسے شخص کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم ہے کہ وہ یہ آیت کریمہ پڑھے :

﴿ هُوَ ٱلْأَوَّلُ وَٱلْءَاخِرُ وَٱلظَّٰهِرُ وَٱلْبَاطِنُ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ ﴾ [الحدید : ۳]

وہی اول و آخر' ظاہر اور باطن ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اسی طرح ابو زمیل نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ مجھے سینے میں کچھ وسوسہ محسوس ہوتا ہے تو انہوں نے پوچھا' کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا بخدا میں ہرگز زبان پر نہ لاؤں گا۔ ابن

عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کوئی شک کی بات ہے؟ انہوں نے کہا' ہاں۔ وہ کہنے لگے کہ اس سے کوئی بھی نجات نہ پاسکا۔ اگر دل میں کچھ محسوس کرو تو ﴿ هُوَ ٱلْأَوَّلُ وَٱلْآخِرُ وَٱلظَّٰهِرُ وَٱلْبَاطِنُ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴾ [الحدید: ۳] پڑھ لو۔

اس طرح آیت کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرمائی کہ تسلسل بدیہی طور پر باطل ہے۔ ابتداء میں مخلوقات کا سلسلہ ایسی ذات پر ختم ہوتا ہے جس سے پہلے کچھ نہیں اور آخر میں ایسی ذات پر ختم ہوتا ہے جس کے بعد کچھ نہیں' اور اس ذات کے ظہور کا یہ معنی ہے کہ اس کے اوپر کچھ نہیں اس کے بطون کا معنی یہ ہے اس کے احاطہ کے بعد کچھ نہیں باقی بچا۔ اگر اس سے پہلے کوئی چیز مانی جائے جو اس میں موثر ہو تو وہی رب خلق ہوگی۔ اس لئے ضروری ہوگا کہ یہ سلسلہ ایسے خالق پر ختم ہو جو دوسرے سے بے نیاز ہو اور ہر چیز اس کی محتاج ہو' وہ خود قائم ہو' اور جو خود قائم ہوگا وہ بذات خود موجود ہوگا اور جو خود ہوگا وہ قدیم اور بے ابتداء ہوگا۔ اس کے علاوہ تمام چیزوں کا وجود اس کی ذات سے باقی ہے اور ہر چیز کی بقاء اسی سے ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لوگ ایک دوسرے سے سوال کرتے رہیں گے حتی کہ کہنے والا کہے گا' یہ اللہ ہے جس نے مخلوق کو پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ اب جس کو اس قسم کی کوئی خلش محسوس ہو وہ اللہ کی پناہ مانگے اور رک جائے اور مزید نہ سوچے"۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ ٱلشَّيْطَٰنِ نَزْغٌ فَٱسْتَعِذْ بِٱللَّهِ ﴾ [فصلت: ٢٦]

اگر شیطان کی طرف سے تمہیں کسی قسم کی چھیڑ پہنچے تو خدا کی پناہ لیا کرو۔

چونکہ شیطان کی دو قسمیں ہیں' ایک جو کہ بشکل انسان نظر آتا ہے اور دوسرا جو جن ہے اور نظر نہیں آتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ انسانی شیطان کے شر سے بچنے کے لئے اعراض' عفو' مناسب مدافعت سے کام لیں اور جناتی شیطان کے شر سے بچنے کے لئے اعوذ باللہ پڑھا کریں۔ سورہ اعراف' مومنون اور فصلت میں دونوں قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک شعر ہے :

فما هو الا الاستعاذةُ ضارعًا ۔۔۔ والدفعُ بِالحسنى هما خيرُ مَطْلُوْبِ

عاجزی کے ساتھ اعوذ باللہ پڑھنا اور بھلے طور پر مدافعت کرنا' یہی بہترین مطلوب ہے۔

فهٰذا دَواءُ الداءِ من شرمَايُرى ۔۔۔ وذاك دَواءُ الدَّاءِ مِنْ شَرِ مَحجُوبِ

یہ نظر آنے والی چیزوں کے شر کی اور وہ پوشیدہ شر کی کامیاب دوا ہے۔

فصل (۴۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غصہ کے وقت کی تعلیمات اور دیگر تعلیمات حسنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ غصے کی آگ بجھانے کے لئے وضو کیا جائے یا کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اگر بیٹھا ہو تو لیٹ جائے اور اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے۔

جب انسان کے قلب میں غصہ اور شہوت آگ کی دو چنگاریاں ہوتی ہیں تو آپ نے انہیں مذکورہ طریقے سے بجھانے کا حکم دیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

﴿أَتَأْمُرُونَ ٱلنَّاسَ بِٱلْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ﴾ [البقرة: ٤٤]

کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔

اس پر آمادہ کرنے والی چیز چونکہ شہوت کی شدت ہوتی ہے۔ اس لئے اس شعلہ کو نماز اور خیر کے ذریعہ سے بجھانے کا حکم دیا گیا اور شیطان سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی۔

چونکہ تمام معصیتوں کا صدور غضب اور شہوت ہی سے ہوتا ہے اور غضب کا انجام قتل اور شہوت کا انجام زنا ہوتا ہے' اس لئے اللہ تعالیٰ نے قتل اور زنا کا ساتھ ساتھ ذکر کیا اور سورہ انعام' سورہ اسراء اور سورہ فرقان میں انہیں یکجا ذکر کیا ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی پسندیدہ چیز کو دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے :

«اَلْحَمْدُ للهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ»

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس کی نعمت سے نیک کام پورے ہوتے ہیں۔

جب کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھتے تو یہ کہتے تھے : "الحمد للہ علی کل حال" ہر حال میں سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں' اور جب کوئی محبوب یا مناسب چیز پیش کرتا تو آپ اس کے لئے دعا فرماتے' چنانچہ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کے لئے وضو کا انتظام کیا تو آپ نے دعا فرمائی :

«اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ»

اے اللہ انہیں "تفقہ فی الدین" عطا فرما اور تفسیر قرآن سکھا۔

حضرت قتادہ نے رات کے وقت سواری پر سہارا دیا تو آپ نے یہ دعا دی۔

«حَفِظَكَ اللّٰهُ بِمَا حَفِظْتَ بِهِ نَبِيَّهُ»

"اللہ تمہاری حفاظت کرے جس طرح تم نے اس کے نبی کی حفاظت کی"۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے ساتھ بھلائی کی جائے اور اس نے "جزاک اللہ خیرا" کہہ دیا تو اس نے گویا تعریف کر دی۔

ایک قرض دار نے قرض ادا کر دیا تو اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ سے دعا دی :

«بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ، إِنَّمَا جَزَآءُ السَّلَفِ الْحَمْدُ وَالْأَدَاءُ»

اللہ تمہیں مال و اولاد میں برکت دے' بلاشبہ قرض کی جزاء خدا کی تعریف اور ادائیگی ہے۔

جب آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کیا جاتا تو اسے قبول کر کے اس سے زیادہ بدلہ دیتے اور اگر مسترد کرتے تو معذرت کر دیتے جیسا کہ آپ نے صعب بن جثامہ سے فرمایا کہ "ہم اسے مسترد نہ کرتے' اگر احرام کی حالت میں نہ ہوتے"۔

آپ نے امت کو حکم دیا کہ جب گدھے کی آواز سنیں تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ طلب کریں اور جب مرغ کی آواز سنیں تو اللہ سے اس کا فضل مانگیں۔ یہ بھی مروی ہے کہ آگ لگ جائے تو اللہ اکبر کہیں' اس سے وہ بجھ جائے گی۔

اور اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ اہل مجلس اپنی مجلسوں کو ذکر الٰہی سے محروم رکھیں اور فرمایا کہ جو آدمی ایسی جگہ سے اٹھے جہاں اللہ کا ذکر نہ ہوا ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسرت نازل ہو گی اور جو لیٹ جائے اور اللہ تعالیٰ کو یاد نہ کرے تو اس پر بھی حسرت نازل ہو گی۔

نیز آپ نے فرمایا جو کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں بکثرت لغو باتیں کر ڈالے۔ اگر اٹھنے سے قبل یہ کلمات کہہ لے تو اس مجلس میں جو کچھ بھی خطا ہو چکی ہو گی' معاف کر دی جائے گی۔

«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ»

اے اللہ ہم تیری پاکی اور حمد بیان کرتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' تجھ سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔

سنن ابوداؤد میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مجلس سے اٹھنا چاہتے تھے تو مذکورہ دعا پڑھتے تھے۔ آپ سے دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ مجلس میں جو کچھ ہوا' اس کا یہ کفارہ ہے۔

فصل (۵۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ناپسندیدہ الفاظ و کلمات

بعض ایسے الفاظ جن کو کہنا اور سننا آپ ناپسند کرتے تھے' وہ یہ ہیں : (خبثت نفسی) کہنا کہ میں خبیث ہو گیا ہوں' انگور کو کرم کہنا' (ھلک الناس) کہ لوگ ہلاک ہو گئے کہنا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جس نے ایسا کہا' خود اس نے لوگوں کو ہلاک کیا' یا یہ کہنا : لوگ فاسد ہو گئے' زمانہ فاسد ہو گیا' فلاں فلاں نچھتر سے بارش ہوئی' جو اللہ چاہے اور تم چاہو' چنانچہ آپ نے اس طرح کے جملے کہنے سے منع فرمایا ہے۔

اسی طرح سے غیر اللہ کی قسم کھائی جائے یا قسم میں یہ کہے کہ اگر وہ ایسا کرے تو وہ یہودی ہے یا کسی بادشاہ کو شہنشاہ کہے اور آقا اپنے غلام یا لونڈی کو میرا بندہ یا میری بندی کہہ کر پکارے اور ہوا' بخار' مرغ وغیرہ کو برا بھلا کہنا' ان تمام چیزوں کے کہنے سے ممانعت آئی ہے۔

اسی طرح جاہلیت کے نعرے لگانا جیسے قبیلہ' قومیت اور مذہبی' گروہی و مشائخی طرق کے حق میں متعصبانہ انداز اختیار کر کے نعرے بازی کرنا اور عشاء کی نماز کو عتمہ کہنا جس سے عشاء کا نام متروک ہو جائے' کسی مسلمان کو گالی دینا' تیسرے شخص کی موجودگی میں دو آدمیوں کا سرگوشی کرنا' عورت کا اپنے شوہر کے سامنے دوسری عورت کے محاسن بیان کرنا' ان تمام الفاظ و کلمات کے کہنے کی ممانعت آئی ہے۔

اسی طرح سے یہ بھی کہنا ممنوع ہے' یا اللہ اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے۔ کثرت سے قسمیں کھانا' قوس قزح کہنا' کسی سے اللہ کے نام پر سوال کرنا' مدینہ کو یثرب کہنا' بلا ضرورت کسی سے یہ دریافت کرنا کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا اور میں نے پورے رمضان کے روزے رکھے اور پوری رات کا قیام کیا' اس طرح کے الفاظ کہنا مکروہ و ممنوع ہے۔

ممنوع کلمات میں یہ بھی داخل ہے کہ اشارہ سے بتائی جانے والی چیزوں کو صراحت کے ساتھ ذکر کیا جائے یا (اطال اللہ بقاء ک) وغیرہ کہا جائے یا روزے دار یہ کہے اس ذات کی قسم' جس کی مہر میرے منہ

پر ہے' کیونکہ مہر تو کافر کے منہ پر لگتی ہے' یا زبردستی لی ہوئی چیز کو حقوق سے تعبیر کیا جائے یا اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا یہ کہے کہ دنیا میں میں نے بہت سامال خرچ کیا' یا اجتہادی مسائل میں مفتی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز حلال کی ہے اور فلاں چیز حرام' یا قرآن و سنت کے دلائل کو مجازات اور متکلمین کے شبہات دلائل عقلی و قطعی سے تعبیر کیا جائے' اللہ گواہ ہے کہ اس طرح کے کلمات کہنے سے دین و دنیا کی بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

نیز ممنوع و مکروہ باتوں میں یہ ہے کہ آدمی دوسروں سے اپنی بیوی کے ساتھ مابین چیزوں کا تذکرہ کرے جیسے بعض کمینوں کی عادت ہوتی ہے۔ اسی طرح زعموا' ذکروا' قالوا' جیسے الفاظ سے حکایت کرنا اور بادشاہ کو خلیفۃ اللہ کہنا منع ہے کیونکہ خلیفہ ایسی ذات کا ہوتا ہے جو غائب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو خود غائب شخص کے اہل و عیال کا خلیفہ اور محافظ ہے۔

نیز' انا' لی' عندی' (میں' میرا' میرے نزدیک) کے الفاظ سے بھی بچنا چاہیے کیونکہ انہی تین الفاظ سے ابلیس فرعون اور قارون کی آزمائش ہوئی تھی۔

چنانچہ ابلیس نے کہا تھا "انا خیر منہ" (میں اس سے بہتر ہوں) اور فرعون نے کہا تھا "ولی ملک مصر" (اور مصر کا ملک میرا ہے) اور قارون نے کہا تھا "وانما اوتیتہ علی علم عندی" اور مجھے یہ مال میرے علم کی بنا پر دیا گیا اور سب ان متکبرانہ جملوں سے گمراہ و تباہ ہوئے۔

سب سے بہتر (انا) یعنی میں "بندے کے اس قول میں ہے "انا العبد المذنب" میں گناہگار توبہ کرنے والا اور اعتراف کرنے والا بندہ ہوں' اور لفظ (لی) جیسے لی الجرم' ولی الذنب' ولی الفقر" (گناہ و جرم اور فقر و ذلت میرا ہے) اور عندی جیسے «آغْفِرْ لِي جِدِّي وَهَزْلِي وَخَطْئِي وَعَمْدِي وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِي» میرا گناہ' لغزش' خطائیں' اور عمداً گناہ بخش دے اور میرے پاس یہ تمام نقائص ہیں۔

فصل (۵۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد و غزوات میں اسوہ حسنہ

جہاد چونکہ اسلام کا ایک اعلیٰ و عظیم الشان مسئلہ ہے اور مجاہدین جنت میں بلند تر مقامات پر فائز ہوں گے اور دنیا میں بھی ان کی سربلندی ہوتی ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلہ میں ایک اعلیٰ مقام پر فائز تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی ہر قسم میں بنفس نفیس حصہ لیا اور اللہ کی راہ میں دل و جان ' دعوت و بیان ' سیف و سنان ' غرض ہر چیز کے ذریعہ سے جہاد فرمایا اور آپ کے تمام اوقات جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف تھے اس لئے آپ کی شخصیت اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ قابل قدر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کرتے ہی جہاد کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا :

﴿ فَلَا تُطِعِ ٱلْكَٰفِرِينَ وَجَٰهِدْهُم بِهِۦ جِهَادًا كَبِيرًا ﴾ [الفرقان : ۵۲]

آپ کافروں کی اطاعت نہ کیجئے اور ان سے خوب جہاد کیجئے۔

یہ سورہ مکی ہے ' اس میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے ساتھ جہاد بالبیان کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح منافقین کے ساتھ جہاد کا حکم دیا کہ انہیں دلیل دی جائے یعنی جہاد بالحجہ کیا جائے جو کفار سے جہاد کے مقابلہ میں زیادہ سخت ہے۔ یہ جہاد امت کے خواص اور وارثان رسول کا حصہ ہے۔ دنیا میں تھوڑے سے لوگ اس کو انجام دیتے ہیں اور اس راہ میں انہی کی مدد ہوتی ہے۔ ایسے لوگ تعداد میں تھوڑے ہوتے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک ان کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے۔

چونکہ افضل ترین جہاد یہ ہے کہ شدید معارضت کے موقع پر حق بات کہی جائے جیسے جابر و ظالم کے سامنے کلمہ حق کہنا ' جس سے ایذاء کا خطرہ بھی ہو ' اس قسم کے جہاد میں انبیاء کرام کا حصہ کافی ہوتا ہے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلہ میں کامل اور اعلیٰ ترین مجاہد تھے۔ نیز اللہ کے دشمنوں کے مقابلے میں کیا جانے والا خارجی جہاد بندے کے داخلی جہاد نفس کی فرع اور شاخ ہے۔ جیسا کہ نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجاہد وہ ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اپنی ذات و نفس سے جہاد کیا" تو ظاہر ہے کہ جہاد بالنفس جہاد بالعدو پر مقدم ہے۔ یہ دونوں دشمن ہیں اور بندے کو ان دونوں سے جہاد کرنے کا مکلف قرار دیا گیا ہے۔ان کے علاوہ ایک تیسرا دشمن بھی سامنے کھڑا ہے۔ اس سے جہاد کیۓ بغیر ان دونوں کا مقابلہ کرنا بھی محال ہے' اور وہ تیسرا بندے کو ان دونوں کا مقابلہ کرنے سے باز رکھنے اور اسے کمزور کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور وہ دشمن شیطان ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے :

﴿ إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَٱتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۚ ﴾ [فاطر : ٦]

شیطان تمہارا دشمن ہے' اس لئے تم اسے دشمن سمجھو۔

چنانچہ اسے دشمن سمجھنے کا حکم اس بات کا اشارہ ہے کہ اس سے جنگ کرنے اور مقابلہ کرنے کے لئے پوری وسعت اور ہمت سے کام لینا چاہیے۔ اس طرح یہ تین دشمن ہیں جن سے بندے کو جنگ کرنے اور جہاد کرنے کا حکم دیا گیا اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ایک آزمائش ہے۔ اور بندے کو ان کے مقابلے کی قوت اور مدد بھی دی گئی ہے اور فریقین میں سے ایک کو دوسرے کے ذریعہ آزمایا گیا ہے۔ اور بعض بعض کے لئے فتنہ ہیں تاکہ ان کے حالات و معاملات کا امتحان ہو سکے' چنانچہ بندوں کو اللہ تعالیٰ نے آنکھ' کان' عقل اور قوت سے نوازا ہے اور ان کے لئے کتابیں نازل فرمائی اور انبیاء کرام کی بعثت کی اور اپنے فرشتوں سے نصرت فرمائی۔ دشمنوں سے جنگ کے دوران جو چیز مددگار ثابت ہو سکتی ہے' اس سے مطلع فرمایا' اور ان کو بتایا کہ اگر اس کی اطاعت کرتے رہیں گے تو اپنے دشمنوں پر فتحیاب ہوتے رہیں گے۔ اگر اس کی اطاعت سے روگردانی کریں گے تو دشمنوں کو اللہ تعالیٰ ان پر مسلط کر دیں گے۔ اور ایسی صورت میں بھی مایوسی کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ صبر و استقامت سے ان زخموں کا بھی مداوا کیا جا سکتا ہے اور دشمن پر غالب ہوا جا سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ نیکو کاروں اور پرہیز گاروں اور صبر کرنے والوں اور ایمان والوں کے ساتھ ہے' اور وہ ذات پاک مومنین کی اس وقت مدافعت اور نصرت کرتی ہے جب وہ اپنے آپ مدافعت سے عاجز اور قاصر ہو جاتے ہیں اور اس کی نصرت اور مدافعت سے وہ فتحیاب ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو دشمن انہیں تباہ و برباد کر ڈالیں گے۔

یہ مدافعت ان کے ایمان و یقین کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر ایمان قوی ہو گا تو مدافعت بھی قوی ہو گی۔ اس میں جو بھلائی پائے تو چاہیے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور جو بھلائی کے علاوہ کچھ اور دیکھے

تو صرف اپنے آپ کو ملامت کرے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ اس کے راستے میں جہاد کرنے کا حق ادا کریں جس طرح کہ ان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ اطاعت کریں' نافرمانی نہ کریں۔ اسے یاد کریں' فراموش نہ کریں۔ اس کا شکر ادا کریں' ناشکری نہ کریں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کا یہ حق ہے کہ بندہ اپنے نفس سے جہاد کرے تاکہ اس کا قلب' زبان اور تمام جوارح اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو جائیں بلکہ ہمہ تن اللہ تعالیٰ کا ہو جائے اور اپنی ذات کا نہ رہے۔

شیطان کے ساتھ جہاد کی صورت یہ ہے کہ اس کے وعدے کی تکذیب کی جائے۔ اس کے حکم کی نافرمانی کی جائے کیونکہ وہ جھوٹی امیدیں دلاتا اور غلط تمنائیں دکھاتا ہے، محتاجی کی طرف لے جاتا ہے اور خواہشات کی پیروی کراتا ہے۔ بے حیائی کا حکم کرتا ہے اور ہدایت و ایمانی اخلاقیات سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں جہادوں سے بندے کے اندر ایک قوت و ہمت پیدا ہو جائے گی جس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ قلبی' لسانی' مالی اور جسمانی جہاد کر سکے گا جس کا مقصد اعلاء کلمتہ اللہ ہو گا۔

جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں سلف صالحین کی مختلف تعبیرات اور توضیحات وارد ہوئی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جہاد نام ہے پوری قوت صرف کر دینے کا۔ اللہ جل شانہ کے متعلق کسی طرح کی ملامت سے خائف نہ ہو۔ حضرت عبداللہ ابن مبارک فرماتے ہیں کہ نفس اور خواہشات کے ساتھ مقابلے کا نام جہاد ہے۔

اس لئے ان لوگوں کی رائے درست نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ دونوں آیتیں جن میں جہاد اور تقویٰ کے سلسلہ میں "حق تقاتہ" و "حق جہادہ" مذکور ہے منسوخ ہیں کیونکہ بندہ ضعیف اس کا پورا پورا حق ادا نہیں کر سکتا لیکن اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ کماحقہ تقویٰ اور جہاد کرنے کی طاقت ہر شخص کے اندر موجود ہے۔ بندوں کے حالات کے مختلف ہونے سے بھی اس میں اختلاف ہوتا ہے۔ غور کریں کہ کس طرح اس حکم کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے :

﴿ هُوَ ٱجْتَبَىٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى ٱلدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ [الحج : ٧٨]

اسی نے تم کو برگزیدہ بنایا اور دین کے سلسلہ میں تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی۔

آیت میں حرج سے تنگی مراد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ مجھے آسان دین دے کر بھیجا گیا ہے۔ تو دین میں آسانی سے مراد عقیدہ توحید اور عمل میں آسانی مراد ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر دین ' روزی' عفو اور مغفرت کے سلسلے میں بہت زیادہ وسعت سے کام لیا ہے اور جب تک جسم میں جان ہو توبہ کا موقع ہے۔ ہر برائی کا کفارہ ہے۔ حرام کے بدلہ میں حلال چیز ہے۔ ہر تنگی سے پہلے اور بعد میں آسانی ہے' اس لئے اللہ تعالیٰ ایسی تکلیف نہیں دیتا جس کی بندوں کو طاقت نہ ہو۔

فصل (۵۲)

جہاد کے درجات و مراتب

اس وضاحت کے بعد یہ جان لینا چاہیے کہ جہاد کی چار قسمیں ہیں :

(۱) نفس سے جہاد (۲) شیطان سے جہاد (۳) کفار اور منافقین سے جہاد(۴) جہاد ارباب الظلم و المنکرات و البدع۔

(۱) جہاد نفس کے چار درجات ہیں : ایک یہ کہ ہدایت اور دین حق کی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش اور نفس کو اس کی جستجو پر مجبور کیا جائے۔ دوسرے تحصیل علم کے بعد عمل کے لئے نفس پر جبر اور اس سے جہاد کرے۔ تیسرے دعوت حق میں مصروف ہونا ورنہ صاحب حق ان بدبختوں میں گنا جائے گا جو اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت کو چھپاتے ہیں۔ چوتھے دعوت کی راہ میں جو مصائب و آلام پیش آئیں انہیں صبرو شکر کے ساتھ برداشت کرنے کے لئے نفس کو آمادہ کرنا۔ جس خوش نصیب نے جہاد نفس کے یہ چاروں مرحلے کامیابی سے طے کر لئے' ربانی ہوگیا' کیونکہ سلف کا اس بات پر اجماع ہے کہ عالم اس وقت تک عالم ربانی نہیں بن سکتا جب تک حق کو نہ پہچان سکے' اس پر عمل نہ کرے اور دوسرے کو بھی نہ سکھلائے اور اس کی طرف دوسروں کو دعوت نہ دے۔

(۲) شیطان سے جہاد کے دو درجے ہیں : پہلا درجہ یہ ہے کہ شیطان ایمان کے اندر شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے۔ اس معرکہ میں اس سے دست و گریبان ہونا۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ شیطان کی طرف سے جن فاسد ارادوں اور شہوتوں کی تلقین ہوتی ہے' ان کے رد کرنے میں جد و جہد کرنا۔ پہلے درجہ میں کامیابی "یقین" سے حاصل ہوتی ہے اور دوسرے درجہ میں کامرانی "صبر" سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے :

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ﴾

[السجدة : ٢٤]

اور بنا دیئے ہم نے ان میں سے امام جو راہ چلاتے ہمارے حکم سے' کیونکہ انہوں نے صبرو استقامت دکھائی اور یقین کرتے رہے ہماری نشانیوں پر۔

(۳) منافقین و کفار سے جہاد کے بھی چار درجے ہیں : (۱) قلب سے (۲) زبان سے (۳) مال سے (۴) جان سے۔ کفار کے ساتھ جہاد کو ہاتھ کے ساتھ' اور منافقین کے ساتھ جہاد کو زبان کے ساتھ زیادہ تعلق ہے۔

(۴) ظالمین اور اہل بدعت و منکرات سے جہاد کے صرف تین درجے ہیں :

پہلا ہاتھ کے ذریعہ اگر قدرت ہو' دوسرا زبان کے ذریعہ جب کہ پہلی صورت ممکن نہ ہو' تیسرا دل کے ذریعہ جب کہ سابقہ دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں۔

اس طرح مجموعی طور پر جہاد کی تیرہ قسمیں ہوئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جو کوئی جہاد کے بغیر یا کم از کم اس کی تمنا کیے بغیر مرجائے۔ اس کی موت نفاق کے ایک حصہ پر ہوئی"۔

جہاد ہجرت سے مکمل ہوتا ہے اور ہجرت و جہاد دونوں ایمان کے ساتھ صحیح و مکمل ہوتے ہیں۔ جہاد کی ان تمام قسموں کی توفیق صرف انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو رحمت الہٰی کے امیدوار اور قرب باری تعالیٰ کے لئے بے قرار ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَٱلَّذِينَ هَاجَرُوا۟ وَجَٰهَدُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أُو۟لَٰٓئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ ٱللَّهِ ۚ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ [البقرة : ٢١٨]

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں' وہی اللہ کی رحمت کی امید کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

جس طرح ہر شخص پر ایمان فرض ہے' اسی طرح دو طرح کی ہجرتیں ہمہ وقت فرض ہیں۔ ایک ہجرت اللہ کی طرف بذریعہ اخلاص' اور دوسری ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بذریعہ اتباع۔ اسی طرح نفس کے اور شیطان کے ساتھ جہاد بھی فرض عین ہے۔ کوئی بشر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور کوئی کسی کی نیابت نہیں کرسکتا۔ کفار و منافقین سے جہاد کبھی فرض عین ہوتا ہے اور کبھی فرض کفایہ۔ اگر ضرورت کے مطابق لوگ اس میں مشغول رہے تو باقی پر فرض نہیں ہوتا۔

فصل (۵۳)

جہاد میں مومنِ کامل کا امتحان

اللہ تعالیٰ کے نزدیک کامل ترین انسان وہ ہے جو جہاد کی ان تمام قسموں اور مرتبوں میں کامل ترین اترے' پھر کمال کے بھی درجے ہیں۔ بعض معمولی ہیں' بعض بلند ہیں' بعض بلند تر ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ جہاد کی ان سب قسموں میں بلند ترین درجہ حاصل تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ کی نظر میں آپ تمام انسانوں سے افضل و اشرف تھے۔ آپ بعثت کے وقت سے وفات کے دن تک اللہ تعالیٰ کی راہ میں پورا پورا جہاد کرتے رہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی :

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ [المدثر : ۱-٤]

اے چادر پوش' اٹھ اور ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی کر اور کپڑوں کو پاک کر۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت کے لئے فی الفور آمادہ اور کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سونپی ہوئی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دینے لگے۔ لوگوں کو دعوت حق دینے میں شب و روز خاموشی سے اور علی الاعلان مشغول ہو گئے۔ پھر جب آپ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ :

﴿فَٱصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ [الحجر : ٩٤]

جس چیز کا آپ کو حکم ہوا ہے' اسے کھول کر بیان کریں۔

تو اس وقت آپ علانیہ طور پر دعوت دین دینے لگے اور کسی کی ملامت وغیرہ کی پرواہ کئے بغیر اللہ تعالیٰ کے حکم کا اعلان شروع کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے چھوٹے' آزاد و غلام' مرد و عورت' جن و انس ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا اور اس کے دین کی دعوت دے دی۔

کفار نے جب دیکھا کہ ان کے آبائی دین کی برملا مذمت ہو رہی ہے تو غیظ و غضب سے بھر گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پیروان اسلام کو سخت سے سخت تکلیفیں دینے لگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسکین دی کہ گھبرانے اور مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تمام انبیاء کرام کے ساتھ یہی ہوتا

آیا ہے کہ جھٹلائے گئے اور گوناگوں مصائب میں مبتلا کئے گئے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ مَّا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ ﴾ [فصلت : ٤٣]

تمہیں بھی وہی کہا جا رہا ہے جو تم سے پہلے رسولوں کو کہا جا چکا ہے۔

اور ایک جگہ فرمایا :

﴿ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ ﴾ [الأنعام : ١١٢]

اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن بنائے انسان اور جن کے شیاطین سے۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا :

﴿ كَذَٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝ أَتَوَاصَوْا بِهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ﴾ [الذاريات : ٥٢-٥٣]

اسی طرح جب ان سے پہلوں کے پاس رسول پہنچا تو انہوں نے اسے یا تو ساحر بتایا یا مجنون کہا' کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے بلکہ وہ سرکش قوم ہے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی اور بتایا کہ گذشتہ انبیاء کرام کی زندگی میں آپ کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے نمونہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

﴿ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ﴾

[البقرة : ٢١٤]

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں (اسی طرح) داخل ہو جاؤ گے' جب کہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گذرے جو پہلے لوگوں پر گذرے تھے۔

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ الٓمٓ ۝ أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ﴾ [العنكبوت : ١-٢]

کیا لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ انہیں ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔

اور فرمایا :

﴿ أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ﴾ [العنكبوت : ١٠]

کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے۔

انسان کو چاہیے کہ ان آیات کا سیاق اور ان میں بیان کردہ احکام اور عبرتوں کے خزانے دیکھے کیونکہ جب انسان کی طرف انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث کیا گیا تو دو باتیں کھل کر سامنے آگئیں۔ ایک یہ کہ کسی نے کہا ہم ایمان لائے اور کسی نے کہا ہم ایمان نہیں لائے' بلکہ وہ کفر اور برائیوں پر جم گئے۔ اب جس نے آمنا کہا (کہ ہم ایمان لائے) پروردگار نے اس کا امتحان لیا' اس کی آزمائش کی' کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنے کے لئے اسے فتنوں میں مبتلا کر دیا اور جس نے کفر اور انکار کیا' وہ یہ نہ سمجھ لے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز کر دے گا اور اس پر سبقت لے جائے گا۔ جو شخص رسولوں پر ایمان لائے گا' اسے دشمنوں کی طرف سے مخالفت اور تکلیف کا سامنا کرنا ہو گا اور اس طرح اس کی آزمائش ہو گی لیکن جو ان کی اطاعت نہیں کرے گا' اسے دنیا و آخرت میں سزا ملے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو تکلیف کا سامنا کرنا ضروری ہے۔ فرق یہ ہے کہ مومن کو ابتداء میں تکلیف ہو گی پھر دنیا و آخرت دونوں جگہ اچھا نتیجہ سامنے آئے گا' اور ایمان سے منہ پھیرنے والے کو شروع میں لذت ملے گی' پھر اسے دائمی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ انسان کے لئے کیا بات بہتر ہے' وہ سطوت حاصل کرے یا ابتلاء میں رہے۔ آپ نے فرمایا' تب تک اسے تسلط حاصل نہ ہو گا جب تک کہ اس امتحان (ابتلاء) میں نہ پڑ جائے۔

اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے اولوالعزم انبیاء کرام کو ابتلاء میں ڈالا' آخر جب انہوں نے صبر کیا تو انہیں سطوت حاصل ہوئی۔ اس لئے کوئی بھی یہ خیال نہ کرے کہ وہ دکھوں سے ضرور ہی محفوظ رہے گا۔ مصائب اور آلام میں مبتلا لوگوں کی عقلوں میں بھی تفاوت ہے۔ سب سے بڑا عقلمند وہ ہے جس نے تھوڑے سے ختم ہو جانے والے دکھ کے عوض طویل ترین اور دائمی دکھ کو بیچ دیا' اور سب سے بڑا بدبخت وہ ہے کہ جس نے طویل ترین اور دائمی دکھ مول لے کر تھوڑا سا ختم ہو جانے والا دکھ بیچ دیا۔

اگر یہ سوال ہو کہ انسان ایسی صورت کیوں پسند کرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نقد اور ادھار کا معاملہ ہے' نفس ہمیشہ سامنے کی چیز پر جاتا ہے۔ ارشاد باری ہے :

﴿ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ﴾ [القيامة : ٢٠، ٢١]

ہرگز نہیں بلکہ تم عجلت والی چیز کو پسند کرتے ہو اور آخرت کی چیز کو چھوڑ دیتے ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

﴿ إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّونَ ٱلْعَاجِلَةَ ﴾ [الدهر: ٢٧]

یہ لوگ فوری ملنے والی چیز کو پسند کرتے ہیں۔

ایسا ہر شخص کو پیش آتا ہے' اس لئے کہ انسان کو دوسروں کے ساتھ زندگی گذارنا پڑتی ہے اور وہ اس سے اپنے ارادوں کی موافقت چاہتے ہیں اور جب وہ ایسا نہیں کرتا تو اسے عذاب اور تکلیف دیتے ہیں۔ اور اگر وہ ان کی مرضی کا ساتھ دیتا ہے تو خود عذاب اور تکلیف محسوس کرتا ہے۔ کبھی ان کی طرف سے کبھی دوسروں کی طرف سے' جس طرح کہ کوئی دین دار اور متقی آدمی فاسقوں اور فاجروں کے درمیان آجائے جو اس کی موافقت کے بغیر فسق و فجور نہ کر سکیں۔ اب اگر وہ موافقت کرے تو ابتداء میں ان کے شر سے محفوظ رہے گا' پھر وہ لوگ اس کے ساتھ توہین و تکلیف کا وہی معاملہ شروع کر دیں گے۔ جس سے بچنے کے لئے اس نے ابتداء میں ان کی موافقت کی تھی اور اگر توہین کا یہ معاملہ وہ خود نہ کریں گے تو کوئی دوسرا ایسا کرے گا۔

اس لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول پر عمل کیا جائے جسے انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا' لوگوں کو ناراض کرکے جو اللہ کو خوش کرے گا اس کی کفایت اللہ تعالیٰ کرے گا' اور جو اللہ کو ناراض کرکے لوگوں کو خوش کرے گا' اسے وہ کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ دنیا کے احوال پر غور کرنے سے ان لوگوں میں اس کی بکثرت مثالیں ملیں گی جو لوگ حکمرانوں اور اہل بدعت کی مدد ان کی سزاؤں سے بچنے کے لئے کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نفس کے شرور و فتن سے بچا لے گا وہ شخص حرام کی موافقت نہ کرکے ان کے ظلم و ستم کو صبر و استقامت سے سہے گا اور دنیا و آخرت میں اچھے انجام سے نوازا جائے گا' جس طرح کہ علمائے کرام اور ان کے پیروکار اچھے انجام کے مستحق ہوئے۔ چونکہ مصائب و آلام سے پوری طرح چھٹکارا ممکن نہ تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تسلی دی' جنہوں نے دائمی اور بڑی تکلیف کے بدلے میں معمولی اور عارضی تکلیف کو اختیار کیا' چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ مَن كَانَ يَرْجُوا۟ لِقَآءَ ٱللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ ٱللَّهِ لَءَاتٍ ۚ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ﴾ [العنکبوت: ٥]

جو اللہ سے ملنے کی امید رکھے تو اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے والا ہے اور وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

یعنی عارضی تکلیف کا ایک وقت ہے جو اللہ کی ملاقات سے ختم ہو جائے گا اور اس سے بندہ کو بے

حساب لذت حاصل ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے بندہ کو اس ملاقات کی انتہائی قوی امید دلائی ہے تاکہ اس کے شوق میں بندہ یہاں کی تکلیف کو برداشت کرلے' بلکہ بعض لوگوں کو تو اس کا اشتیاق اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ تکلیف کا احساس نہیں کرپاتے۔

اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اس کی ملاقات کے شوق کا سوال کیا' اور یہ شوق و ذوق بڑی نعمتوں میں سے ہے' لیکن اس نعمت کے لئے بطور سبب کچھ اقوال و اعمال ہیں جن سے اس نعمت کا حصول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اقوال کو سنتا اور اعمال کو جانتا ہے۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس نعمت کا اہل کون ہے' چنانچہ ارشاد ہے :

﴿ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ ﴾ [الأنعام: ٥٣]

اسی طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمایا۔

لہٰذا جب بندہ سے کوئی نعمت فوت ہو جائے تو اسے اپنے لئے یہ آیت پڑھنا چاہیے :

﴿ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ ﴾ [الأنعام: ٥٣]

کیا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو جانتا نہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ایک دوسری تسلی یہ دی کہ اللہ کی راہ میں ان کا جہاد ان کے لئے ہے ورنہ اللہ دنیا والوں سے بے نیاز ہے' اس طرح جہاد کا فائدہ خود بندوں کو حاصل ہوتا ہے پھر بتایا کہ اس جہاد کی وجہ سے ان کو صالحین کی جماعت میں شامل کرے گا۔ مزید اس شخص کا حال بتایا جو بغیر بصیرت کے ایمان میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص لوگوں کی طرف سے پہنچائی جانے والی تکلیف کو اللہ کے اس عذاب کی طرح سمجھتا ہے جس سے بچنے کے لئے مومن ایمان لاتا ہے پھر جب اللہ تعالیٰ اپنے لوگوں کی مدد کرتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میں تو تمہارے ہی ساتھ ہوں' حالانکہ اس کے سینہ میں نفاق چھپا ہوا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے۔

الغرض اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ لوگوں کا ضرور امتحان لے تاکہ اس کے ذریعہ پاک اور ناپاک کا امتیاز ہو جائے' کیونکہ نفس اصل کے لحاظ سے جاہل اور ظالم ہے اور ظلم و جہالت کے باعث اسے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کی صفائی کی جائے۔ اگر اس گھر سے صفائی و طہارت کے ساتھ نکلا تو ٹھیک ہے' ورنہ جہنم کی بھٹی میں جانا پڑے گا اور جب بندہ وہاں پاک و صاف ہو جائے گا تو اسے جنت میں داخلہ کی اجازت مل جائے گی۔

فصل (۵۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قبول اسلام

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی طرف دعوت دی تو ہر قبیلہ سے لوگوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا' چنانچہ اس میدان میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سب پر سبقت حاصل کی اور اللہ کے دین کو پھیلانے میں بھرپور حصہ لیا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دین اسلام کی دعوت و تبلیغ میں مکمل طور پر تعاون کیا اور آپ ہی کی دعوت سے حضرت عثمان' طلحہ اور سعد رضی اللہ عنہم مشرف بہ اسلام ہوئے۔اسی طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اسلام قبول کرنے میں سبقت لے گئیں اور صدیقانہ صفات کی حامل ہوئیں اور اس کی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ مجھے ڈر محسوس ہو رہا ہے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا : "آپ مطمئن رہیں 'اللہ کی قسم اللہ کبھی آپ کو رسوا نہیں کرے گا"۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات حسنہ سے استدلال کیا تھا کہ ایسی صفات کے حامل کو اللہ تعالیٰ رسوا نہیں کر سکتا۔ انہوں نے فطرت سلیمہ اور غیر معمولی فہم و فراست سے یہ جان لیا کہ اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و احسان کے مناسب ہے اور ذلت و رسوائی اس کے شایان شان نہیں۔ ایسی فراست کاملہ اور فطرت سلیمہ کے باعث وہ اس بات کی مستحق ہوئیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت جبریل اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہدیہ سلام ارسال فرمایا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آٹھ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ ایک قول میں آپ کی عمر زیادہ مروی ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر کفالت تھے۔ انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے قحط سالی میں مدد کی غرض سے اپنی کفالت و تربیت میں لے لیا تھا۔

حضرت زید بن حارثہ نے بھی اسلام قبول کیا۔ یہ حضرت خدیجہ کے غلام تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم نے جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو انہوں نے حضرت زید کو آپ کی خدمت میں ہبہ کر دیا۔ ان کے والد اور چچا جب فدیہ دے کر ان کی آزادی کے لئے حاضر ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اس سلسلہ میں کوئی اور چیز نہ کرلیں۔ انہوں نے کہا' وہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ زید کو بلا کر اختیار دے دو۔ اگر وہ تمہیں اختیار کرلے تو تمہارا ہے اور اگر مجھے اختیار کرلے تو میرے پاس رہ جائے تو ان لوگوں نے کہا کہ یہ بہت عدل و انصاف کی بات ہے' چنانچہ انہیں بلایا گیا اور انہیں اس بات سے مطلع کیا گیا تو انہوں نے عرض کیا' میں کبھی بھی آپ کے علاوہ کسی اور کو اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ دونوں کہنے لگے' اے زید تعجب کی بات ہے' تمہارا ناس ہو' غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتے ہو اور اپنے گھر والوں کے بجائے دوسروں کو اختیار کر رہے ہو تو حضرت زید نے فرمایا' ہاں میں نے آپ کی شخصیت میں ایسی خوبی دیکھی ہے اور اپنے ساتھ ایسا حسن سلوک اور برتاؤ دیکھا کہ اس کے بعد کسی اور کو آپ پر ترجیح نہیں دے سکتا۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاملہ دیکھا تو آپ نے ان کے سامنے مقام حجر میں اعلان کر دیا کہ "میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ زید میرے بیٹے ہیں' میں ان کا وارث اور وہ میرے وارث ہیں"۔ جب ان کے والد اور چچا نے یہ منظر دیکھا تو دونوں بہت خوش ہوئے اور واپس چلے گئے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت زید' زید بن محمد کے نام سے مشہور ہو گئے اور پھر جب دین اسلام آیا اور قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی :

﴿ ٱدْعُوهُمْ لِآبَآئِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ ٱللَّهِ ﴾ [الأحزاب : ٥]

لوگوں کو ان کے باپ کے نام سے پکارا کرو' یہ اللہ کی نظر میں زیادہ درست ہے۔

تو اس وقت سے لوگ انہیں زید بن حارثہ کہنے لگے۔ معمر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ زید سے پہلے ہمیں کسی کے اسلام کا علم نہیں۔

ورقہ بن نوفل بھی مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خواب میں اچھی حالت میں دیکھا تھا۔

آخر لوگ ایک ایک کرکے دین میں داخل ہونے لگے اور قریش نے اس کی مخالفت نہ کی۔ آخر جب آپ نے ان کے بناوٹی خداؤں کا پردہ چاک کیا کہ یہ نفع و نقصان کے مالک نہیں تو یہ لوگ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کے چچا ابو طالب کے ذریعہ حفاظت فرمائی جو قریش کے ایک شریف سردار تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ ابو طالب اپنے مذہب پر باقی رہیں۔ اس کے فوائد غور کرنے سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ حالت تھی کہ جو صاحب خاندان ہوتا' وہ خاندان کے باعث مشرکوں کی ایذاؤں سے محفوظ رہتا ورنہ نہیں۔ چنانچہ بہت سے صحابہ کرام کو مشرکین مکہ سے مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا جن میں سے حضرت عمار بن یاسر' ان کی والدہ اور ان کے اہل خاندان ہیں جنہیں شدید ترین ایذائیں دی گئیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گذر ہوتا تو آپ فرماتے "اے آل یاسر! صبر کرو کیونکہ تم سے جنت کا وعدہ ہے"۔

ایذائیں دیئے جانے والوں میں حضرت بلال بھی تھے۔ انہیں اللہ کے راستے میں سخت ترین ایذائیں دی گئیں اور وہ اللہ کے دین کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر چکے تھے۔ جوں جوں تکلیف زیادہ دی جاتی' ان کے منہ سے "احد احد" نکلتا تھا۔ ورقہ بن نوفل وہاں سے گذرتے تو کہتے کہ ہاں اللہ کی قسم اے بلال! ایک ہی (اللہ) ہے' ایک ہی (اللہ) ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تم انہیں مار ڈالو گے تو میں ان پر گریہ و زاری کروں گا۔

جب مسلمانوں کے خلاف کفار کی ایذائیں سخت ترین ہو گئیں اور انہیں طرح طرح کے دکھ و درد دیئے جانے لگے اور ان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جانے لگے' اور شدید ترین شرور و فتن سے دوچار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ملک حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی۔ پہلے مہاجرین میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے لوگ جن کی مجموعی تعداد سولہ افراد پر مشتمل تھی جن میں بارہ مرد اور چار عورتیں تھیں۔

یہ لوگ مکہ سے خفیہ حالت میں نکلے اور جب سمندر کے ساحل پر پہنچے تو اتفاق سے انہیں دو کشتیاں مل گئیں' جن پر یہ لوگ سوار ہو کر حبشہ پہنچے۔ ان لوگوں نے بعثت کے پانچویں سال رجب کے مہینے میں ہجرت کی تھی۔ ان کے تعاقب میں قریش نکل کھڑے ہوئے اور ساحل تک آئے لیکن ان میں سے کسی کو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کچھ عرصے کے بعد ان مہاجرین کو اطلاع ہوئی کہ قریش مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء رسانی سے باز آ گئے ہیں۔ یہ سن کر وہ لوگ لوٹ پڑے۔ جب یہ لوگ مکہ سے صرف ایک گھنٹے کے فاصلے پر تھے تو خبر ملی کہ قریش مکہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء رسانی میں

اور زیادہ شدت سے کام لے رہے ہیں اور انکی عداوت و مخالفت شباب پر ہے' چنانچہ ان میں سے بعض پناہ لے کر مکہ میں داخل ہوگئے جن میں حضرت عبداللہ بن مسعود بھی تھے۔ یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ آپ نے نماز کی حالت میں ہونے کی وجہ سے سلام کا جواب نہیں دیا۔ یہی صحیح ہے اور ابن اسحاق نے یہی کہا ہے کہ جب مکہ سے قریب پہنچے اور انہیں معلوم ہوا کہ پہلی خبر غلط تھی' پھر حمایت کے سہارے یا خفیہ طور پر وہ مکہ میں داخل ہوئے۔ واپس آنے والوں میں حضرت ابن مسعود بھی تھے جو مدینہ ہجرت کرنے تک مکہ ہی میں مقیم رہے' پھر بدر اور احد میں شریک ہوئے۔ رہی زید بن ارقم کی حدیث (جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں بات چیت کی ممانعت مدینہ کا واقعہ ہے) تو اس کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے۔

اول یہ کہ ممانعت مکہ میں ہوئی تھی۔ پھر مدینہ میں اجازت مل گئی تھی اور پھر اس کے بعد منع کیا گیا۔

دوم یہ ہے کہ زید چھوٹے صحابیوں میں سے تھے۔ یہ اور دوسرے ساتھی اپنی عادت کے مطابق نماز میں بولتے تھے کیونکہ انہیں ممانعت کا علم نہ تھا پھر جب علم ہوا تو انہوں نے بھی بات چیت بند کردی۔

پھر جب حبشہ سے واپس آنے والوں اور دیگر مسلمانوں پر ظلم و ستم و تشدد کا سلسلہ مزید شدید ترین ہوگیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دوبارہ سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم فرمایا۔

دوسری مرتبہ ان لوگوں کی ہجرت حبشہ' قریش کو مزید گراں گذری تو انہوں نے ایذاء رسانی کا سلسلہ اور سخت کردیا اور مسلمان مزید ہدف ظلم و ستم بنائے جانے لگے۔ خصوصا جب قریش کو نجاشی کے حسن سلوک کی خبر ملی۔ دوسری مرتبہ جن لوگوں نے ہجرت کی' ان کی تعداد تراسی (۸۳) مردوں پر مشتمل تھی۔ اگر اس ضمن میں حضرت عمار بن یاسر شمار کئے جائیں تو اس قافلہ میں انیس عورتیں شامل تھیں۔ ان میں حضرت عثمان اور کچھ دوسرے بدری صحابہ کا بھی نام شمار کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک گمان ہے یا پھر یہ کہا جائے کہ وہ بدر سے پہلے ایک بار اور حبشہ سے آئے تھے۔ اس طرح ان کا آنا تین مرتبہ میں ہوگا۔

اسی وجہ سے ابن سعد نے کہا ہے کہ ان لوگوں نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی خبر سنی تو ان میں سے ۳۳ مرد اور آٹھ عورتیں واپس آگئیں جن میں دو مرد مکہ ہی میں انتقال کر گئے اور سات مکہ ہی میں قید کر لئے گئے اور ۲۴ غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔

ماہ ربیع الاول ۷ ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن امیہ کے ذریعہ نجاشی کو خط بھیجا جس میں انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور کہا اگر میں حاضر ہونے پر قادر ہوتا تو

ضرور خدمت میں حاضری دیتا اور آپ نے حضرت نجاشی کو یہ بھی لکھا کہ حضرت ام حبیبہ کو آپ کی زوجیت میں دے دیں' یہ اپنے شوہر عبداللہ بن جحش کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ گئی تھیں اور انہوں نے وہاں عیسائیت کو قبول کر لیا تھا اور اسی حالت میں انتقال کر گئے' چنانچہ حضرت نجاشی نے ان کو آپ کی زوجیت میں دے دیا اور آپ کی طرف سے چار سو دینار مہر کی ادائیگی کر دی۔ حضرت خالد بن سعید بن العاص اس نکاح کے ولی تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نجاشی کو یہ بھی لکھا تھا کہ جو صحابہ وہاں باقی رہ گئے ہیں' انہیں سواری کا انتظام کر کے مدینہ بھیج دیں۔ حضرت نجاشی نے عمرو ابن امیہ کے ساتھ تمام لوگوں کو کشتیوں میں بھیج دیا۔ جب یہ لوگ خیبر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو وہ فتح ہو چکا تھا۔

اس طرح وہ اشکال بھی ختم ہو جاتا ہے جو حضرت ابن مسعود اور زید بن ارقم کی حدیثوں کے مابین نظر آتا ہے اور یہ سمجھا جائے گا کہ نماز میں بولنے کی ممانعت مدینہ میں ہوئی تھی۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ تطبیق اچھی ہے لیکن ابن اسحاق کے اس بیان کا کیا جواب ہو گا جس میں یہ وضاحت ہے کہ حضرت ابن مسعود مکہ میں تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ ابن سعد نے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ مکہ میں تھوڑے دن مقیم تھے پھر حبشہ واپس چلے گئے تھے۔ یہی زیادہ ظاہر ہے' کیونکہ مکہ میں ان کا کوئی محافظ و مددگار نہ تھا۔

اس توجیہ میں جو بات ہے' وہ ابن اسحاق پر واضح نہیں ہو سکی اور ابن اسحاق نے روایت کرنے والوں کا نام نہیں ذکر کیا ہے لیکن ابن سعد نے اسے مطلب بن عبداللہ بن حنطب کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس طرح دونوں روایتوں کا اشکال دور ہو جائے گا اور صحیح مفہوم واضح ہو جائے گا۔ والحمدللہ!

ابن اسحاق نے اس ہجرت میں ابو موسی اشعری کا نام بھی لیا ہے لیکن واقدی وغیرہ نے اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ کس طرح یہ بات ابن اسحاق سے مخفی رہ گئی۔ میری توجیہ یہ ہے کہ یہ بات مخفی نہیں تھی لیکن مذکورہ وہم اس طرح پیدا ہوا کہ ابو موسی یمن سے ہجرت کر کے حضرت جعفر اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ حبشہ چلے گئے تھے اور انہی کے ساتھ واپس آئے۔ اس کو ابن اسحاق نے ان کی ہجرت شمار کر لیا ہے لیکن انہوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے گئے تھے کہ ان کی تردید کی جائے۔

فصل (۵۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء رسانی اور سفر طائف

مہاجرین حبشہ نجاشی کی سلطنت میں اطمینان و سکون سے رہنے لگے تھے لیکن قریش نے انہیں مکہ واپس بلانے کی غرض سے عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص کو تحفہ و تحائف دے کر نجاشی کی طرف بھیجا اور انہوں نے وہاں بڑے بڑے دینی قائدین سے بھی سفارش کرائی' لیکن نجاشی نے ان کی واپسی کا انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے یہ سازش اور ریشہ دوانی کر کے بھکانا چاہا کہ یہ لوگ حضرت عیسی علیہ السلام کے متعلق گستاخانہ عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے تھے' چنانچہ اس نے ان مسلمانوں کو دربار میں بلوایا۔ حضرت جعفر بن ابی طالب ان کے سربراہ تھے' جب ان لوگوں نے داخل ہونے کا ارادہ کیا تو حضرت جعفر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی جماعت آپ سے اجازت چاہتی ہے۔ اس نے دربان سے کہا کہ ان سے کہو کہ یہ لوگ اپنی درخواست پھر دہرائیں۔ انہوں نے دوبارہ اسی طرح عرض کیا' پھر جب یہ جماعت ان کے دربار میں داخل ہوئی تو اس نے دریافت کیا' آپ لوگ حضرت عیسی کے متعلق کیا کہتے ہیں تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم کی ابتدائی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ اس پر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہنے لگا کہ بخدا حضرت عیسی علیہ السلام اس سے ایک تنکا بھی زیادہ نہ تھے۔ پادریوں نے اس پر اظہار حیرت کیا تو ان سے کہا کہ تم جو کچھ بھی کہو میرا یہی قول ہے اور مسلمانوں سے کہا کہ جاؤ تم لوگ میری سلطنت میں مامون و محفوظ ہو' جو تمہیں ایذاء دے گا' اس کو سزا دی جائے گی۔ پھر وہ قریش کے دونوں قاصدوں سے کہنے لگا کہ اگر تم مجھے سونے کا گرجا بلکہ پہاڑ بھی دے دو پھر بھی میں مسلمانوں کو تمہارے حوالے نہ کروں گا۔ اس کے بعد اس نے سرداران قریش کے تحائف لوٹا دینے کا حکم دیا۔ آخر یہ لوگ رسوا ہو کر واپس آئے۔

پھر حضرت حمزہ اور ایک بڑی جماعت نے اسلام قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ اسلام پھیلنا شروع ہو گیا۔ جب قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کو ترقی پذیر دیکھا اور محسوس کیا کہ یہ کام بڑھ رہا

ہے اور ان کی حیثیت مضبوط ہو رہی ہے تو انہوں نے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے خلاف ایک معاہدہ طے کیا جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ نہ ان کے ساتھ خرید و فروخت کریں گے' نہ شادی بیاہ کریں گے اور نہ کسی قسم کے معاملات و تعلقات قائم کریں گے' جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے نہ کردیں گے۔

چنانچہ انہوں نے ایک عہد نامہ خانہ کعبہ کی چھت پر لٹکا دیا۔ اسے بغیض بن عامر بن ہاشم نامی ایک شخص نے لکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے بددعا کی جس سے اس کا ہاتھ شل ہوگیا تھا۔

اس معاہدہ کی رو سے ابولہب کے علاوہ بنوہاشم اور بنو عبدالمطلب کے تمام افراد کا خواہ وہ مومن ہوں یا کافر' اس طرح بائیکاٹ ہوا تھا کہ سب لوگ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ ابولہب اس سازش میں قریش کے ساتھ شریک کار تھا۔

یہ واقعہ بعثت کے ساتویں سال محرم کی رات پیش آیا تھا۔ تمام لوگ تقریباً تین سال تنگی و دشواری میں رہے تھے۔ مصیبت کا یہ عالم تھا کہ بچوں کے گریہ و زاری کی آواز گھاٹی کے باہر سے سنائی دیتی تھی۔ اس موقع پر ابو طالب نے اپنا مشہور قصیدہ لامیہ لکھا تھا۔ قریش کے بعض لوگ اس بائیکاٹ کو ناپسند کرتے تھے اور کچھ لوگ پوری طرح موید تھے' جو لوگ ناپسند کر رہے تھے' انہوں نے اس عہد نامہ کو ختم کرنے کی کوشش بھی کی اور وہ اس کو توڑنے کا مطالبہ بھی کر رہے تھے۔

اس کے دوران اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عہد نامہ کے متعلق آگاہ فرما دیا کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے دیمک بھیجی ہے' جس نے ظلم' قطع تعلق' اور ستم رسائی کی باتیں چاٹ ڈالیں اور صرف اللہ کا نام مبارک باقی رہنے دیا۔ آپ نے اپنے چچا کو اس کی خبر دی کہ وہ قریش کے پاس جا کر ان سے کہیں کہ اگر میرے بھتیجے کی یہ بات غلط ثابت ہو جائے تو ہم تمہارے اور ان کے درمیان سے ہٹ جائیں گے' اور اگر ان کی خبر صحیح ثابت ہو جائے تو تمہیں رجوع کرنا پڑے گا۔ ان لوگوں نے کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں' پھر اس عہد نامہ کو اتار کر دیکھا تو درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صحیح ثابت ہوا لیکن اس سے کفار کے کفر و عناد میں اور اضافہ ہوگیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء اس گھاٹی سے نکل آئے ۔ اس کے چھ ماہ بعد ابوطالب نے وفات پائی اور اس کے تین دن بعد ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی انتقال فرما گئیں۔ ان دونوں حادثوں سے آپ کو شدید

صدمہ پہنچا اور قریش کے اوباشوں سے سخت ترین ایذاؤں کا پھر لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور ظلم و ستم کے نت نئے پہاڑ توڑے جانے لگے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لے گئے تاکہ اہل طائف کو دعوت اسلام دیں اور وہ لوگ آپ کے ساتھ مدد و تعاون کا معاملہ کریں۔ آپ نے انہیں اللہ کی طرف بلایا لیکن ان میں سے کسی نے بھی دعوت اسلام پر لبیک نہ کہا اور نہ کوئی آپ کا حامی و مددگار نکلا' بلکہ اس کے برعکس سخت تکلیفیں پہنچائیں اور اس سلسلہ میں قریش سے بھی زیادہ ایذائیں دیں اور ان سے بڑھ کر بدسلوکی کی۔ آپ کے غلام زید بن حارثہ آپ کے ساتھ تھے۔ آپ وہاں دس دن قیام کرنے کے بعد سرداران طائف کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو اسلام کی دعوت دی مگر ان لوگوں نے جواب دیا کہ آپ ہمارے شہر سے نکل جائیں۔ انہوں نے غنڈوں اور اوباشوں کو آپ کے خلاف اکسایا اور پیچھے لگا دیا۔ وہ آپ پر پتھر پھینکتے تھے یہاں تک کہ آپ کے پائے مبارک لہولہان ہو گئے۔ حضرت زید بھی آپ کو بچانے میں سخت زخمی ہو گئے' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی حزین و غمزدہ ہو کر مکہ تشریف لائے۔ واپسی میں یہ مشہور دعا فرمائی :

«اللَّهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُوْ ضَعْفَ قُوَّتِي وَقِلَّةَ حِيْلَتِي وَهَوَانِي عَلَى النَّاسِ»

اے اللہ میں اپنی کمزوری' بے سروسامانی اور لوگوں کی نظر میں بے وقعتی کا تجھ سے شکوہ کرتا ہوں۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے فرشتے کو بھیجا۔ جس نے آکر پوچھا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں تو میں ان سب کو مکہ کے اردگرد کے دونوں پہاڑوں کے مابین دبا دوں' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان کے معاملہ میں اس امید پر توقف کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سے ایسی نسل پیدا کرے گا جو اس کی عبادت کرے گی اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے گی۔

واپسی پر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کھجور کے جھرمٹ کے پاس اترے تو رات کی نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس اثناء میں جنات کی ایک چھوٹی سی جماعت آپ کی طرف آئی اور آپ کی تلاوت سننے لگی۔ آپ کو اس کی اطلاع اس وقت ہوئی جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی :

﴿وَإِذْ صَرَفْنَآ إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ ٱلْجِنِّ﴾ [الأحقاف : ٢٩]

اور جب ہم نے آپ کے پاس چند جنوں کو بھیجا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز یہیں قیام فرمایا۔ حضرت زید نے آپ سے کہا کہ قریش کے

پاس آپ کس طرح جائیں گے جب کہ انہوں نے آپ کو نکال دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ زید جو مصیبت تم دیکھ رہے ہو اسے اللہ تعالیٰ ضرور دور کرے گا۔ وہ اپنے دین کی مدد کرے گا اور اپنے نبی کو غالب کردے گا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پہنچ گئے چنانچہ آپ نے بنی خزاعہ کا ایک آدمی مطعم بن عدی کے پاس بھیجا کہ کیا میں تمہارے جوار میں داخل ہو جاؤں۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں ضرور آپ ہماری پناہ میں آسکتے ہیں۔ اور اس نے اپنی قوم اور بیٹوں کو بلا کر کہا کہ ہتھیار لے لو اور خانہ کعبہ کے ارکان کے پاس جاکر کھڑے ہو جاؤ کیونکہ ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دے دی ہے' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوئے اور مسجد حرام تک تشریف لے گئے۔

مطعم نے اپنی سواری پر کھڑے ہو کر پکارا' اے قریش کے لوگو' میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دے دی ہے۔ اس لئے تم میں سے کوئی بھی ان کی اہانت اور برائی نہ کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رکن کے پاس پہنچے تو اس کو چھوا اور دو رکعت نماز ادا فرمائی پھر گھر تشریف لے گئے۔ مطعم اور اس کے بیٹے ہتھیار لئے ہوئے گھر تک آپ کے ساتھ گئے۔

فصل (۵۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا واقعہ

مسجد حرام سے لے کر بیت المقدس تک براق پر سوار ہو کر حضرت جبریل کی رفاقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جسمانی سیر کرائی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں اترے اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو امام بن کر نماز پڑھائی اور مسجد اقصی کے دروازے پر براق کو باندھ دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ بیت لحم میں اترے اور وہاں نماز پڑھائی لیکن یہ قول درست نہیں ہے۔

پھر اسی رات بیت المقدس سے آسمان دنیا کی طرف تشریف لے گئے۔ حضرت جبریل نے آپ کے لئے اجازت چاہی۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ وہاں آپ نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کی۔ انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر خوش آمدید کہا اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دکھایا کہ ان کی اولاد میں نیک لوگوں کی روحیں ان کے دائیں اور برے لوگوں کی بائیں جانب ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے آسمان پر لے جایا گیا جہاں آپ نے حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو دیکھا پھر تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام کو' چوتھے پر حضرت ادریس علیہ السلام کو' پانچویں پر حضرت ہارون علیہ السلام کو اور چھٹے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ جب حضرت موسیٰ سے آگے بڑھے تو وہ رونے لگے۔ پوچھا گیا' کیوں روتے ہیں' وہ فرمانے لگے کہ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ میرے بعد ایک جوان کو نبی بنایا گیا اور اس کی امت میری امت سے بہت زیادہ تعداد میں جنت میں داخل ہوگی۔ پھر ساتویں آسمان پر تشریف لے گئے' وہاں آپ کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سدرۃ المنتہیٰ اور بیت المعمور تک اٹھا لیا گیا اور اس کے بعد آپ کو اللہ جل شانہ کی جناب اعلیٰ میں لے جایا گیا۔ آپ اللہ تبارک و تعالیٰ کے قریب ہو گئے' حتیٰ کہ دو کمان یا اس سے بھی کم فرق رہ گیا۔ پھر اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو چاہا وحی بھیجی۔

آپ پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں چنانچہ آپ لوٹے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے

گذرے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کیا حکم ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' پچاس نمازوں کا۔ وہ کہنے لگے آپ کی امت کو اس کی استطاعت نہ ہوگی۔ آپ اپنے پروردگار کے پاس واپس جائیے اور اپنی امت کے لئے تخفیف کی درخواست کیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف التفات فرمایا گویا ان سے مشورہ چاہتے ہوں۔ انہوں نے بھی اشارہ کیا کہ ہاں اگر آپ کی خواہش ہو۔ آخر آپ جبریل علیہ السلام کے ساتھ دوبارہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوئے اور وہیں کھڑے رہے۔ یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں معاف فرمادیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اترے یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرے اور انہیں خبردی۔ انہوں نے فرمایا کہ اپنے پروردگار کے حضور پھر جائیے اور تخفیف کی درخواست کیجئے۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان آتے جاتے رہے' یہاں تک کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔ حضرت موسیٰ نے اب بھی واپس جانے اور تخفیف کی درخواست کرنے کا مشورہ دیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے بلکہ اب تو میں راضی ہو گیا اور سر تسلیم خم کر دیا ہے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلے تو نداء کرنے والے نے نداء کی اور کہا کہ میں نے اپنا فریضہ انجام دیدیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کردی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے اس رات اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا یا نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے باری تعالیٰ کو دیکھا۔ ایک قول یہ بھی ان سے منقول ہے کہ قلب سے دیکھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا انکار بھی ثابت ہے۔ ان دونوں نے فرمایا ہے کہ ﴿وَلَقَدْ رَءَاهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ﴾ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو آپ نے فرمایا' میں نے ایک نور دیکھا ہے یعنی میرے اور اس کی رویت کے درمیان ایک نور حائل ہو گیا جیسا کہ دوسری روایت میں ہے کہ میں نے نور دیکھا۔

عثمان بن سعید دارمی نے عدم رویت پر صحابہ کا اتفاق نقل کیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور قلب سے دیکھا' آپس میں متضاد نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

میں نے اپنے رب تعالیٰ کو دیکھا لیکن یہ واقعہ شب معراج کا نہیں بلکہ یہ واقعہ مدینہ میں پیش آیا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صبح کی نماز قضا ہو گئی پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کی خواب میں زیارت کی خبر دی۔

اس بنا پر امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الحقیقت دیکھا اور رویت انبیاء حق ہے اور امام احمد نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ نے دو آنکھوں سے بیداری میں دیکھا اور جس نے ان سے ایسا قول نقل کیا ہے' اسے غلط فہمی ہوئی' چونکہ امام احمد نے ایک بار فرمایا کہ آپ نے دیکھا اور ایک بار فرمایا کہ آپ نے روحانی طور پر دیکھا تو اس سے دونوں قول منقول ہو گئے۔ امام احمد سے ایک تیسرا قول بھی منقول ہے کہ آپ نے سر کی آنکھوں سے دیکھا لیکن یہ ان کے بعض اصحاب کے تصرف کا نتیجہ ہے۔ امام احمد کے نصوص موجود ہیں لیکن ان میں یہ قول نہیں ملتا۔ رہا ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ دل سے دو مرتبہ دیکھا تھا اگر ان کا اس استدلال اس آیت سے ہے:

﴿ مَا كَذَبَ ٱلْفُؤَادُ مَا رَأَىٰٓ ﴾ [النجم : ١١]

جو کچھ اس نے دیکھا' اسے دل نے جھوٹ نہ سمجھا۔

پھر فرمایا :

﴿ وَلَقَدْ رَءَاهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ﴾ [النجم : ٢٩]

حالانکہ اس نے ایک بار اور اسے دیکھا۔

بظاہر ان کا اس سے استدلال ہے' تو صحیح بات یہ ہے کہ یہاں دیکھے جانے والے سے مراد جبرئیل ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کی صورت میں دو مرتبہ دیکھا تھا اور ابن عباس کا مذکورہ قول ہی امام احمد کے اس قول کی دلیل ہے کہ آپ نے دل کی آنکھ سے دیکھا تھا۔

اور اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ثُمَّ دَنَىٰ فَتَدَلَّىٰ﴾ کا تعلق واقعہ معراج والے "دنو" اور تدلی" سے نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن میں دنی فتدلی سے حضرت جبریل مراد ہیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن مسعود کا قول ہے. نیز کلام کے سیاق سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کیوں کہ وہاں یہ بھی مذکور ہے کہ :

﴿ عَلَّمَهُۥ شَدِيدُ ٱلْقُوَىٰ ﴾ [النجم : ٥]

ان کو ایک طاقتور فرشتہ سکھاتا ہے۔

اور حدیث میں جس "دنو و تدلی" (قرب اور جھکاؤ) کا ذکر ہے اس سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور تدلی مراد ہے۔

جب صبح ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ عظیم آیات دکھائیں۔ انہوں نے سختی سے تکذیب کی اور انتہائی شدت سے ایذاء دہی اور ضرر رسانی پر اتر آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرنے لگے کہ بیت المقدس کا حلیہ بیان کریں' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (بیت المقدس) کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ظاہر کر دیا چنانچہ آپ نے اسے دیکھا اور اس کی تمام علامت بتانی شروع کیں۔ وہ آپ کی کسی بات کو رد نہیں کر سکے۔ آپ نے اس قافلہ کے سفر اور واپسی کی خبر بھی دی اور یہ کہ کس وقت وہ آئے گا اور کون سا اونٹ آگے ہو گا۔ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کے عین مطابق ہوا لیکن اس سے ان کی نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔

ابن اسحاق نے حضرت عائشہ اور معاویہ سے نقل کیا ہے کہ معراج روحانی تھی یہاں مناسب ہے کہ معراج بحالت خواب اور معراج روحانی کے باہمی فرق کو سمجھا جائے۔ ان دونوں حالتوں میں بہت بڑا فرق ہے' کیوں کہ خواب میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ کبھی کبھی معلوم کی مثال ہوتی ہے۔ جسے محسوس صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ سونے والا یہ دیکھتا ہے کہ اسے آسمان کی طرف چڑھایا گیا یا مکہ لے جایا گیا' حالانکہ اس کی روح چڑھتی نہیں نہ وہ جاتا ہے بلکہ خواب کا فرشتہ اس کے لئے ایک تمثیل پیش کر دیتا ہے۔

جو لوگ معراج روحانی کے قائل ہیں ان کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خواب تھا بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ روح کو حقیقتاً لے جایا جاتا ہے اور وہ وہی کام کرتی ہے جو جسم سے بذریعہ موت جدا ہونے کے بعد کرتی ہے' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرق عادت کے مقام پر تھے چنانچہ زندگی کی حالت میں آپ کا شکم چاک کیا گیا اور آپ کو اس کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس لئے آپ کی روح کو بغیر موت آسمان کی سیر کرائی گئی' لیکن دوسرے لوگوں کے حق میں یہ کام موت کے بغیر ممکن نہیں چنانچہ انبیاء کی روحیں بدن سے جدا ہو کر آسمان میں ہیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح زندگی کی حالت میں ہی وہاں لے جائی گی' پھر واپس آگئی۔ وفات کے بعد انبیاء کی روحوں کے ساتھ رفیق اعلیٰ میں مستقر ہو گئی لیکن اس کے باوجود جسم سے اس کا ایک طرح کا تعلق ہے جس سے آپ سلام کا جواب دیتے ہیں اور جس سے موسی علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے اور آسمان پر دیکھا تھا۔

کیوں کہ یہ معلوم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو قبر سے اٹھا کر نہیں لے جایا گیا تھا' بلکہ ان کی روح کا وہ مستقر تھا اور قبر بدن کا مستقر ہے۔ اگر کسی کے ادراک میں یہ بات نہ آسکے تو وہ سورج پر غور کرے کہ وہ اپنی اونچائی کے باوجود زمین میں اور نباتات و حیوانات کی زندگی میں اثر انداز ہوتا ہے' روح کا مرتبہ تو اس

سے بھی بلند ہے۔ علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ ہجرت اور معراج کے درمیان ایک سال دو ماہ کا وقفہ تھا اور معراج ایک بار ہوئی۔ ایک قول میں دو مرتبہ ہوئی۔ ایک بار بیداری میں اور ایک بار خواب میں۔ اس قول کے حاملین کا خیال یہ ہے کہ حدیث شریک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "پھر میں بیدار ہوگیا" اور دوسری روایات کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ بعض نے کہا کہ تین بار واقعہ معراج ہوا۔ لیکن یہ سب اقوال محض ایک تخمینہ ہیں اور ضعیف روایات نقل کرنے والوں کے کارنامے ہیں۔ اور صحیح وہی ہے کہ جس پر ائمہ حدیث متفق ہیں کہ واقعہ اسراء ایک ہی بار پیش آیا۔

بڑی تعجب کی بات ہے کہ ایک سے زائد بار کے قائلین نے کس طرح سوچ لیا کہ ہر مرتبہ آپ پر پچاس وقت کی نماز پیش کی جاتی رہی۔ حفاظ حدیث نے معراج کی حدیث کے الفاظ کے بارے میں شریک کو غلط ٹھہرایا ہے اور امام مسلم نے اس حدیث کو مسندذکر کرکے کہا ہے کہ اس نے اس میں تقدیم و تاخیر اور کمی و زیادتی کردی ہے اور پوری حدیث بھی بیان نہیں کی ہے اور ان کی رائے مناسب ہے۔

فصل (۵۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت مدینہ کا واقعہ

ہجرت ایک ایسا واقعہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء اور اعداء کے درمیان فرق اور امتیاز کرنے کی کسوٹی بنائی ہے' جس سے دین کا غلبہ اور انبیاء کرام کی نصرت کا آغاز ہوتا ہے۔

امام زھری نے محمد بن صالح اور انہوں نے عاصم بن عمر ابن قتادہ اور یزید بن رومان وغیرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے ابتدائی ایام میں تین سال تک مکہ میں چھپ کر رہے پھر چوتھے سال اعلان عام کیا اور لوگوں کو دس سال تک دعوت اسلام دی۔ حج کے موسم میں آپ حجاج کی قیام گاہوں پر تشریف لے جاتے' نیز عکاظ' مجنہ اور ذی المجاز کے موسمی تہواروں اور بازاروں میں بھی تشریف لے جاتے اور دعوت اسلام دیتے اور اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچاتے۔ اور یہ مطالبہ کرتے کہ لوگ آپ کو اپنی حمایت میں لے لیں تاکہ آپ اسلام کا پیغام اچھی طرح لوگوں تک پہنچا سکیں اور اس کے عوض انہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں جنت نصیب ہو لیکن آپ کو کوئی مددگار نہ ملتا نہ کوئی آپ کی دعوت قبول کرتا' پھر آپ ایک ایک قبیلہ کی اقامت گاہ پر جاتے اور فرماتے ''اے لوگو لاالہ الااللہ کہو تو کامیاب رہو گے اور عرب قوم کے حاکم بن جاؤ گے۔ اس کلمے کے سبب عجم کے لوگ تمہارے تابع بن جائیں گے اور مرنے کے بعد جنت میں بادشاہ بن جاؤ گے''۔

ابولہب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے رہتا اور کہتا' خبردار اس شخص کی اطاعت نہ کرنا' یہ اپنے مذہب کے باغی اور جھوٹے ہیں۔ چنانچہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شدت سے انکار کردیتے اور آپ کو ایذائیں دیتے اور کہتے کہ آپ کا خاندان اور قبیلہ آپ کو زیادہ جانتا ہے۔ اس لئے انہوں نے آپ کی اتباع نہیں کی۔ اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دیتے چلے جاتے اور فرماتے ''اے اللہ اگر تو چاہتا تو یہ ایسے نہ ہوتے''۔

راوی کہتے ہیں کہ جن قبائل کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت و تبلیغ کے لئے تشریف لے

گئے' ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں :

بنو عامر بن صعصعہ' محارب ابن خصفہ' فزارہ' غسان' مرہ' حنیفہ' سلیم' عبس' بنو نضر' بنو البکاء' کندہ' کلب' الحارث ابن کعب' عذرہ' الحضارمہ۔ لیکن ان میں سے کسی نے دعوت اسلام قبول نہیں کی۔

اہل مدینہ کو دعوت اسلام : اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کی خاندانی نصرت کے لئے بھی انتظامات کر رکھے تھے۔ اوس و خزرج مدینہ میں دو قبائل تھے جو یہودیوں میں سے اپنے دوستوں کے ذریعہ اکثر سنتے رہتے تھے کہ اس زمانے میں ایک نبی مبعوث ہو گا' ہم اس کی اتباع کریں گے اور عاد و ارم کی طرح تمہیں قتل کریں گے۔

دوسرے عرب لوگوں کی طرح انصار مدینہ یہودیوں کے علاوہ کعبہ مشرفہ کا حج کیا کرتے تھے۔ جب انصار مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کو دعوت دین دیتے دیکھا تو اپنے احوال کا بغور مطالعہ کیا اور بعض انصاری کہنے لگے کہ خدا کی قسم لوگو! جانتے ہو؟ یہی وہ شخص ہیں جن کا نام لے کر مدینہ کے یہودی تمہیں دھمکایا کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تم پر سبقت لے جائیں۔

سوید بن صامت اوس کا ایک آدمی تھا جو مکہ آیا ہوا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے اسے دعوت دی۔ اس نے نہ انکار کیا اور نہ اقرار کیا۔ اس دوران انس بن رافع' ابوالحیس بن عبدالاشہل کے چند نوجوانوں کے ہمراہ کسی معاہدہ کے لئے آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ ایاس بن معاذ نامی ایک نوجوان کہنے لگا' اے قوم اللہ کی قسم' ہم جس کام کے لئے آئے ہیں' اس سے یہ (اسلام) بہت بہتر ہے۔ اس پر اسے انس نامی نوجوان نے ڈانٹا اور مارا تو وہ خاموش ہو گیا اور ان کا معاہدہ بھی مکمل نہ ہو سکا اور وہ مدینہ واپس چلے گئے۔

بیعت عقبہ اولیٰ : پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم حج کے موقع پر مقام عقبہ پر انصار کے چھ آدمیوں سے ملے جو خزرج کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں : اسعد بن زرارہ' جابر بن عبداللہ' عوف بن الحارث' رافع بن مالک' قطبتہ بن عامر' عقبہ بن عامر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے ان سب کو اسلام کی دعوت دی۔ یہ سبھی لوگ مشرف باسلام ہو گئے اور مدینہ واپس چلے گئے۔ وہاں انہوں نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی اور وہاں اسلام پھیلنا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ کوئی گھر ایسا نہ رہا جہاں اسلام داخل نہ ہوا ہو۔

آئندہ سال بارہ افراد پر مشتمل ایک قافلہ حاضر ہوا۔ جابر بن عبداللہ کے علاوہ چھ سابقہ تھے۔ نیز ان

کے ہمراہ معاذ بن الحارث جو عوف کے بھائی تھے' ذکوان بن عبد قیس بھی حاضر ہوئے اور یہ مکہ ہی میں مقیم ہو گئے۔ بعد میں مدینہ ہجرت کی جس کی وجہ سے انہیں مہاجر انصاری کہا جاتا ہے۔ نیز عبادہ بن الصامت' یزید ابن ثعلبہ' ابوالہیثم بن التیہان' عویمر بن ساعدہ' ان بارہ افراد میں سے تھے۔

ابو زبیر حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حج کے ایام میں لوگوں کی قیامگاہوں پر تشریف لے جاتے۔ اس طرح مجنہ اور عکاظ کے بازاروں میں بھی تشریف لے جاتے اور فرماتے تھے : "کون ہے جو مجھ پر ایمان لائے۔ میری حمایت و نصرت کرے یہاں تک کہ میں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دوں ۔ اس کے عوض اسے جنت ملے گی"۔ لیکن کسی کو بھی حامی و ناصر نہ پاتے اور یہ حال ہو گیا کہ کوئی آدمی مصر یا یمن سے اپنے رشتہ داروں سے ملنے آتا تو آپ کی قوم اس کے پاس آتی اور کہتی دیکھنا بچنا' قریش کا یہ نوجوان تمہیں فتنہ میں نہ ڈال دے لیکن بایں ہمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں میں تشریف لے جاتے اور انہیں دین اسلام کی دعوت دیتے اور قریش آپ کی طرف انگلیوں سے اشارہ کر رہے ہوتے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے یثرب (مدینہ) سے "انصار" بھیجا ہم میں سے کچھ لوگ آپ کے پاس آتے' ایمان لانے کے بعد قرآن سیکھ کر واپس جاتے تو اپنے گھر والوں کو مسلمان بناتے' پھر ہم نے اکٹھا ہو کر سوچا کہ آخر کب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی پہاڑیوں میں دربدر رہیں گے۔ یہ سوچ کر ہم حج کے موقع پر مکہ آئے اور بیعت عقبہ کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں یثرب والوں کو جانتا ہوں لیکن ان لوگوں سے میری واقفیت نہیں کہ کون ہیں۔ پھر ہم میں سے ہر ایک دو آدمی ان کے پاس گئے۔ ہماری شکل دیکھ کر انہوں نے کہا کہ ہم انہیں نہیں پہچانتے ہیں۔ یہ نوجوان لوگ ہیں ۔اس کے بعد ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم کس چیز پر آپ سے بیعت کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر حالت میں خواہ سستی ہو یا چستی' تنگی ہو یا فراخی' سمع و طاعت اور انفاق فی سبیل اللہ کرتے رہو نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ملامت کی پرواہ کئے بغیر حقوق اللہ کی ادائیگی پر' اور اس بات پر کہ جب میں تمہارے پاس آؤں تو میری مدد کرو اور جس طرح تم اپنی جان اور اپنے اہل و عیال کی حفاظت و مدافعت کرتے ہو' اسی طرح میری مدافعت کرو اور اس کے بدلہ میں تمہیں جنت ملے گی۔ جب ہم بیعت کے لئے کھڑے ہوئے تو اسعد بن زرارہ نے جو ان میں سب سے چھوٹی عمر کے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ اہل یثرب ٹھہرو' ہم آپ کے پاس اونٹوں پر سوار ہو کر یہ جاننے کے بعد آئے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آج آپ کو نکالنے کا معنی

پورے عرب کی جدائی اور تلواروں کو دعوت دینا ہے۔ اس لئے اگر تم اس پر صبر کر سکتے ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے چلو۔ اللہ تمہیں اجر دے گا اور اگر تمہیں اپنی جان کا خوف ہو تو پھر آپ کو چھوڑ دو۔ آپ اللہ کے ہاں تمہیں معذور سمجھیں گے۔ یہ سن کر لوگوں نے کہا کہ ہاتھ اٹھاؤ ہم اس بیعت کو چھوڑ نہیں سکتے نہ ہی اس سے چھٹکارہ ڈھونڈنے کی سوچ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہم میں سے ایک ایک آدمی نے کھڑے ہو کر بیعت کی اور آپ نے ہر ایک کو جنت کی بشارت دی' پھر یہ لوگ مدینہ واپس آ گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ ابن ام کلثوم اور مصعب بن عمیر کو بھیجا' جو لوگوں کو قرآن سکھاتے تھے اور اسلام کی دعوت کو پھیلاتے تھے۔ یہ دونوں اسعد بن زرارہ کے مہمان تھے۔ حضرت مصعب ان کے امام تھے۔

جب مسلمانوں کی تعداد چالیس ہو گئی تو انہیں حضرت مصعب بن عمیر نے جمعہ بھی پڑھانا شروع کیا۔ ان دونوں اصحاب کے ہاتھ پر بہت سے لوگ مسلمان ہوئے' انہی میں اسعد بن حضیر اور سعد بن معاذ ہیں۔ ان کے مسلمان ہونے کے بعد بنو عبدالاشہل کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے صرف اصیرم باقی رہ گئے تھے۔ جنہوں نے احد کے دن اسلام قبول کیا اور جہاد میں حصہ لے کر شہادت سے مشرف ہوئے۔ انہیں ایک وقت کی بھی نماز ادا کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ انہی کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"تھوڑا عمل اور زیادہ اجر" اور اسلام تیزی سے مدینہ میں پھیلنے لگا اور غالب ہونے لگا۔ اس کے بعد مصعب مکہ واپس آ گئے۔ اس سال حج کے موقع پر انصار مدینہ کی بڑی تعداد ، خواہ وہ مسلمان ہوں یا مشرک مکہ آئے اور ان کے سردار براء ابن معرور بھی شریک ہوئے۔ وہ عقبہ کی آخری شب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ ان کا ایک کارنامہ تھا کہ اس میں سبقت لے گئے اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ اس شب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے بارہ اشخاص کو بطور نقیب منتخب کیا۔ جب بیعت مکمل ہو گئی تو لوگوں نے عقبہ میں آباد مشرکین پر حملہ کی اجازت مانگی۔ لیکن آپ نے اجازت نہیں دی۔ اس موقع پر شیطان نے چیخ کر کہا کہ اے اہل جباجب کیا تمہیں معلوم ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے بے دین ساتھی تم سے جنگ کے لئے اکٹھے ہو گئے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یہ عقبہ کا شیطان ہے' اے دشمن خدا میں تیرے لئے فارغ ہوں گا"۔ پھر آپ نے لوگوں سے اپنے اپنے خیموں میں جانے کے لئے کہا۔ صبح کو اشراف قریش آئے اور انصار سے کہا کہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ تم لوگوں نے رات محمد (صلی اللہ علیہ

وسلم) سے مل کر ہمارے خلاف جنگ کا معاہدہ کیا ہے۔ بخدا عرب کے تمام قبائل کے مقابلہ میں تمہارے ساتھ جنگ کو ہم زیادہ ناپسند کرتے ہیں۔ یہ سن کر مشرکین قسم کھا کر کہنے لگے کہ ایسا نہیں ہوا ہے۔ ابن ابی نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ میری قوم میرے ساتھ ایسی زیادتی نہیں کر سکتی۔ اگر میں یثرب میں ہوتا تو مجھ سے مشورے کے بغیر میری قوم ایسا نہ کرتی۔ یہ سن کر قریش کے لوگ لوٹ گئے۔

حضرت براء اپنے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ بطن یأجج کی طرف چلے گئے۔ قریش کے لوگ ان کی تلاش میں نکلے اور سعد بن عبادہ کو پکڑ لیا اور مارتے ہوئے مکہ لے آئے۔ پھر مطعم بن عدی اور حارث بن حرب بن امیہ نے آ کر انہیں چھڑایا۔

انصار نے ان کی گمشدگی کے بعد مشورہ کیا کہ واپس لوٹیں۔ اس دوران وہ نظر آئے' پھر ان کے ساتھ سب لوگ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت دی اور لوگ تیزی سے ہجرت کرنے لگے۔ سب سے پہلے وہاں کے لئے ابوسلمہ اور ان کی بیوی روانہ ہوئے لیکن ان کی بیوی ام سلمہ کو روک دیا گیا اور ایک سال تک قید میں رکھا گیا۔ نیز ان کا بچہ بھی ان سے الگ کر دیا گیا۔ ایک سال کے بعد یہ اپنے بچے کے ہمراہ مدینہ کی طرف ہجرت کر گئیں اور عثمان بن ابی طلحہ ان کے مرافق تھے۔

اس کے بعد لوگ کثرت سے یکے بعد دیگرے مدینہ جانے لگے۔ آخر مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ابوبکر اور علی رضی اللہ عنہم کے سوا کوئی مسلمان نہ رہا۔ جو آپ کے حکم کی بنا پر وہاں ٹھہرے ہوئے تھے یا وہی لوگ رہ گئے تھے جن کو مشرکین نے قید کر رکھا تھا' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر پوری ہجرت کی تیاری کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔

جب مشرکین نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام مدینہ ہجرت کر چکے ہیں اور اپنے اہل و عیال اور مال و دولت لے کر مدینہ منورہ جا چکے ہیں' انہیں یقین ہو گیا کہ مدینہ ان کے لئے دارالامن بن چکا ہے جس کے باشندے طاقت و قوت رکھتے ہیں تو انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں تشریف نہ لے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ معاملہ سنگین صورت اختیار کر لے گا' چنانچہ وہ دارالندوہ میں (بغرض مشورہ) جمع ہوئے۔ اس موقع پر ابلیس نجدی بوڑھے کی شکل و صورت میں کمبل اوڑھے شریک ہوا۔ ان سب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔ ہر آدمی اپنی رائے پیش کرتا لیکن یہ بوڑھا (ابلیس) اسے رد کر دیتا اور اس پر رضامندی ظاہر نہ کرتا۔ آخر ابو

جہل کہنے لگا میرے ذہن میں ایک ایسی ترکیب آئی ہے جس تک ابھی تمہارا ذہن نہیں پہنچ سکا۔ سب کہنے لگے ' وہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا ' میرا خیال ہے کہ ہم قریش کے ہر قبیلہ کا ایک مضبوط اور نوجوان آدمی لیں پھر انہیں تیز تلواریں دیں اور وہ یکبارگی ایک آدمی کی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ٹوٹ پڑیں۔ اس طرح ان کا خون قبائل میں منقسم ہو جائے گا۔ اس کے بعد بنی عبد مناف کی کچھ سمجھ میں نہ آئے گا کہ اب کیا کیا جائے۔ کس سے انتقام لیں۔ کیونکہ تمام قبائل سے دشمنی مول لینا ان کے لئے محال ہوگا۔ آخر ہم سب مل کر ان کی دیت ادا کر دیں گے۔ بوڑھا (ابلیس) کہنے لگا اس نوجوان نے کیا خوب کہا۔ خدا کی قسم رائے ہے تو یہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس عہد کے بعد یہ لوگ منتشر ہو گئے۔ اس وقت جبریل علیہ السلام نے آکر آپ کو اس کی اطلاع دی اور ہدایت کی اس شب اپنے بستر پر نہ لیٹیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت چہرہ ڈھانکے ہوئے حضرت ابوبکر کے یہاں تشریف لائے' یہ تشریف آوری بالکل خلاف معمول تھی۔ آتے ہی آپ نے فرمایا' جو تمہارے بھی آدمی ہوں انہیں باہر نکالو۔ انہوں نے عرض کیا' یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ آپ ہی کے گھر کے لوگ ہیں تو آپ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ نے مجھے یہاں سے ہجرت کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے شرف رفاقت حاصل ہوگا۔ آپ نے فرمایا ' ہاں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا' میرے ماں باپ آپ پر قربان' میرے پاس دو سواریاں ہیں۔ ایک قبول فرمائیے۔ آپ نے فرمایا قیمت دے کر لوں گا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا آج کی رات میرے بستر پر سو جائیں۔

ادھر قریش کے منتخب لوگ جمع ہو کر دروازے کی نگرانی کرنے لگے کہ موقع پاتے ہی ٹوٹ پڑیں۔ یہ باہم مشورہ کرنے لگے کہ کون سب سے بڑا بدبخت اور شقی ہوگا جو یہ کام انجام دے گا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور ایک مٹھی کنکری لے کے ان کے سروں پر پھینک دی۔ کیفیت یہ تھی کہ وہ آپ کو دیکھ نہیں رہے تھے اور آپ یہ آیت تلاوت فرماتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے :

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴾ [یس : ۹]

اور ہم نے ان کے سامنے اور پیچھے آڑ کر دی اور ان پر غشی طاری کر دی جس سے وہ دیکھ نہ سکے۔

پھر دونوں حضرات شب ہی میں گھر سے باہر نکلے' اس کے بعد ایک شخص نے لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر کھڑے دیکھ کر پوچھا' کس کا انتظار کر رہے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا' وہ کہنے لگا' تم ناکام و نامراد رہے' اللہ کی قسم وہ تمہارے قریب سے گذر کر جا چکے ہیں اور تمہارے سر پر مٹی ڈال کر گئے ہیں۔ وہ کہنے لگے' اللہ کی قسم' ہم نے انہیں نہیں دیکھا اور اپنے سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اٹھے۔

جب صبح ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بستر سے اٹھے' کفار نے حضرت علی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا' میں کیا جانوں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر غار ثور کی طرف تشریف لے گئے اور اس میں داخل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے مکڑی کو بھیجا' اس نے غار پر جالا بن دیا۔

عبداللہ بن ار یقط لیثی کو جو ایک ماہر راہ نما مشرک تھا' اجرت پر لے لیا اور اس کو امین سمجھ کر آپ نے دونوں سواریاں اس کے حوالے کیں اور تین دن کے بعد غار ثور پر ملنے کا وعدہ فرمایا۔ ادھر قریش نے آپ لوگوں کی جستجو میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور نشان قدم کے ماہرین کی مدد سے غار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور وہاں ٹھہر کر اسے دیکھنے لگے۔

عامر بن فہیرہ بکریاں چرانے کے بہانے آپ کے پاس آیا کرتے اور دودھ اور مکہ کی خبریں پہنچا دیا کرتے تھے۔ اس طرح تین دن غار میں مقیم رہے یہاں تک کہ تلاش اور جستجو کی مہم سرد پڑ گئی۔ اس کے بعد عبداللہ بن ار یقط دونوں سواریاں لے کر حاضر ہو گیا اور سفر شروع ہو گیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عامر بن فہیرہ کو اپنے پیچھے بٹھا لیا اور رہنما ان کے سامنے چلنے لگا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور نصرت کے سایہ میں یہ قافلہ نبوی رواں دواں ہو گیا۔

جب کفار آپ کی گرفتاری سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے آپ کی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو گرفتار کرنے والوں کے لئے انعام کا اعلان کر دیا' چنانچہ لوگوں نے اس کے بعد غیر معمولی سرگرمی سے تلاش شروع کر دی لیکن اللہ تعالیٰ کی تدابیر بالا و برتر تھیں۔ جب آپ لوگ بنی مدلج کے ایک محلے کے پاس سے گذرے تو محلے کے ایک آدمی نے انہیں دیکھ لیا اور لوگوں سے کہا کہ میں نے ساحل پر ایک سایہ دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھی کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

سراقہ یہ سن کر تاڑ گیا اور سوچا کہ کامیابی کا سرا اسی کے سر رہے' کہنے لگا کہ نہیں' وہ فلاں فلاں لوگ اپنی کسی ضرورت سے گئے تھے' تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ اپنے خیمہ میں داخل ہوا اور خادم سے کہا کہ خیمہ کے پیچھے سے گھوڑا نکالو۔ میں تمہیں ٹیلے کے پیچھے ملوں گا۔ پھر اپنا نیزہ اٹھایا اور بالائی حصہ نیچے کر کے زمین پر لکیر بناتا ہوا گھوڑے تک پہنچا اور سوار ہو کر چل پڑا۔ جب آپ لوگوں سے قریب ہو گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کی آواز سننے لگا اور آپ یکسو ہو کر قراءت میں مشغول تھے اور حضرت ابو بکر بار بار مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سراقہ ہمارے پاس آ پہنچا ہے۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا کی اور اس کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا۔ وہ یہ ماجرا دیکھ کر کہنے لگا' مجھے معلوم ہے' جس جرم کی مجھے یہ سزا ملی ہے۔ یہ آپ کی بد دعا کا نتیجہ ہے۔ میرے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائے خیر کیجئے' میں عہد کرتا ہوں کہ لوگوں کو آپ کی تلاش سے واپس کر دوں گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور وہ آزاد ہو گیا۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے ایک تحریر مرحمت فرما دیجئے۔ آپ کے حکم سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چمڑے پر ایک تحریر لکھ دی۔ یہ تحریر فتح مکہ تک سراقہ کے پاس موجود تھی۔ اسے لے کر جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور فرمایا کہ آج وفاداری اور بھلائی کا دن ہے۔ سراقہ نے تحریر حاصل کرنے کے بعد ان لوگوں کے سامنے توشہ اور سواری پیش کی لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کی ہمیں ضرورت نہیں' البتہ تعاقب کرنے والوں کو تاریکی میں رکھو۔ سراقہ نے کہا کہ میں ضرور ایسا کروں گا۔ آپ لوگ مطمئن رہیں۔

وہ واپس لوٹا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ جستجو میں لگے ہیں۔ سراقہ نے ان سے کہا کہ میں تمہارے لئے واضح خبر لاتا ہوں۔ وہ لوگ ادھر نہیں ہیں' دیکھیں یہ شخص دن کی ابتدا میں آپ کا دشمن تھا اور دن کے آخر میں آپ کا جاں نثار بن چکا تھا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے رہے یہاں تک کہ ام معبد خزاعیہ کے خیموں کے پاس سے گذرے اور ان سے کھانا طلب کیا۔ اس نے عرض کیا اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو ہم آپ کی مہمان نوازی سے محروم نہ رہتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیمے کے ایک طرف بکری دیکھی۔ آپ نے فرمایا کیا یہ دودھ دیتی ہے۔ ام معبد نے کہا کہ یہ بے حد کمزور اور لاغر بکری ہے۔ اس کی وجہ سے چرنے نہیں جا سکی۔ بھلا یہ دودھ کیسے دے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور اس کے تھن پر ہاتھ لگایا اور بسم اللہ

پڑھ کر دوھنا شروع کیا۔ برتن جھاگ سے بھر گیا تو آپ نے ام معبد اور اپنے اصحاب کو پلایا پھر خود نوش فرمایا۔ اس کے بعد دوبارہ دوھ کر وہیں چھوڑ دیا اور روانہ ہو گئے۔

ادھر مکہ میں ایک آواز سنائی دیتی تھی' کوئی بلند آواز سے چند اشعار پڑھتا تھا مگر نظر نہ آتا تھا :

جَزَى اللهُ رَبُّ النَّاس خَيْرَ جَزَائِهِ   رَفِيْقَيْنِ حَلاَّ خَيْمَتَي أُمِّ مَعْبَدِ

اللہ لوگوں کا مالک ان دونوں ساتھیوں کو بہترین جزاء دے جو ام معبد کے خیمہ میں اترے۔

حضرت اسماء کا بیان ہے کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرف گئے ہیں لیکن مکہ کے نشیبی حصہ میں سے کسی جن نے آکر ان اشعار کو سنایا۔ لوگ اس کے پیچھے آواز سن کر چلتے تھے لیکن کسی کو دیکھ نہیں پاتے تھے۔ پھر وہ بالائی حصہ سے نکل گیا۔

حضرت اسماء کہتی ہیں کہ ان اشعار کو سن کر ہم نے سمجھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے ہیں۔

فصل (۵۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری

انصار کو معلوم ہو چکا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ وہ ہر روز مدینہ سے نکل کر دوپہر تک آپ کا انتظار کرتے۔ جب دھوپ تیز ہو جاتی تو اپنی عادت کے مطابق گھروں کو واپس آ جاتے۔

بعثت کے تیرھویں سال ۱۲ ربیع الاول کو وہ لوگ حسب عادت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظار میں نکلے تھے۔ جب دھوپ تیز ہو گئی تو وہ لوٹ آئے۔ اتفاق سے اس وقت ایک یہودی کسی ضرورت سے کسی ٹیلے پر چڑھا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کو چمکتے ہوئے دیکھا' جن کے آگے بڑھنے سے سراب زائل ہو رہا تھا۔ وہ زور سے چیخا' اے بنی قیلہ! یہ ہیں تمہارے سردار اور بزرگ جن کا تم انتظار کر رہے تھے۔

انصار نے جلدی سے ہتھیار سنبھال لئے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شایان شان استقبال کریں اور مرحبا اہلا و سہلا کی آوازیں بنی عمرو بن عوف کے محلے سے گونجنے لگیں اور مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خوشی میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے اور شان نبوت کے مطابق خوش آمدید کہا۔ انہوں نے پروانوں کی طرح آپ کو گھیر لیا۔ اسی موقع پر آپ مکمل سکون و طمانیت سے تھے اور اس آیت کریمہ کا نزول ہو رہا تھا :

﴿ فَإِنَّ ٱللَّهَ هُوَ مَوْلَىٰهُ وَجِبْرِيلُ وَصَٰلِحُ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۖ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ ﴾
[التحریم : ٤]

بے شک اللہ ہی اس کا رفیق ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور اس کے بعد فرشتے مددگار ہیں۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہو کر بنی عمرو بن عوف کے علاقے قباء میں کلثوم بن ہدم یا سعد بن خیثمہ کے یہاں اترے۔ پہلا قول زیادہ راجح ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں چودہ راتیں قیام پذیر رہے اور اسی اثناء مسجد قباء کی تعمیر فرمائی اور نبوت کے بعد یہ سب سے پہلی مسجد تھی جس کا سنگ بنیاد

رکھا گیا۔

جب جمعہ کا دن آیا تو آپ اللہ کے حکم کے مطابق سوار ہوئے اور محلّہ بنی سالم بن عوف میں پہنچے تو جمعہ کی نماز کا وقت ہو گیا۔ بطن وادی کی مسجد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کی نماز پڑھائی' پھر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ جاں نثاروں نے اونٹنی کی مہار پکڑلی اور کہنے لگے کہ آپ ایسی جگہ اتریں جہاں سازو سامان اور طاقت و قوت کی فراوانی ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا راستہ چھوڑ دو کہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔ جس جگہ مشیئت ہوگی' وہیں بیٹھ جائے گی۔ اونٹنی چلتی رہی۔ ہر انصاری سراپا تمنا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے غریب خانہ پر قیام فرمائیں۔ جب لوگ اپنی خواہش کا اظہار کرتے تو آپ فرماتے کہ چھوڑ دو یہ اللہ کی جانب سے مامور ہے۔

اونٹنی چلتے چلتے مسجد نبوی کی جگہ بیٹھ گئی لیکن آپ اترے نہیں۔ اونٹنی کھڑی ہوئی اور تھوڑی دور چل کر واپس ہوئی اور پہلی جگہ پر پھر بیٹھ گئی۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیچے اترے۔ یہ جگہ بنو نجار میں آپ کے ننھیالی رشتہ داروں کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ توفیق دی اور یہ اعزاز بخشا۔ اس کی مشیت یہ تھی کہ آپ کی میزبانی کا شرف انہی کو ملے۔ یہ لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اپنے یہاں اترنے کی درخواست کرنے لگے۔ حضرت ابو ایوب آگے بڑھے اور سواری کا کجاوہ اپنے گھر میں داخل کر لیا۔ آپ نے فرمایا کہ آدمی اپنی سواری کے کجاوے ہی کے ساتھ رہتا ہے۔

اسعد بن زرارہ آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کو لے گئے جو انہی کے پاس رہی۔ آپ کے مدینہ میں قیام کا قیس بن حرمہ انصاری کے اشعار میں یوں ذکر ہے :

حضرت ابن عباس نے ان کے پاس جا کر ان اشعار کو حفظ کیا تھا۔

ثَوَى فِي قُرَيْشٍ بِضْعَ عَشَرَةَ حَجَّةً   يُذَكِّرُ لَوْ يَلْقَى حَبِيْبًا مُوَاتِيًا

قریش میں آپ نے دس سال سے زائد قیام فرمایا اور چاہا کہ کوئی دوست اور حامی مل جائے۔

وَيَعْرِضُ فِي أَهْلِ الْمَوَاسِمِ نَفْسَهُ   فَلَمْ يَرَ مَنْ يُؤْوِي وَلَمْ يَرَ داعِيًا

حج وغیرہ کے اجتماعات میں آپ خود کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے لیکن کوئی ٹھکانہ یا دعوت دینے والا نہ ملا۔

فَلَمَّا أَتَانَا وَاسْتَقَرَّتْ بِهِ النَّوَى   وَأَصْبَحَ مَسْرُوْرًا بِطَيْبَةَ رَاضِيًا

جب آپ ہمارے یہاں مقیم ہو گئے تو مدینہ میں راضی خوشی رہنے لگے۔

وَأَصْبَحَ لَایَخْشَی ظُلَامَةَ ظَالِمٍ ۔۔۔ بَعِیْدٍ وَلَایَخْشَی مِنَ النَّاسِ بَاغِیًا

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کے ظلم اور زیادتی کا اندیشہ باقی نہ رہا۔

بَذَلْنَا لَهُ الأَمْوَالَ مِنْ حِلِّ مَالِنَا ۔۔۔ وَأَنْفُسَنَا عِنْدَ الْوَغَی وَالتَّآسِیَا

تو ہم نے لڑائی وغیرہ کے مواقع پر آپ کے لئے جان ومال کی قربانی پیش کی۔

نُعَادِي الَّذِي عَادَی مِنَ النَّاسِ کُلِّهِمْ ۔۔۔ جَمِیْعًا وَإِنْ کَانَ الْحَبِیْبَ الْمُصَافِیَا

ہمارا دوست بھی اگر آپ سے دشمنی رکھے تو ہم اس کے دشمن ہیں۔

و نعلم ان الله لارب غیره ۔۔۔ وان کتاب الله اصبح هادیاً

ہمارا یقین ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور اس کی کتاب ہماری رہنما ہے۔

حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے تو آپ کو ہجرت کا حکم دیا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی :

﴿ وَقُل رَّبِّ أَدْخِلْنِی مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِی مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّی مِن لَّدُنكَ سُلْطَـٰنًا نَّصِيرًا ﴾ [الإسراء : ٨٠]

کہہ دیجئے کہ اے میرے رب مجھے اچھی جگہ پہنچا دے اور حفاظت کے ساتھ نکال اور مجھے فتح یابی کا غلبہ دے۔

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ سے مدینہ کی طرف اچھی جگہ نکال دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم تھا کہ یہ کام بغیر اللہ تعالیٰ کی نصرت و قوت کے نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لئے آپ نے سلطان نصیر کے لئے دعا مانگی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ ہی میں دارالہجرت کا مشاہدہ کرا دیا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا' مجھے تمہاری ہجرت کا مقام دکھایا گیا۔ جو کھجور کے درختوں والی شور زمین میں سیاہ کنکریوں والے دو حصوں کے مابین واقع ہے۔

حضرت براء فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے ہمارے پاس سب سے پہلے مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم تشریف لائے۔ یہ دونوں بزرگ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے لگے پھر حضرت عمار بن یاسر' بلال و اسعد (رضی اللہ عنہم) تشریف لائے۔ ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیس سواروں کے ساتھ

تشریف لائے۔ ان کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں کو اس قدر کبھی بھی فرحت و خوشی نہ ہوئی' جس قدر آپ کی تشریف آوری کے باعث ہوئی' یہاں تک کہ میں عورتوں' بچوں اور لونڈیوں کو کہتے دیکھا' یہ اللہ کے رسول کے تشریف لانے کا اعلان کر رہے تھے۔ بہرحال آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب کے گھر میں قیام پذیر تھے تا آنکہ حجرے اور مسجد کی تعمیر ہو گئی۔ زید بن حارثہ اور ابو رافع کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دے کر مکہ بھیجا' چنانچہ یہ دونوں آپ کی دونوں صاحبزادیوں حضرت فاطمہ اور حضرت ام کلثوم نیز حضرت سودہ بنت زہرہ اور اسامہ ابن زید' ان کی والدہ ام ایمن کو لے کر واپس آ گئے۔

البتہ حضرت زینب کو ان کے خاوند ابوالعاص بن ربیع نے نہ آنے دیا۔ عبداللہ بن ابی بکر حضرت ابوبکر کے اہل و عیال کو لے کر چلے آئے۔ جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ یہ سب لوگ حارثہ بن نعمان کے گھر میں اترے۔

فصل (۵۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد نبوی کی تعمیر کا طریقہ

امام زہری فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی مسجد والی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اس وقت مسلمان یہاں نماز ادا کیا کرتے تھے لیکن یہ جگہ دو یتیم انصاری لڑکوں، سہل اور سہیل کی ملکیت میں تھی۔ جن کی پرورش حضرت اسعد بن زرارہ کے ذمہ تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لڑکوں سے زمین کی فروخت اور پھر تعمیر مسجد کے متعلق گفتگو کی۔ وہ دونوں کہنے لگے، نہیں بلکہ یا رسول اللہ! ہم آپ کی خدمت میں اسے مسجد کے لئے ہبہ کرتے ہیں۔ آپ نے اسے منظور نہ فرمایا بلکہ دس دینار ادا کرکے زمین خرید لی۔ اس میں اس وقت صرف چار دیواریں تھیں، چھت نہ تھی اور اس کا قبلہ رخ بیت المقدس کی جانب تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل اسعد بن زرارہ یہیں مسلمانوں کو نماز اور جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور اس میں غرقد اور کھجور کے درخت تھے اور مشرکین کی قبریں تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق مشرکین کی قبریں اکھاڑ دی گئیں۔ کھجور اور دوسرے درخت کاٹ دیئے گئے اور قبلہ کی طرف سے مسجد ہموار کی گئی۔ مسجد کے قبلہ سے پیچھے تک اس کا طول سو گز اور باقی دونوں جانب بھی اس قدر یا اس سے کچھ کم تھا۔ بنیادیں تقریبا تین گز تھی۔ اس کے بعد کچی اینٹوں سے مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تعمیر میں حصہ لیتے اور اینٹیں اور پتھر اٹھا کر لاتے اور لے جاتے ہوئے آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے :

الهم لاعيش الاعيش الآخرة　　　　فاغفرللأنصار و المهاجرة

اے اللہ زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے۔ پس انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔

آپ یہ بھی پڑھتے تھے :

هذا الحمال لاحمال خيبر　　　　هذا أبر ربنا و أطهر

یہ خیبر سے آنے والی کھجور اور غلہ وغیرہ کا بوجھ نہیں بلکہ اینٹوں کا بوجھ ہے اور یہی خیر اور پاکیزگی

کا باعث ہے۔

صحابہ کرام بھی اینٹیں ڈھوتے ہوئے رجز پڑھتے تھے۔ بعض لوگ یہ رجز پڑھ رہے تھے :

لئن قعدنا و الرسول یعمل لذاك منا العمل المضلل

اگر ہم بیٹھے رہیں اور رسول کام کریں تو یہ ہماری غلطی ہوگی۔

اس مسجد کا قبلہ بیت المقدس کی طرف کیا گیا اور تین دروازے بنائے گئے۔ ایک دروازہ پیچھے' دوسرا جسے باب الرحمہ کہتے ہیں اور تیسرا وہ جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تھے۔ ستون کھجور کے تنے سے بنائے گئے اور چھت کھجور کے پتوں سے بنائی گئی۔ عرض کیا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی چھت نہ ڈالیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں' موسیٰ علیہ السلام کے چھپر کی طرح رہے گی۔

آپ نے مسجد سے متصل کچی اینٹوں سے ازواج مطہرات کے لئے حجرے تعمیر کروائے اور ان پر کھجور کے پتوں اور شاخوں کی چھت ڈالوائی۔ جب اس کام سے فارغ ہو گئے تو مسجد کے مشرقی حصہ سے متصل حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے لئے ایک حجرہ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے لئے دوسرا حجرہ تعمیر کروایا گیا۔

پھر آپ نے مہاجرین و انصار کے مابین اخوت کا رشتہ قائم کر دیا۔ یہ کل نوے آدمی تھے۔ نصف مہاجرین میں سے اور نصف انصار سے۔ غزوہ بدر تک یہ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی :

﴿ وَأُوْلُواْ ٱلْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ ﴾ [الأنفال : ٧٥]

رشتہ داروں میں بعض بعض کے زیادہ مستحق ہیں۔

تو مرنے کے بعد توارث کا معاملہ صرف اقارب تک محدود ہو گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری مرتبہ مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کی اور اس دوسری مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی بنایا۔ لیکن پہلا قول زیادہ درست ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ کی اخوت کے زیادہ مستحق حضرت ابو بکر صدیق تھے جن کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ "اگر زمین والوں میں سے کسی کو میں دوست بناتا تو حضرت ابو بکر کو بناتا لیکن وہ میرے بھائی اور ساتھی ہیں"۔

یہ اخوت اگرچہ عام تھی جیسا کہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میں اپنے بھائیوں کو دیکھنے کا خواہشمند ہوں"۔ صحابہ نے پوچھا کہ کیا ہم آپ کے بھائی نہیں۔ آپ نے فرمایا "تم

میرے ساتھی ہو۔ میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے اور مجھ پر بغیر دیکھے ایمان رکھیں گے"۔

لیکن اس عمومیت کے باوجود حضرت ابوبکر صدیق اس اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ اس طرح مصاحبت کا بھی اعلیٰ مرتبہ آپ کو حاصل تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے یہود سے معاہدہ صلح کیا اور ایک عہد نامہ لکھ لیا گیا اور یہودیوں کے ایک بڑے عالم عبداللہ بن سلام نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن عام یہودی کفر پر قائم تھے۔

قوم یہود کے تین قبیلے تھے۔ بنو قینقاع' بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ تینوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کی۔ آپ نے بنو قینقاع پر احسان فرمایا' بنو نضیر کو جلاوطن کر دیا اور بنو قریظہ قتل کیے گئے اور ان کی اولاد کو غلام بنا لیا گیا۔ بنو نضیر کے متعلق سورہ حشر اور بنو قریظہ کے متعلق سورہ احزاب نازل ہوئی۔

مدینہ میں آپ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور حضرت جبریل سے یہ فرمایا تھا کہ میری تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے رخ کو یہود کے قبلہ سے پھیر دے۔ انہوں نے کہا کہ میں تو بندہ ہوں۔ آپ اپنے رب سے دعا کیجئے اور اس کا سوال کیجئے۔ یہ سن کر آپ امید باندھے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی :

﴿ قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ﴾ [البقرة: ١٤٤]

ہم آپ کے آسمان کی طرف رخ کرنے کو دیکھ رہے ہیں۔

یہ واقعہ مدینہ تشریف آوری کے سولہ ماہ بعد غزوہ بدر سے دو ماہ قبل پیش آیا۔ اس میں بڑی حکمتیں تھیں اور اصل میں یہ مسلمانوں' مشرکوں' یہودیوں اور منافقوں کا ایک امتحان تھا' مسلمانوں کے لئے تو یہ چیز مشکل نہ تھی۔ خدا کی ہدایت کی وجہ سے انہوں نے یہ کہا کہ ہم ایمان لے آئے' سب کچھ ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے۔ مشرکین یہ کہنے لگے کہ جس طرح ہمارے قبلہ کی طرف لوٹے ہیں' اسی طرح جلد ہی ہمارے مذہب کو بھی اختیار کر لیں گے اور ہمارے قبلہ کی طرف واپس اس کے برحق ہونے کی دلیل ہے۔

یہودیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ انہوں نے سابقہ انبیاء کے قبلہ کی مخالفت کی۔ منافقین کا یہ کہنا تھا کہ ہم نہیں جانتے کہ کدھر رخ کرتے ہیں۔ اگر پہلا حق تھا تو اسے تو انہوں نے چھوڑ دیا اور اگر دوسرا حق ہے تو اب تک یہ باطل پر تھے۔ اس طرح ان نادانوں کی طرف سے باتیں بنائی گئیں' اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا تھا کہ :

﴿ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ﴾ [البقرة: ١٤٣]

بیشک یہ تبدیلی ہدایت یافتہ لوگوں کے علاوہ دوسروں کے حق میں یقیناً بڑی تھی۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اچھے بندوں کا یہ امتحان تھا تاکہ دیکھے کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا ہے اور کون پھر جاتا ہے۔

چونکہ قبلہ کا معاملہ ایک عظیم واقعہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے بطور تمہید اس سے پہلے نسخ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جب وہ کسی حکم کو ختم کرتا ہے تو اس جیسا یا اس سے اچھا دوسرا حکم لے آتا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کی سرزنش کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہٹ دھرمی کرتے ہیں اور آپ کے حکم کو تسلیم نہیں کرتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے اختلاف کا ذکر کرکے بتایا کہ یہ آپس میں کہا کرتے ہیں کہ تم کسی طریقے پر نہیں ہو اور بندوں کو ان کی موافقت کرنے اور خواہشات کی اتباع سے منع فرمایا۔ اس کے بعد ان کے کفرو شرک کو بیان کیا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کا بیٹا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ مشرق و مغرب اسی کا ہے اور بندے جدھر اپنا رخ کرتے ہیں وہ اس طرف موجود ہوتا ہے۔ وہ وسعت اور علم والا ہے۔ اس کی عظمت و وسعت اور احاطہ کا تقاضا ہے کہ بندہ جدھر رخ کرے ادھر اس کی ذات ہو۔ پھر بتایا کہ رسول سے ان دوزخیوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جنھوں نے ان کی پیروی نہیں کی۔

پھر بتایا کہ اہل کتاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تب تک راضی نہ ہوں گے جب تک کہ وہ ان کی اطاعت نہ کریں اور انہوں نے ایسا کیا تو اللہ کے مقابلے میں ان کا کوئی کارساز نہ ہوگا اور نہ مددگار' اس کے بعد اہل کتاب پر کئے گئے انعامات کو یاد دلایا اور اپنے عذاب سے ڈرایا پھر بیت اللہ کے معمار حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا تذکرہ اور ان کی مدح و تعریف فرمائی اور بتایا کہ ہم نے انہیں تمام لوگوں کا امام بنایا۔ اس کے بعد اپنے گھر بیت الحرام کا اور حضرت ابراہیم کی تعمیر کا تذکرہ کیا اور انہیں دنیا کا "امام" بنایا ہے اور بیت اللہ کو بھی ان سب کا قبلہ و مرکز قرار دیا ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ جو اس امام سے سرکشی کرے گا' وہ ناداں اور بیوقوف ہوگا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ ان کی اقتداء کریں اور جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت ابراہیم علیہ السلام اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف نازل کیا گیا' اس پر ایمان لائیں۔ پھر جن لوگوں نے حضرت ابراہیم اور ان کے اہل بیت کو یہودی یا نصرانی کہا' ان کے قول کو رد کیا۔

ان تمام مذکورہ مباحث کو تحویل قبلہ کے لئے تمہید اور مقدمہ بنا کر ذکر کیا' اس معاملہ کو اللہ نے بار بار

تاکید سے بیان فرمایا اور رسول کو یہ حکم دیا کہ جہاں ہوں اور جہاں سے نکلیں' اس کی پیروی کریں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا کہ جو ذات صراط مستقیم کی جانب رہنمائی کرتی ہے' اسی نے اس قبلہ کی طرف رہنمائی کی ہے۔ یہ قبلہ مسلمانوں ہی کا ہے۔ وہی اس کے اہل ہیں۔ کیوں کہ یہ سب سے افضل قبلہ اور مسلمان سب سے افضل امت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سب سے افضل رسول اور سب سے افضل کتاب کو پسند کیا ہے۔ انہیں بہترین زمانہ میں پیدا کیا اور بہترین شریعت سے نوازا۔ بہترین اخلاق سے متصف کیا' بہترین زمین میں آباد کیا' جنت میں بہترین جگہ مقرر کی' قیامت کے دن سب سے اچھی قیام گاہ متعین کی جو ایک بلند ٹیلہ پر ہو گی۔ پس پاک ہے وہ ذات جو جسے چاہتی ہے' اپنی رحمت سے مختص فرماتی ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے' عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑا ہی فضل والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا کہ ایسا اس لئے کیا گیا کہ لوگوں کو مسلمانوں پر کسی حجت کا موقع نہ مل سکے مگر ظالم اور ملحد لوگ مختلف بے بنیاد حجتیں پیش کرتے ہیں۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر دوسری چیزوں کو مقدم کرتے ہیں' ان کی حجتیں بھی اسی طرح کی ہوتی ہیں۔

پھر بتایا کہ اس نے ایسا اپنی نعمت کو تمام کرنے اور لوگوں کو ہدایت دینے کے لئے کیا ہے اور اس کی نعمتوں میں سے رسول بھیجنا' کتاب نازل کرنا تاکہ لوگوں کو پاک اور صاف کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دینا اور ایسی باتیں بتانا جنہیں وہ جانتے نہیں ہیں۔

آگے ذکر و شکر کا حکم دیا جس سے نعمت کی تکمیل اور محبت کا حصول ہوتا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ صبر اور نماز سے مدد حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پانچ وقت کی اذان بھی قبلہ کے ساتھ مشروع فرمائی اور ظہر' عصر' عشاء میں دو دو رکعت کا اضافہ فرمایا۔ یہ نمازیں پہلے دو رکعت تھیں' یہ تمام چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد ہوئیں۔

فصل (٦٠)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ میں قیام اور جہاد کی مشروعیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں قیام پذیر ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت اور مومنوں کی ایک جماعت سے آپ کی مدد فرمائی اور عداوت کے بعد ان کے دلوں میں الفت پیدا کر دی۔ اللہ کے مددگاروں اور اسلام کے سپاہیوں نے آپ کی حفاظت کی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنی جانوں کو قربان کر دیا۔ ماں باپ اور آل اولاد کی محبت پر آپ کی محبت کو مقدم رکھا اور آپ کو خود اپنی ذات سے بھی زیادہ قریب تصور کرنے لگے تو ان حالات میں عرب اور یہودیوں نے متحدہ طور پر مسلمانوں کو نشانہ بنایا اور ان کے ساتھ دشمنی پر کمربستہ ہو گئے۔ ہر طرف سے ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اب تک مسلمانوں کو صبر و عفو اور درگذر کا حکم دیا تھا لیکن ان کی حیثیت بھی مضبوط ہو گئی اور دشمنوں سے مقابلہ کی قوت پیدا ہوئی تو پھر لڑائی کی اجازت ملی لیکن لڑائی کو پھر بھی فرض نہیں قرار دیا گیا بلکہ ارشاد ہوا کہ :

﴿ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُواْۚ وَإِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴾ [الحج : ٣٩]

مظلومیت کے سبب مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ یہ مکہ کا ذکر ہے کیوں کہ سورہ مکی ہے لیکن یہ قول کئی وجوہ سے غلط ہے۔

پہلی وجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ میں جہاد کی اجازت نہیں دی تھی۔

دوسری وجہ یہ کہ آیت کے سیاق و سباق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت مکہ سے نکلنے کے بعد نازل ہوئی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ هَٰذَانِ خَصْمَانِ ﴾ کا نزول ان لوگوں کے بارے میں ہوا ہے جو بدر کی لڑائی میں مقابلہ کے لئے نکلے تھے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس سورہ میں ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ﴾ سے خطاب کیا گیا ہے اور اس طرح کا خطاب مدنی آیتوں میں ہوتا تھا۔

پانچویں وجہ یہ کہ اس میں ایسے جہاد کا حکم ہے جو ہاتھ کے ساتھ مخصوص نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مطلق جہاد کا حکم ہجرت کے بعد ہی ہوا۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ امام حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکال دیا ہے۔ «انا للہ و انا الیہ راجعون» یہ ضرور تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَـٰتَلُونَ﴾ والی آیت نازل فرمائی اور یہ قتال کی پہلی آیت ہے۔ سورہ کا سیاق یہ بھی بتاتا ہے کہ اس میں مکی و مدنی دونوں آیتیں ہیں کیونکہ القاء شیطان کا قصہ مکی ہے' واللہ اعلم! پھر مسلمانوں پر ان لوگوں سے لڑنا فرض قرار دیا گیا جو ان سے قتال پر آمادہ ہو جائیں' چنانچہ ارشاد ربانی ہے :

﴿ وَقَـٰتِلُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱلَّذِينَ يُقَـٰتِلُونَكُمْ﴾ [البقرة : ١٩٠]

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تمام مشرکوں سے قتال فرض قرار دے دیا جو پہلے حرام تھا پھر اجازت ملی' پھر قتال کرنے والوں کے ساتھ قتال کرنے کا حکم ہوا' پھر تمام مشرکین کے ساتھ قتال کرنے کا حکم ہو گیا اور اس حکم کو بعض لوگوں نے فرض عین کہا اور بعض نے فرض کفایہ۔

لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ جنس جہاد فرض عین ہے' خواہ دل سے ہو یا زبان سے ہاتھ سے ہو یا مال سے۔ اس لئے تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ان میں سے کسی بھی قسم کا جہاد کریں لیکن جہاد بالنفس فرض کفایہ ہے اور جہاد بالمال کے بارے میں دو قول ہیں جن میں صحیح وجوب والا قول ہے' کیوں کہ قرآن میں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کا حکم یکساں طور پر دیا گیا ہے۔ جہنم سے نجات و مغفرت اور جنت میں داخلہ کو اس پر موقوف قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَـٰرَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ [الصف : ١٠]

اے ایمان والو' کیا میں تمہیں ایسی تجارت نہ بتا دوں جو دردناک عذاب سے تم کو نجات دے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ اس نے مسلمانوں کی جان و مال کو خرید لیا ہے اور اس کے بدلہ انہیں جنت دے دی ہے۔ اس معاملہ اور وعدہ کا ذکر افضل ترین کتاب میں وارد ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ بتا کر مزید تاکید پیدا کی ہے کہ اس سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کوئی نہیں۔ پھر یہ فرما کر تاکید کی کہ مسلمانوں کو

اس سے بشارت حاصل کرنی چاہیے پھر یہ بتایا کہ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اب عقلمندوں کو غور کرنا چاہیے کہ یہ معاملہ کس قدر برتر ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ خریدار ہے۔ قیمت جنت ہے۔ جس کے ہاتھ پر معاملہ طے پایا' وہ سب سے اشرف رسول ہے اور ظاہر ہے کہ جس سامان کی یہ شان ہو' اس کو کسی عظیم کام ہی کے لئے تیار کیا جائے گا۔

قد هياؤك لأمر لو فطنت له　　　فاربأ بنفسك ان ترعى مع الهمل

تمہیں بہت بڑے کام کے لئے تیار کیا گیا ہے لہٰذا اپنے نفس کو جانوروں کے ساتھ رہنے سے بچاؤ۔

جنت و محبت کا مہر مالک کی راہ میں جان و مال کی قربانی ہے۔ اس لئے بزدل اور مفلس اس کا بھاؤ تاؤ کریں اور نہ تنگدست اسے ادھار بیچ دیں۔ اسے چاہنے والوں کے بازار میں پیش کیا گیا ہے اور مالک کی نظر میں جان کے علاوہ اس کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ دیکھ کر بیکار لوگ پیچھے ہٹ گئے اور محبت منتظر کھڑی رہی کہ دیکھیں کس کی جان قیمت بننے کے اہل ہوتی ہے پھر سامان ان کے درمیان گھوم کر ایسے ہاتھوں میں پڑ گیا جو مومنوں کے حق میں نرم اور کافروں کے حق میں سخت تھے۔

جب محبت کے دعویدار زیادہ ہو گئے تو ان سے اس پر دلیل کا مطالبہ کیا گیا کیونکہ اگر صرف دعوے کی بنیاد پر عطیات سے نوازا جائے تو غم و ھم سے محروم شخص غم کی سوزش کا دعوی کرے گا۔ جب شہود کے مدعی مختلف لوگ ہو جائیں تو ان سے کہا جائے گا کہ اپنے اس دعوی پر دلیل پیش کرو ورنہ یہ دعوی ثابت نہیں ہو گا :

﴿ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ ﴾ [آل عمران : ٣١]

آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تمہیں دوست رکھے گا۔

چنانچہ لوگ یہ سن کر پیچھے ہٹ گئے اور وہی لوگ ثابت قدم رہے جو صحیح معنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع آپ اقوال و افعال و اخلاق و عادات میں کرتے رہے تھے۔ پھر ان سے دلیل کی عدالت کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ عدالت بغیر تزکیہ کے ناقابل قبول ہے :

﴿ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ﴾ [المائدة : ٥٤]

وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے۔

یہ سن کر محبت کے بھی اکثر دعویدار پیچھے ہٹ گئے اور اس وقت مجاہدین کھڑے ہوئے۔ چنانچہ ان

سے کہا گیا کہ محبت کرنے والوں کی جان و مال ان کی نہیں ہوتی۔ اس لئے جس چیز پر معاملہ طے ہوا' اسے حوالہ کر دو کیوں کہ بیع و شراء میں جانبین سے ادائیگی اور سپردگی ہوتی ہے۔

جب تاجروں کو خریدار کی عظمت' اس کی قدر و قیمت اور معاملہ کرنے والے کی جلالت شان کا اندازہ اور اس وثیقہ کی اہمیت کا علم ہوا جس میں یہ باتیں درج کی گئیں تو انہیں اس معاملے اور سودے کے عظیم الشان ہونے کا اندازہ ہوا۔ اسے معدودے چند درہموں کے عوض بیچ دینا سراسر گھاٹا سمجھا۔ اس طرح اس کی لذت تو ختم ہو جائے گی لیکن تاوان باقی رہے گا۔ اب انہوں نے خریدار کے ساتھ برضا و رغبت بیعت رضوان طے کی جس میں فسخ کا اختیار نہیں۔ جب معاملہ طے ہو گیا اور چیز حوالہ کر دی گئی تو اس سے کہا گیا کہ تمہاری جان اور تمہارا مال ہمارا ہو گیا۔ اب ہم نے اسے پہلے سے بھی زیادہ مکمل حالت اور کثیر تعداد میں تمہیں لوٹا دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ﴾ [آل عمران: ١٦٩]

آپ ہرگز اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مردہ نہ سمجھیں۔

ہم نے تمہاری جان اور تمہارے مال کو کسی منفعت کے لئے نہیں خریدا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ بیع کو قبول کرنے اور اچھی قیمت دینے میں جود و کرم اثر انداز ہو۔ پھر ہم نے قیمت اور سامان دونوں تمہارے لئے اکٹھا کر دیا۔

نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے واقعہ پر غور کریں جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری قیمت دے کر پھر اس پر اضافہ کیا اور ان کا اونٹ بھی واپس کر دیا پھر ان سے فرمایا کہ کیا تمہیں نہ بتاؤں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے والد سے کیا فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا' ارشاد ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اللہ تعالیٰ نے تمہارے والد سے کھلم کھلا گفتگو کی' فرمایا کہ اے میرے بندے میرے حضور سب تمنائیں کر' میں اسے پورا کروں گا۔ انہوں نے عرض کیا' اے اللہ مجھے دوبارہ زندہ کر دے تاکہ میں تیری راہ میں پھر سے لذت قتل حاصل کروں۔

پاک ہے وہ ذات جس کا جود و کرم مخلوقات کے دائرہ علم سے باہر ہے۔ وہ سامان اور قیمت دونوں حوالہ کر دیتا ہے پھر معاملہ کو مکمل کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ سامان کو عیب کے باوجود قبول کر لیتا ہے۔ اعلیٰ ترین قیمت ادا کرتا ہے۔ بندہ کو اپنے مال سے خریدتا ہے پھر قیمت و سامان دونوں دے کر بندہ کی تعریف کرتا ہے

اور اس معاملہ پر اس کی تعریف کرتا ہے حالانکہ اس کی توفیق و مشیت سے یہ معاملہ تمام ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اور جنت کی طرف بلانے والوں نے خوددار نفوس اور بلند ہمتوں کو متحرک کردیا۔ ایمان کے منادی نے گوش ہوش رہنے والوں کو اور خدا نے تمام زندہ لوگوں کو سنا دیا اور اس سماع سے منازل ابرار کی طرف حرکت ہوئی اور سفر کا سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب دارالقرار کی منزل آئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک و تعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں سے جو بندہ بھی میرے راستہ میں میری رضا کی خاطر نکلے گا' میں اسے ضمانت دوں گا کہ اسے جو اجر یا غنیمت ملے گا' اس کے ساتھ واپس کروں گا اور اگر میں نے اس کو لے لیا تو اسے بخش دوں گا۔ اس پر رحم کروں گا اور اسے جنت میں داخل کروں گا' اور فرمایا اگر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں کسی غزوہ سے غیر حاضر نہ ہوتا۔ میری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں۔

اور فرمایا کہ میں اس شخص کا ذمہ دار ہوں جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لایا اور فرمانبرداری کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ جنت میں وہ جہاں چاہے گا رہے گا۔ جو ایسا کرے گا' اس سے کوئی خیر فوت نہیں ہو گا اور نہ کسی شر کا ڈر رہے گا خواہ وہ جہاں چاہے مرے۔

اور فرمایا جو مسلمان اللہ کی راہ میں اونٹنی دوہنے بھر بھی جنگ کرے گا' اس کے لئے جنت واجب ہو جائے گی۔ مزید فرمایا' اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال اس شخص جیسی ہے جو روزہ رکھے' قیام کرے' تلاوت کرے اور اس میں کسی طرح سستی نہ کرے یہاں تک کہ وہ جہاد سے لوٹ آئے۔

اور فرمایا : راہ خدا میں صبح و شام کو چلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد جنت کا ایک دروازہ ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ رنج و غم سے نجات دیتا ہے۔

نیز فرمایا کہ : جنت میں سو درجات ہیں' جنہیں اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ ہر دو درجوں کے درمیان آسمان و زمیان کے برابر فاصلہ ہے۔ اس لئے جب اللہ سے درخواست کرو تو جنت فردوس کی درخواست کرو کیونکہ یہ اوسط اور اعلیٰ جنت ہے اور اس کے اوپر رحمٰن کا عرش بریں ہے اور یہیں سے جنت کی نہریں شروع ہوتی ہیں۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : جو اللہ کی راہ میں مجاہد اور مقروض کی ادائیگی قرض اور غلام کی آزادی میں مدد کرے' اللہ تعالیٰ اسے اپنے عرش کے سایہ میں جگہ دے گا۔ جس دن اس کے

علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔

اور فرمایا کہ جس کے قدم اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوئے' اللہ تعالیٰ انہیں آگ پر حرام کر دیتا ہے اور فرمایا بخل اور ایمان ایک آدمی کے قلب میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اللہ کی راہ کا غبار اور جہنم کا دھواں ایک بندے کے چہرے پر اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

فرمایا کہ ایک رات اور دن کے لئے گھوڑے کا باندھنا مہینہ بھر کے روزے اور قیام سے بہتر ہے۔ اگر ایسی حالت میں بندے کی موت ہو جائے گی تو اسے برابر اس عمل کا ثواب اور رزق ملتا رہے گا اور وہ فتنے سے مامون ہو جائے گا۔ ایک آدمی نے شروع رات سے صبح تک گھوڑے پر سوار ہو کر مسلمانوں کی حفاظت کی' اور نماز اور ضرورتوں کے سوا کسی اور کام کے لئے نہیں اترا' اس کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : کہ جنت اس پر واجب ہو گئی' اب اگر کچھ اور نہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔

ابو داؤد نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ جو جہاد نہ کرے' کسی غازی کا سامان نہ تیار کرے یا اس کے بال بچوں کی خبر گیری نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت سے پہلے کسی مصیبت میں مبتلا کر دے گا۔

حضرت ابو ایوب انصاری نے خود کو ہلاکت میں ڈالنے کی تفسیر "ترک جہاد" سے کی ہے۔ آپ سے یہ بھی ثابت ہے کہ جہنم کی آگ ریا کار عالم ریا کار خرچ کرنے والے اور ریا کار مقتول فی الجہاد سے بھڑکائی جائے گی۔

فصل (۶۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد میں اسوہ حسنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دن کے ابتدائی حصہ میں جہاد اور سفر میں نکلنے کو مستحب سمجھتے تھے۔ اگر ابتدائی حصہ میں لڑائی کی نوبت نہ آتی تو پھر زوال شمس کے بعد لڑائی شروع کرتے۔ جب ہوائیں چلنے لگتیں اور نصرت خداوندی کا نزول ہوتا۔ صحابہ کرام سے فرار نہ ہونے کی بیعت لیا کرتے۔ بسا اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت پر بھی بیعت لی ہے اور فتح سے قبل ہجرت پر بیعت لی ہے۔ اللہ کی توحید اور اس کے رسول کی اطاعت پر بیعت لی ہے۔ فقراء صحابہ سے اس بات پر بیعت لی ہے کہ وہ کسی سے کچھ نہ مانگیں گے۔ اس کے بعد حال یہ تھا کہ کسی کے ہاتھ سے کوڑا گر جاتا تو وہ اسے اٹھانے کے لئے خود اترتا لیکن کسی سے اٹھانے کے لئے نہ کہتا۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد اور اس کی حکمت عملی تیار کرنے کے لئے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کرتے تھے اور دوران سفر پیچھے رہنے والے کمزور کو ساتھ ملا کر چلتے تھے۔ اور چل نہ سکنے والے کو ساتھ سوار کر لیتے اور چلنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ نرم روی سے کام لیتے۔

جب آپ کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو جنگی چال سے کام لیتے اور فرماتے تھے۔ "لڑائی فراست کا نام ہے"۔ نیز آپ جاسوسوں کو بھی بھیجا کرتے تاکہ دشمن کی خبریں لائیں اور ان کی نقل و حرکت سے مطلع کریں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقدمتہ الجیش روانہ فرماتے اور محافظوں کو متعین فرماتے۔ جب دشمن کا سامنا ہو جاتا تو کھڑے ہو کر دعا فرماتے اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت طلب فرماتے اور آپ اور صحابہ کرام ایسے نازک موقعوں پر کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے اور اپنی آواز نرم رکھتے۔

میدان جنگ میں آپ لشکر کی صف آرائی فرماتے اور ہر جانب خیال رکھتے ہوئے صفیں مرتب فرماتے تھے اور آپ کے سامنے لوگ میدان کی طرف نکلتے اور آپ جنگ کے لئے مخصوص لباس زیب تن فرماتے تھے۔ بسا اوقات آپ نے دو زرہیں زیب تن کیں' نیز آپ کے پرچم اور جھنڈے بھی ہوتے۔

جب آپ کسی قوم سے مقابلہ کرتے تو فتح کے بعد تین دن تک وہاں ٹھہرتے' پھر واپس آتے تھے۔
جب حملہ کرنے کا ارادہ فرماتے تو انتظار فرماتے۔ اگر وہاں اذان کی آواز سنتے تو حملہ نہ کرتے ورنہ حملہ کردیتے تھے۔ کبھی آپ دشمن پر رات کو حملہ کرتے اور کبھی دن کو اچانک حملہ کردیتے۔ جمعرات کو صبح سویرے نکلنا پسند کرتے اور جب لشکر کسی جگہ اترتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دوسرے کو اس طرح ترتیب دیتے کہ اگر ان پر چادر ڈال دی جاتی تو سب کو کافی ہو جاتی۔
نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفیں مرتب کرتے اور جنگ کے وقت اپنے ہاتھ سے انہیں درست فرماتے اور کہتے اے فلاں آگے بڑھو' اے فلاں پیچھے ہٹ جاؤ۔ آپ اس آدمی کو پسند فرماتے جو اپنی قوم کے جھنڈے تلے جنگ کرے اور جب دشمن کے سامنے ہوتے تو یہ دعا پڑھتے تھے :

«اللهم منزل الكتاب ومجري السحاب وهازم الاحزاب اهزمهم وانصرنا عليهم»
اے اللہ' کتاب نازل کرنے والے اور بادل چلانے والے اور لشکروں کو شکست دینے والے' انہیں شکست دے اور ان کے خلاف ہماری مدد فرما۔
نیز یہ آیت بھی پڑھا کرتے تھے :
﴿ سَيُهْزَمُ ٱلْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ ٱلدُّبُرَ ۝ بَلِ ٱلسَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَٱلسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴾ [القمر : ٤٥-٤٦]
جماعت کو شکست ہوگی اور وہ پیٹھ پھیر لیں گے بلکہ ان کا وعدہ قیامت ہے اور قیامت زیادہ سخت اور تلخ ہے۔
اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بھی پڑھتے تھے :

«اللهم انزل نصرك اللهم انت عضدي وانت نصيري بك أقاتل»
اے اللہ' اپنی مدد نازل فرما' اے اللہ تو میرا بازو ہے' تو میرا مددگار ہے' تیرے ہی سہارے سے میں جنگ کرتا ہوں۔
جب جنگ خوب تیز ہو جاتی اور لڑائی شدت اختیار کر جاتی اور دشمن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھنے کا ارادہ کرتا تو فرمایا کرتے :
«أَنَا النَّبِيُّ لاَكَذِبَ أَنَاابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ»
میں سچا نبی ہوں اور عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہوں۔
اور جب لڑائی گھمسان کی ہو جاتی تو صحابہ کرام آپ کے پاس آکر بچاؤ حاصل کرتے تھے۔ میدان

جنگ میں آپ دشمن کے سب سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم لڑائی کے دوران صحابہ کا ایک نشان مقرر فرما دیتے جو کہ ایک طرح کا شناختی شعار ہوتا تھا۔ جب وہ آپس میں بولیں تو پہچان لئے جائیں۔ ایک بار ان کا شعار یہ تھا امـة امـة اور ایک بار حم لا ینصرون شعار تھا اور ایک دفعہ یا منصور شعار مقرر کیا گیا تھا۔

اور جنگ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم زرہ اور خود پہن لیتے اور تلوار لٹکاتے۔ نیزہ اور عربی کمان اٹھاتے اور ڈھال لیتے تھے اور لڑائی میں آپ اکڑ کو چلنے کو پسند کرتے تھے اور فرماتے تھے۔ بعض اکڑ اللہ کو محبوب ہے اور بعض ناپسند۔ لڑائی اور صدقہ کے موقع کی اکڑ کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور فسق وفجور کی اکڑ اسے ناپسند ہے۔

جنگ میں ایک دفعہ اہل طائف کے خلاف آپ نے منجنیق کا بھی استعمال کیا۔ آپ بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرماتے تھے۔ لڑائی کے دوران میں آپ جسے بالغ سمجھتے' اسے قتل کرتے اور جو بالغ نہ ہوتا' اسے قتل کرنے سے گریز کرتے تھے۔ جب کوئی لشکر بھیجتے تو اسے اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتے اور فرماتے :

«سیروا بسم الله و في سبیل الله ، قاتلوا من کفر بالله، و لا تمثلوا ولا تغدروا ولا تغلوا ولا تقتلوا ولیدا»

اللہ کے نام سے اللہ کی راہ میں جاؤ' کافروں سے جنگ کرو' مثلہ نہ کرو (یعنی حلیہ نہ بگاڑو) بدعہدی نہ کرو' زیادتی نہ کرو اور بچوں کو قتل نہ کرو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن لے کر دشمن کی سرزمین میں جانے سے منع کرتے تھے اور آپ لشکر کے امیر کو حکم دیتے کہ دشمن سے جنگ کرنے سے قبل اسے دعوت دی جائے یا اسلام اور ہجرت قبول کر لے یا ہجرت کے بغیر محض اسلام قبول کر لے لیکن اس صورت میں وہ مسلمانوں کی طرح غنیمت کا حقدار نہ ہوگا' اور یا پھر جزیہ ادا کرے۔ اگر یہ شرائط قبول ہوں تو ٹھیک ورنہ اللہ سے مدد و نصرت کی امید کرتے ہوئے ان سے جہاد کرو۔

اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دشمن پر فتحیاب ہوتے تو منادی کرنے کا حکم فرماتے اور تمام غنائم جمع کی جاتیں اور چھینی ہوئی چیزیں مالکوں کو دی جاتیں۔ پھر مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ (خمس) نکالتے اور باقی فوج پر تقسیم فرما دیتے۔ سوار کو تین حصے مرحمت فرماتے۔ ایک حصہ آدمی کا اور دو حصے

گھوڑے کے اور پیدل کو ایک حصہ عطا فرماتے۔ پہلے اسلامی مصالح میں خرچ فرماتے' جہاں مناسب خیال کرتے۔ اسی طرح کچھ حصہ ان افراد کو عطا فرماتے جن کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے جیسے عورتیں' بچے اور غلام اس طرح سے آپ سے مال غنیمت کا تقسیم کرنا صحیح طور پر ثابت ہے۔

مال غنیمت سے آپ بتقاضائے مصلحت بعض لوگوں کو مزید دیتے تھے۔ بعض غزوات میں سلمہ بن اکوع کو آپ نے سوار اور پیدل دونوں کے حصے دیئے تھے۔ یعنی کل پانچ حصے انہیں ملے کیوں کہ ان کی کارگزاری عظیم تھی۔ زائد حصہ کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کمزور و مضبوط سب کو برابر دیتے تھے۔ جب دشمن کے علاقے پر آپ چڑھائی کرتے اور وہاں پہلے کوئی لشکر بھیجتے تو اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی غنیمت کا پانچواں حصہ نکال کر بقیہ مال کا چوتھا حصہ اس لشکر کو دے دیتے۔ پھر باقی مال کو اس لشکر اور بقیہ تمام مجاہدوں کے مابین تقسیم فرما دیتے اور جب لشکر لوٹ آتا تو غنیمت حاصل کرنے والی ٹولی کو تیسرا حصہ دیتے اور اس کے باوجود زائد حصہ کو ناپسند کرتے اور فرماتے' مسلمانوں میں قوی ضعیف کو یہ حصہ لوٹا دے۔

مال غنیمت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی حصہ ہوتا تھا' اسے صفی کہتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا صفی میں سے تھیں۔ آپ کی ذوالفقار نام کی تلوار بھی صفی میں سے تھی۔ (ابوداؤد) مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر جو غزوہ سے غائب ہوتا تو اس کا بھی آپ حصہ مقرر فرماتے جیسے آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا غزوہ بدر میں حصہ مقرر کیا۔ جب وہ غزوہ بدر میں آپ کی صاحبزادی کی تیمارداری کے باعث حاضر نہ ہو سکے۔ آپ نے فرمایا : عثمان اللہ اور اس کے رسول کے کام میں ہیں' چنانچہ ان کا حصہ نکالا گیا۔

نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنگ کے موقع پر خرید و فروخت کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھتے اور منع نہ فرماتے۔ صحابہ کرام غزوات میں دو طرح سے خدمات مستعار لیتے تھے۔ ایک یہ کہ آدمی جہاد کے لئے جائے اور اثنائے سفر میں خدمت کے لئے آدمی نوکر رکھ لے۔ دوسرے یہ کہ جو جہاد میں نکلا اس میں سے کسی کو اجرت پر متعین کر لے' اسے جاعل کہا کرتے تھے۔ اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "غازی کے لئے اس کا اپنا اجر ہے اور جاعل کے لئے اس کی اجرت اور غازی کے حصہ میں بھی برابر کا شریک ہوگا"۔

مال غنیمت میں دو طرح شرکت کیا کرتے تھے۔ ایک شرکت بدنی' دوسرے یہ کہ ایک آدمی اپنا

اونٹ یا گھوڑا دوسرے کو اس شرط پر دیتا تھا کہ اس پر سوار ہو کر جہاد کرے اور جو مال غنیمت ملے' اس کا نصف اسے ادا کرے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک تیر کے دو حصے کئے گئے' چنانچہ ایک کو تیر مل گیا اور دوسرے کو اس کا پھل اور پر ملا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں' حضرت عمار اور سعد (رضی اللہ عنہم) نے غزوہ بدر کے دن مشارکت کی۔ حضرت سعد دو قیدی لے آئے۔ میں اور عمار خالی ہاتھ آئے۔

کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوار فوج اور کبھی پیدل فوج بھیجتے تھے لیکن فتح ہو جانے کے بعد جو آتا' اس کا حصہ مقرر نہ فرماتے۔ قرابت داروں کا حصہ آپ بنو عبد شمس اور بنو نوفل کے سوا صرف بنو ہاشم اور بنو المطلب کو دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ بنو مطلب اور بنو ہاشم دونوں ایک چیز ہیں (انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کر کے آپ اشارہ فرماتے) انہوں نے ہم کو دور جاہلیت اور اسلام دونوں میں نہیں چھوڑا۔

غزوات میں آپ کے ہمراہ مسلمان شہد' انگور اور کھانے کی چیزیں حاصل کرتے تو کھا لیتے اور اسے بطور مال غنیمت نہ شمار کرتے تھے۔ حضرت ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا' کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کھانے کی اشیاء کا خمس دیا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا : فتح خیبر کے دن ہمیں کھانے کی چیزیں ہاتھ لگیں۔ جو بھی آتا حسب ضرورت لے کر چلا جاتا۔ بعض صحابہ سے مروی ہے کہ ہم غزوات میں' اخروٹ کھا لیا کرتے تھے اور تقسیم نہ کرتے تھے' یہاں تک کہ ہم اپنے سامان سفر کے پاس آتے اور اسے بھرا ہوا پاتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت پر لوٹ مار کرنے اور غزوات میں دشمن کی ناک' کان کاٹنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ "مال غنیمت میں لوٹ مار کرنے والا ہم میں سے نہیں"۔

نیز آپ نے مال غنیمت کے جانور پر سواری کرنے کی ممانعت فرمائی کہ جب کمزور ہو جائے تو لوٹا دے اور اس طرح مال غنیمت میں سے لباس پہنے کہ جب پرانا ہو جائے تو لوٹا دے۔ البتہ حالت جنگ میں اس سے استفادہ کرنے کی ممانعت نہیں فرمائی۔

مال غنیمت میں خیانت سے آپ انتہائی سختی سے ممانعت کرتے اور فرماتے تھے : یہ قیامت کے دن اس کے مرتکب پر باعث عار' باعث آگ اور باعث رسوائی ہوگی۔ جب آپ کا غلام مدعم زخمی ہوا تو بعض صحابہ نے کہا کہ اسے جنت مبارک ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ہرگز نہیں' قسم اس

ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' خیبر کے دن مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے جو چادر اس نے لی تھی وہ آگ بن کر اس پر بھڑک رہی ہے۔ یہ سن کر ایک شخص دو تسمے لے آیا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک یا دو تسمے بھی آگ ہو جائیں گے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کے نگہبان کا انتقال ہو گیا تو آپ نے اس کے متعلق فرمایا : وہ جہنم میں ہے۔ لوگ اس کو دیکھنے گئے تو اس نے ایک عبا چرا رکھی تھی۔

اسی طرح بعض غزوات میں لوگوں نے کہا : فلاں شہید ہے' فلاں شہید ہے' یہاں تک کہ ایک شخص کے متعلق کہا کہ یہ بھی شہید ہے۔ تو یہ سن کر آپ نے ارشاد فرمایا' ہرگز نہیں' میں نے اس کو جہنم میں دیکھا ہے کیونکہ اس نے ایک عباء یا چادر چرائی تھی۔ پھر آپ نے فرمایا' اے ابن خطاب' لوگوں میں جا کر تین بار یہ اعلان کر دو کہ جنت میں صرف مومنین ہی داخل ہوں گے۔

جب مال غنیمت حاصل ہوتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال کو حکم دیتے تھے کہ لوگوں میں اعلان کرو کہ اپنا اپنا مال غنیمت لے کر حاضر ہوں تو آپ خمس نکالنے کے بعد اسے تقسیم فرما دیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص اس منادی اور تقسیم کے بعد ایک بال والی لگام لے کر حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا تم نے بلال کی منادی نہیں سنی۔ اس نے کہا : سنی تھی' آپ نے فرمایا "پھر کیوں نہیں لے کر آئے"۔ اس نے معذرت چاہی' تو آپ نے کہا' اب تو تم اسے قیامت کے دن لے کر آؤ گے۔ میں اسے ہرگز قبول نہیں کروں گا۔

آپ نے مال غنیمت میں چوری کردہ مال کو جلا دینے کا حکم فرمایا۔ اسی طرح آپ کے دونوں خلفاء نے ایسا ہی کیا اور خائن کو مارا بھی گیا۔

علماء کا قول ہے کہ یہ ان احادیث سے منسوخ ہے جو مذکور ہوئیں کیوں کہ ان میں جلانے کا ذکر نہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ ایسا کرنا ایک طرح کی تعزیر اور مالی سزا ہے جس کا تعلق مصلحت کے مطابق ائمہ کے اجتہاد سے ہے' جیسا کہ شراب پینے والوں کو تیسری یا چوتھی بار قتل کر دیا جاتا ہے۔

فصل (۶۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیدیوں کے ساتھ معاملے کا طریقہ

جنگی قیدیوں میں سے بعض کو از راہ احسان آپ صلی اللہ علیہ وسلم رہا کر دیتے تھے اور بعض سے فدیہ لے لیتے اور چھوڑ دیتے اور بعض کو قتل کروا دیتے اور بعض کو مسلمان قیدیوں کے عوض میں رہا کر دیتے تھے۔ حسب تقاضائے مصلحت آپ نے یہ تمام صورتیں اختیار فرمائیں۔

حضرات انصار نے اجازت چاہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فدیہ کی رقم نہ لی جائے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک درہم بھی نہ چھوڑا جائے۔

ہوازن کے قیدیوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم کے بعد واپس کر دیا تھا اور غنیمت کے مستحق صحابہ نے اسے بخوشی منظور کر لیا تھا۔ جن لوگوں کو کچھ تردد تھا' انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فی کس کے عوض چھ حصے دیئے۔

امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس کی حدیث نقل کی ہے کہ کچھ قیدی ایسے تھے جن کے پاس فدیہ دینے کے لئے مال نہ تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا فدیہ یہ مقرر فرمایا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال کے علاوہ کسی کام کو بھی فدیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور صحابہ کے طرز عمل سے یہ ثابت ہے کہ عرب قیدیوں کو غلام بنانا اور لونڈیوں کو خرید کر صحبت کرنا صحیح ہے' اسلام کی شرط اس میں نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باندی سے اس کے بچے کو علیحدہ کرنے سے منع فرماتے تھے اور فرمایا کرتے "جو ماں اور اس کے بچے کے درمیان جدائی ڈالے گا' قیامت کے روز اللہ اس کے اور اس کے محبوب کے درمیان جدائی ڈال دے گا"۔

ایک گھرانہ کے سبھی لوگوں کو عطا فرماتے تاکہ ان میں جدائی نہ پیدا ہو۔ آپ سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین میں سے ایک جاسوس کو قتل کیا اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے

حاطب کو قتل نہیں کیا' حالانکہ انہوں نے جاسوسی کی تھی۔اور وہ غزوہ بدر میں موجود تھے۔

اس واقعہ سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ مسلمان جاسوس کو قتل نہ کیا جائے اور امام مالک اور امام احمد کے شاگرد ابن عقیل وغیرہ قتل کا فتوی دیتے ہیں۔ اس لئے کہ اس واقعہ میں غزوہ بدر میں حاضری ایک ایسی وجہ ہے جو قتل کی مانع ہے جو کہ دوسرے مسلمان جاسوسوں میں نہیں پائی جاتی کیونکہ اگر صرف اسلام مانع قتل ہوتا تو یہ وجہ نہ بتائی جاتی بلکہ انکا صرف مسلمان ہونا کافی سمجھا جاتا اور یہی رائے زیادہ قوی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت طیبہ یہ تھی کہ مشرکین کے غلام اگر مسلمانوں کے علاقہ میں آ جاتے تو انہیں آزاد سمجھتے جب وہ مسلمان ہو جاتے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ کوئی مسلمان ہو جاتا تو اس کے پاس جو کچھ ہوتا اس کے پاس رہنے دیتے۔

نیز زمانہ کفر اور حالت جنگ میں کافر مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی جانی و مالی نقصان پہنچا چکے ہوں اسلام لانے کے بعد ان سے وہ اموال واپس نہیں کرواتے تھے۔

فصل (۶۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غنیمت کی زمین کی تقسیم کا طریقہ

آپ سے ثابت ہے کہ آپ نے بنی قریظہ' بنی نضیر اور خیبر کی نصف زمین غانمین کے درمیان تقسیم فرمائی اور خیبر کی زمین کا دوسرا نصف حصہ وفود کے استقبال و ضیافت اور ناگہانی حوادث سے متاثر افراد کے تعاون کے لئے مختص فرما دیا' اور مکہ کی زمینیں تقسیم نہیں فرمائی' کیونکہ وہ مناسک حج کی جگہ ہے اور مسلمانوں پر وقف ہے۔

علماء کی ایک جماعت کا زمینوں کی تقسیم کے سلسلہ میں یہ خیال ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ تقسیم کر دے یا وقف رہنے دے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کو تقسیم فرمادیا اور مکہ مکرمہ کی زمینوں کو نہیں تقسیم فرمایا اس سے دونوں امور کا جواز نکلتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زمین غنائم کا ماموره میں شامل نہیں ہے' بلکہ غنائم کا اطلاق تو صرف چوپاؤں اور منقولہ جائداد پر ہی ہو سکتا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے سوا کسی دوسری امت پر غنائم کو حلال قرار نہیں دیا' اور ان کے لئے دار الکفر مباح قرار دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جس میں فرعون اور اس کی قوم اور ان کی زمینوں کا ذکر کیا ہے۔

﴿ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴾

ہم نے بنی اسرائیل کو ان زمینوں کا وارث بنا دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین غنائم کے تحت شمار نہیں ہوتی۔ امام کو اختیار حاصل ہے کہ مصلحت وقت کے لحاظ سے جو چاہے کرے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم بھی کیا اور ترک بھی کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تقسیم نہیں کیا' بلکہ اس طرح رہنے دیا اور اس پر دوامی ٹیکس عائد کر دیا تاکہ امور جنگ میں اس سے مدد لی جا سکے اور زمین کے وقف کا یہی مفہوم ہے' نہ یہ کہ اس سے ملکیت کی منتقلی ناجائز ہے' بلکہ اس کی بیع جائز ہے جیسا کہ امت کا تعامل ہے' اور علماء کا اس

بات پر اجماع ہے کہ ایسی زمین کی وراثت جائز ہے۔ امام احمد نے وضاحت کی ہے کہ ایسی زمین کو مہر میں دیا جا سکتا ہے اور وقف کو بیچنا اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے جن پر وقف کیا گیا ہے ان کا حق ضائع ہو جاتا ہے اور فوجیوں کو خراج کی زمین میں حق ہوتا ہے جو بیع سے باطل نہیں ہوتا۔ اس کی نظیر مکاتب غلام کی بیع ہے اس کے اندر کتابت سے حریت کا سبب منعقد ہے۔ اس لئے وہ مشتری کی طرف مکاتب ہی منتقل ہو گا جیسا کہ بائع کے پاس تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے درمیان کسی مسلمان کی رہائش کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اگر وہ وہاں سے ہجرت کر سکتا ہو اور فرمایا کہ : میں ہر مسلمان سے بیزار ہوں جو کہ مشرکین کے درمیان رہائش پذیر ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں ؟ فرمایا کہ کیا تو انہیں دیکھ نہیں رہا' یعنی اس کے دوزخی ہونے کو۔ پھر فرمایا کہ جو کوئی کسی کے ساتھ اکٹھا رہا وہ اسی طرح ہے۔ مزید فرمایا' "جب تک توبہ منقطع نہیں ہوتی' اس وقت تک ہجرت منقطع نہ ہوگی اور جب تک سورج مغرب سے نہیں نکلتا' اس وقت تک توبہ منقطع نہ ہوگی"۔ اور مزید فرمایا : عنقریب ہجرت کے بعد ہجرت ہوگی۔ اس لئے زمین پر سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام ہجرت سے پیوستہ رہیں اور زمین پر شریر لوگ باقی رہ جائیں گے اور وہ انہیں پھینک دے گی۔ اللہ تعالیٰ بندروں اور سوروں کے ساتھ ان کا حشر کرے گا۔

فصل (۶۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امان، صلح، جزیہ، اہل کتاب اور کفار و منافقین کے ساتھ معاملے کا طریقہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا : "مسلمانوں کا ذمہ ایک ہے، معمولی مسلمان بھی اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو کسی مسلمان کے ساتھ غداری کرے گا تو اس پر اللہ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی کوئی عبادت قبول نہ کرے گا"۔

نیز آپ نے فرمایا جس شخص کا کسی قوم سے معاہدہ ہو وہ اس کی مدت گذرنے تک اسے نہ توڑے البتہ آگاہی کے بعد اسے ختم کر سکتا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جس شخص نے کسی آدمی کو امان دینے کے بعد قتل کر دیا میں اس سے بری ہوں۔ آپ سے یہ بھی منقول ہے کہ جب کوئی قوم بدعہدی کرتی ہے تو اس پر دشمن کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو کفار کے تین گروہ تھے۔

۱۔ ایک گروہ نے آپ سے صلح کر لی اور وعدہ کیا کہ نہ آپ سے جنگ کریں گے، نہ آپ پر حملہ کریں گے اور نہ آپ کے خلاف دشمنوں کی مدد کریں گے۔

۲۔ دوسرے گروہ نے آپ سے جنگ کی اور مخالفت پر اتر آیا۔

۳۔ تیسرے گروہ نے نہ جنگ کی اور نہ صلح کی، بلکہ خاموشی سے مستقبل کے نتائج پر نظر رکھے رہا۔

ان جماعتوں میں سے بعض درپردہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہ چاہتے اور آپ سے تعاون کو پسند کرتے، اور بعض آپ کے دشمنوں کے غلبہ و استیلاء کے منتظر تھے۔ اور بعض ایسے بھی تھے جو ظاہری طور پر آپ کے ساتھ مل گئے اور درپردہ دشمنوں سے ساز باز رکھتے تھے۔ آپ نے ہر گروہ کے ساتھ امر الہی کے مطابق برتاؤ کیا۔

چنانچہ مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ آپ نے صلح کرلی' لیکن غزوہ بدر کے بعد بنو قینقاع نے آپ سے جنگ کی' کیونکہ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی ان کو اچھی نہ لگی' اور حسد و بغض وعناد کی آگ بھڑک اٹھی اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔

ان کے بعد بنو نضیر نے بھی عہد شکنی کی۔ آپ نے ان کا محاصرہ فرمایا۔ ان کے کھجور کے باغات کو کاٹ کاٹ کر آگ لگا دی۔ آپ نے ان کو مدینہ سے اس شرط پر نکلنے کی اجازت دی کہ ہتھیاروں کے علاوہ دیگر سامان اس قدر لے جاسکتے ہیں جو اونٹ اٹھائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا واقعہ سورہ حشر میں بیان کیا ہے۔

اس کے بعد بنو قریظہ نے عہد شکنی کی' اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن تھے اور کفر میں غیر معمولی سخت تھے' اس لئے دوسرے یہودیوں کے مقابلہ میں ان کے ساتھ زیادہ سخت معاملہ کیا گیا۔ یہ واقعات یہود مدینہ کے ساتھ پیش آئے۔ آپ ہر بڑے غزوہ کے بعد یہودیوں کی کسی نہ کسی جماعت کے ساتھ جنگ کے لئے مجبور ہوئے' چنانچہ غزوہ بدر کے بعد بنو قینقاع کے ساتھ احد کے بعد بنو نضیر کے ساتھ اور خندق کے بعد بنو قریظہ سے جنگ کرنی پڑی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ جب آپ کسی قوم سے مصالحت و معاہدہ کرتے تو جو بھی اس قوم کا حلیف بن جاتا' اسے بھی معاہدہ میں شریک کرلیتے اور اگر اس کا کوئی فرد معاہدہ کی خلاف ورزی کرتا اور باقی لوگ معاہدہ کے پابند رہتے تو آپ تمام افراد سے جنگ کرتے' جیسا کہ بنو نضیر' بنو قریظہ اور اہل مکہ کے ساتھ ہوا۔ معاہدین کے بارے میں یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ تھی۔

امام احمد اور ان کے علاوہ علماء کے قول کے مطابق ذمیوں کے بارے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا' لیکن امام شافعی کے اصحاب اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان افراد کے حق میں عہد توڑنے کی اجازت دی جائے جو اسے توڑیں' لیکن جو لوگ عہد کے پابند اور معترف ہوں ان کے ساتھ پابندی ضروری ہے۔ دونوں صورتوں میں انہوں نے یہ کہہ کر امتیاز کیا ہے کہ ذمہ کا معاملہ زیادہ پابندی کا مستحق ہے' بایں ہمہ پہلی رائے زیادہ راجح و مفید ہے۔

جب شام میں عیسائیوں نے مسلمانوں کا مال جلا دیا تھا اور ان میں سے جن کو علم تھا انہوں نے حاکموں کو اطلاع دینے کے بجائے ظالموں کا ساتھ دیا تھا تو ایسی صورت میں ہم نے یہی فتویٰ دیا تھا کہ خیانت کرنے والوں کی سزا قتل ہے۔ امام کو ان کے بارے میں کسی طرح کا اختیار نہیں' بس قتل کو بطور

حد نافذ کیا جائے گا۔ جو لوگ معاہدہ کے تحت ہوں اور قانون ملت کے پابند ہوں' اسلام ان پر بطور حد واجب ہونے والے قتل کو معاف نہیں کرتا۔ بخلاف جنگجو کافر کے کہ جب وہ اسلام قبول کرلے تو اس کا حکم دوسرا ہوتا ہے' اور وہ ذمی جو کہ صاحب معاہدہ ہو پھر عہد شکنی کرے تو اس کا دوسرا حکم ہے۔ امام احمد کی تصریحات سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے اور ہمارے شیخ (ابن تیمیہ) نے بارہا ایسا ہی فتوی دیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ بھی تھی کہ جب کسی قوم کے ساتھ مصالحت کرتے اور ان کے ساتھ آپ کے دوسرے دشمن شریک ہوتے اور معاہدہ میں داخل ہو جاتے اور اسی طرح اور دوسرے لوگ بھی اس میں شامل ہوتے تو آپ کے کافر معاہدین کے ساتھ جنگ کرنے والے آپ کے ساتھ جنگ کرنے والے تصور کئے جاتے۔ اس وجہ سے آپ نے اہل مکہ پر حملہ کیا تھا۔ اسی وجہ سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی مشرقی نصاری سے جنگ کرنے کا فتوی دیا تھا' کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں تاتاریوں کی مالی اور ہتھیاروں سے مدد کی تھی اگرچہ وہ خود نہیں لڑے تھے۔ اسوجہ سے انہیں عہد شکنی کا مرتکب مانا گیا اور جب ذمی لوگ باہر کے مشرکین کی مسلمانوں کے خلاف مدد کریں تو کس طرح انہیں عہد شکن قرار نہ دیا جائے گا۔ (یعنی وہ یقیناً اسلامی ریاست کے باغی ہیں)۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دشمنوں کی جانب سے قاصد حاضر ہوتے۔ آپ انہیں نہ تکلیف دیتے اور نہ قتل کرتے' اور جب آپ کے پاس مسیلمہ کذاب کے دو قاصد عبداللہ بن نواحہ اور ابن اثال حاضر ہوئے تو آپ نے دریافت فرمایا کہ تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگے جیسا مسیلمہ نے کہا ہے ویسا ہی ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اگر قاصدوں کو قتل کرنا جائز ہوتا تو میں تم دونوں کی گردن مار دیتا' چنانچہ آپ کی سنت طیبہ جاری ہو گئی کہ قاصد کو قتل نہ کیا جائے۔ نیز آپ کی عادت طیبہ یہ بھی تھی کہ جب قاصد دین اسلام قبول کرلیتا تو آپ اپنے پاس نہ روکتے تھے بلکہ واپس کر دیتے تھے ' جیسا کہ ابورافع رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ قریش نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قاصد بنا کر بھیجا اور جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے دل میں اسلام کی محبت آگئی۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں لوٹ کر ان کے پاس نہ جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا:

میں عہد شکنی نہیں کروں گا اور قاصدوں کو نہیں روکوں گا۔ تم واپس لوٹ جاؤ۔ وہاں جا کر بھی اسلام کی محبت و رغبت محسوس کرو تو دوبارہ واپس آجاؤ۔

امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ یہ اس زمانہ میں واقع ہوا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے

صلح حدیبیہ کر رکھی تھی، جس میں شرط یہ تھی کہ جو مکہ سے مدینہ آئے گا' اسے لوٹانا ہوگا اگرچہ وہ مسلمان ہو چکا ہو' لیکن آج کل یہ صورت نہ ہوگی۔ قاصدوں کو نہ روکنے کی جو بات آپ نے فرمائی' اس میں اشارہ ہے کہ یہ مطلق قاصدوں کے ساتھ خاص ہے لیکن مسلمان ہو کر آنے والوں کو واپس کرنے کی بات شرط پر موقوف ہے' اگر شرط نہ ہو تو انہیں واپس نہیں کیا جائے گا' لیکن قاصدوں کا حکم دوسرا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ یہ تھی کہ اگر آپ کے دشمن آپ کے کسی صحابی سے معاہدہ صلح کر لیتے تو آپ اس معاہدہ کو جس سے مسلمانوں کے نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو برقرار رکھتے' جیسے کہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد نے کفار کے ساتھ معاہدہ کر لیا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے خلاف جنگ نہ کریں گے' تو آپ نے اسے جاری رہنے دیا' اور فرمایا کہ تم دونوں واپس جاؤ جو عہد کیا ہے' اسے پورا کرو اور ہم کافروں کے مقابلہ میں صرف اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتے ہیں۔

قریش نے آپ سے دس سال کے لئے معاہدہ (جنگ بندی) کر لیا اور یہ بھی شرط رکھ دی کہ جو بھی مسلمان ہو کر (مدینہ) جائے اسے واپس کرنا ہوگا اور جو (مدینہ) سے (مکہ) چلا آئے اسے وہ واپس نہ کریں گے۔ مردوں اور عورتوں کے متعلق یہ الفاظ عام تھے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے متعلق یہ شق منسوخ فرمادی اور صرف مردوں کے حق میں رہنے دی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور مومنین کو حکم دیا کہ اگر ان کے پاس کوئی عورت آجائے تو اس کا امتحان لو۔ اگر مومنہ سمجھو تو اسے کفار کی طرف واپس نہ کرو' صرف اس کا مہر واپس کر دیا جائے۔

آپ نے مسلمانوں کو حکم فرمایا کہ اگر کوئی عورت ہجرت کر کے ان کے پاس آجائے تو اسے اس کے مشرک شوہر کے پاس نہ لوٹائیں بلکہ صرف اس کا مہر واپس کر دیں۔ اس سے یہ حکم معلوم ہوتا ہے کہ شوہر کی ملکیت سے عورت کے نکلنے کی قیمت دی جائے گی اور اس میں مہر مثل کے بجائے متعین مہر کا اعتبار ہوگا۔

اس سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ کفار کے نکاح صحیح ہیں' اور مسلمان عورت کو کفار کی طرف واپس کرنا جائز نہیں ہے اگرچہ اس کی شرط بھی کسی معاہدہ میں لگا دی جائے' نیز مسلمان عورت کا کافر مرد سے نکاح جائز نہیں اور یہ کہ مسلمان مرد ہجرت کرنے والی عورت سے عدت پوری ہونے کے بعد نکاح کر سکتا ہے اور اس کے مہر کی ادائیگی کرنی ہوگی۔

نیز اس میں واضح دلیل ہے کہ عورت شوہر کی حقیت سے نکل جاتی ہے اور ہجرت سے نکاح فسخ ہو

جاتا ہے' اور کافر عورت کا نکاح مسلمان مرد سے اور مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے حرام ہے۔ اور یہ مسائل قرآنی آیات سے ماخوذ ہیں۔ ان میں سے بعض پر علماء کا اتفاق ہے اور بعض میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور اس کو منسوخ جاننے والوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے' اس لئے کہ شرط مردوں کے ساتھ خاص ہے' عورتیں اس میں داخل نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کو واپس لوٹانے سے منع فرمایا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر کو واپس کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ جس شخص کی عورت مسلمانوں کے پاس آجائے اسے مقررہ مہر دیا جائے گا۔ پھر یہ فرمایا کہ حکم بندوں کے لئے دیا گیا ہے اور حکمت پر مبنی ہے۔ اور اس کے خلاف کوئی دوسرا حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں۔ آپ نے جب کفار سے مردوں کو واپس لوٹانے کی شرط پر مصالحت کی تو انہیں جو ان کے پاس آئے' اسے لینے سے منع نہیں فرمایا' نہ اسے لوٹنے پر مجبور کیا' نہ اس کا حکم دیا۔ اس طرح آنے والا اگر کافروں میں سے کسی کو قتل کر دیتا یا مال لے لیتا تو آپ اسے ناپسند نہ فرماتے اور کوئی ضمانت یا تاوان نہ دیتے' کیوں کہ ایسا کرنے والا آپ کے دائرہ اختیار سے باہر ہوتا تھا' اور اس کو آپ نے کسی کام کا حکم بھی نہیں دیا تھا' اور جان و مال کی امان سے متعلق جو معاہدہ صلح آپ نے کیا تھا' اس کا تقاضا صرف یہ تھا کہ ماتحت لوگوں کی ذمہ داری قبول کی جائے جیسا کہ بنو جذیمہ کے لئے ان کے املاک و اموال کی ذمہ داری آپ نے اٹھائی تھی جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں تباہ ہو گئے تھے۔ آپ نے حضرت خالد کے فعل پر ناپسندیدگی اور اس سے براءت کا بھی اظہار کیا تھا۔

چونکہ حضرت خالد نے بطور تاویل ایسا کیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو جذیمہ کے غزوہ کا حکم فرمایا تھا' اس لئے تاویل و شبہ کی وجہ سے نصف دیت کا تاوان دیا گیا اور انہیں اہل کتاب کے حکم میں رکھا گیا۔ جو ذمہ کی وجہ سے تحفظ کے مستحق ہیں' اسلام کی بنیاد پر نہیں۔ اور صلح کے معاہدہ کا تقاضا یہ نہ تھا کہ ایسے لوگوں کے خلاف مدد کی جائے جن پر قبضہ نہیں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاہدین سے اگر ایسے لوگ جنگ کریں جن پر امام کا قبضہ و تسلط نہ ہو' خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں تو امام پر ان کو روکنا ضروری نہ ہو گا اور نہ نقصان کا تاوان واجب ہو گا' اور جنگ' مصالح اور سیاست سے متعلق احکام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے اخذ کرنا رائے اور قیاس کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

اس بنیاد پر اگر مسلمان بادشاہ اور ذمیوں کے مابین معاہدہ ہو تو دوسرے بادشاہ کے لئے جس کے ساتھ

ذمیوں کے معاہدہ نہ ہو جائز ہوگا کہ ان پر حملہ کرے' جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ملطیہ کے نصرانیوں کے بارے میں فتویٰ صادر فرمایا تھا اور ابوبصیر کے واقعہ سے استدلال فرمایا تھا۔

اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر پر غلبہ اور فتح حاصل کرنے کے بعد ان سے معاہدہ کیا کہ وہ جلاوطن ہو جائیں البتہ اپنے اونٹوں پر لاد کر جتنا سامان لے جاسکتے ہوں لے جائیں۔ باقی سونا چاندی اور ہتھیار آپ کی ملکیت ہوں گے۔

معاہدہ صلح کی ایک شرط یہ تھی کہ کوئی چیز نہ چھپائیں' نہ غائب کریں' اگر ایسا کیا تو پھر نہ وہ مسلمانوں کے ذمہ میں رہیں گے' نہ معاہدہ صلح قائم رہے گا' لیکن انہوں نے ایک مشک غائب کردی جس میں حی بن اخطب کا مال تھا جسے وہ بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت اپنے ساتھ خیبر لے آیا تھا۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حی ابن اخطب کے چچا سے فرمایا : حی جو مشک بنو نضیر سے لایا تھا' اس کا کیا ہوا؟ وہ کہنے لگا کہ وہ اخراجات اور جنگوں میں ختم ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معاہدے کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ اتنا زیادہ کیسے خرچ ہو گیا' حالانکہ حی بنو قریظہ کے ساتھ قتل ہو گیا تھا۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت زبیر کے حوالے کیا تاکہ اسے محبوس رکھیں۔ انہوں نے اس پر سختی کی تو اس نے ایک ویرانے کی نشاندہی کی' چنانچہ وہاں گئے' تلاش کیا تو مشک مل گئی۔ ان کی اس عہد شکنی کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو حقیق کے دونوں بیٹوں کو قتل کرا دیا۔ ان میں ایک حی بن اخطب کی لڑکی صفیہ کا شوہر تھا' ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا' اور ان کے اموال کو تقسیم کر دیا' اور خیبر سے انہیں نکالنے کا فیصلہ فرما لیا۔ اس موقع پر یہودیوں نے کہا آپ ہمیں رہنے دیجئے' ہم اس علاقہ سے خوب واقف ہیں' زمین کی کاشت کریں گے' چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابہ کے پاس اس قدر آدمی بھی نہ تھے جو یہ ذمہ داری اٹھا سکتے' چنانچہ آپ نے یہ علاقہ اس شرط پر ان کے سپرد کر دیا کہ اس زمین میں جو پیداوار ہوگی اس کا نصف مسلمانوں کو اور نصف انہیں ملے گا۔ اور جب تک آپ چاہیں گے یہ لوگ یہاں آباد رہیں گے۔ بنو قریظہ کی طرح ان کا قتل عام نہ کیا کیونکہ بنو قریظہ کے تمام لوگ عہد شکنی میں شریک تھے' لیکن ان لوگوں کا معاملہ مختلف تھا۔ جن لوگوں نے مشک کو چھپا کر بدعہدی کی تھی' وہ شرط کے خلاف ورزی کی بنا پر قتل کئے گئے تھے' لیکن خیبر کے بقیہ یہودی چونکہ اس سے واقف نہ تھے اس لئے انہیں سزا نہیں دی گئی۔ یہ ایسے ذمی اور معاہد کی مثال ہے جو بدعہدی کا مرتکب ہو اور اس میں دوسرے اس کا ساتھ نہ دیں۔

زمین کو نصف پیداوار پر دینا مساقات اور مزارعت کے جواز کی دلیل ہے اور اگر کھجور کا درخت ہو پھر بھی اس صورت میں کوئی فرق نہیں پڑتا' کیوں کہ کسی چیز کا جو حکم ہوتا ہے وہی اس کی نظیر کا بھی ہوتا ہے۔ اس لئے انگور اور انجیر کے درختوں والے علاقہ کا جو حکم ہوگا وہی کھجور والے علاقہ کا بھی ہوگا' دونوں میں کوئی امتیاز نہ ہوگا۔

نیز اس واقعہ سے یہ وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ مالک زمین کی جانب سے بیج دینا بھی ضروری نہیں' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک حصہ پر مصالحت کی اور انہیں بیج نہیں دیا تھا اور یہ چیز اتنی قطعیت سے ثابت ہے کہ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ اگر زمین پر کام کرنے والے کی طرف سے بیج مہیا کرنے کی شرط لگا دی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

جن لوگوں نے بیج کے لئے مالک زمین کی طرف سے ہونے کی شرط لگائی ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں' صرف انہوں نے مزارعت کو مضاربت پر قیاس کیا ہے' لیکن یہ بات خود ان کے خلاف ہے' کیونکہ مضاربت میں اصل پونجی مالک کو واپس مل جاتی ہے' اور پھر مالک اور کام کرنے والے دونوں نفع تقسیم کر لیتے ہیں' اور اگر مزارعت میں اس کی شرط لگا دی جائے تو ان کے نزدیک یہ باطل ہو جائے گی' کیونکہ انہوں نے بیج کو راس المال کی جگہ پر نہیں رکھا ہے' بلکہ اس کی حیثیت دیگر سبزیوں کی ہے چنانچہ بیج پانی اور منافع کا حکم رکھتا ہے' کیونکہ کھیتی تنہا اسی سے تیار نہیں ہوتی' بلکہ سینچائی اور دوسری محنت ضروری ہوتی ہے' بیج سڑتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ دوسرے اجزاء کو ملا کر کھیتی تیار کرتا ہے۔ ان اجزاء میں پانی' ہوا' دھوپ' مٹی' محنت سب داخل ہیں' اس لئے بیج کا حکم دوسرے اجزاء جیسا ہے' نیز زمین راس المال کی نظیر ہے' اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ بیج کاشتکار ہی کو دینا چاہیے' مالک زمین کو نہیں' مزارع کی وہی حیثیت ہے جو مضارب کی ہے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مصالحت وقت مقرر کئے بغیر بھی کی جا سکتی ہے' بلکہ امام کی صوابدید پر ہوگا' اور اس پر کہ کوئی چیز معاہدہ کو منسوخ کرنے والی سامنے نہ آجائے لیکن ایسی صورت میں امام آگاہی کے بغیر دشمنوں سے جنگ نہیں کر سکتا' انہیں آگاہی دینی ضروری ہے تاکہ معاہدہ کے خاتمہ کا سب کو علم ہو جائے۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ متہم شخص کو سزا دی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلاواسطہ خزانہ کا پتہ بتا دے' لیکن امت کے لئے متہم لوگوں کے حق

میں قانون بنانے کے ارادہ سے مذکورہ صورت پیدا کی گئی' اور رحمت و آسانی کے لئے احکام میں گنجائش کی راہ نکالی گئی۔

اس واقعہ میں قرینہ کے اعتبار کا بھی ثبوت ملتا ہے' کیونکہ آپ نے فرمایا تھا کہ مدت مختصر اور مال زیادہ تھا پھر کیسے خرچ ہو جائے گا۔ اللہ کے نبی سلیمان علیہ السلام نے بھی لڑکے کی ماں کو متعین کرنے میں یہی صورت اختیار کی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ واقعہ داستان گوئی کے لئے نہیں سنایا تھا' بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ احکام میں اس سے عبرت اندوز ہوں۔

اسلام میں قسامت کا حکم اور قتل کے مدعی کی قسم کو مقدم کرنے کا دار و مدار بھی ظاہری قرائن پر ہے۔ لعان میں شوہر کی شہادت کے بعد اگر بیوی شہادت سے مکر جائے تو اس کو رجم کرنے کے حکم کی بنیاد بھی اسی پر ہے۔

اس سے سفر کی وصیت کے بارے میں مسلمانوں سے متعلق اہل کتاب کی شہادت بھی ہے' اور یہ کہ میت کے دونوں ولی اگر وصی کی کسی خیانت سے واقف ہو جائیں تو انہیں یہ حق حاصل ہے کہ قسم کھائیں اور مال کو لے لیں۔ اس روش میں یہ فتویٰ بھی ہے کہ جس شخص کا مال چوری ہوا ہے وہ اگر کسی مشہور خائن کے ہاتھ میں اپنا کچھ مال دیکھے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے کسی دوسرے سے خریدا ہے تو اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ بقیہ مال کی اس کے پاس موجودگی کے لئے قسم کھا لے اور کہے کہ وہی چور ہے کیوں کہ ظاہری طور پر ملوث ہونے کا ثبوت موجود ہے۔

اسی کی نظیر قسامت میں مقتول کے اولیاء کا حلف ہے' بلکہ مال کا معاملہ ثابت ہو جاتا ہے' لیکن خون کے لئے ایسا نہیں ہے۔ قرآن و سنت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور جو لوگ نسخ کے مدعی ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں' کیونکہ یہ حکم سورہ مائدہ کا ہے' اور وہ آخری زمانہ میں نازل ہوئی تھی' اس کے مطابق صحابہ کرام نے بھی فیصلے کئے ہیں۔

یہی چیز حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں گواہی دینے والے شخص کے اس استدلال میں بھی ملتی ہے جو اس نے اس قمیص سے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو چونکہ مثبت کے طور پر ذکر کیا ہے' اس لئے اس کی اتباع کی جائے گی۔

آخر کار جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو خیبر میں قیام کی اجازت مرحمت فرمادی' آپ ہر سال ایک اندازہ کرنے والا وہاں بھیجتے جو پیداوار کا اندازہ کرتا اور معائنہ کے بعد مسلمانوں کا حصہ الگ کر

دیتا۔ باقی پر تصرف میں وہ آزاد ہوتے اور ایک ہی اندازہ کرنے والا کافی ہوتا تھا۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کھجور کے پھلوں کی طرح دوسرے پھلوں کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے' جس سے شرکاء کا حصہ متعین ہو جائے' خواہ ابھی یہ نہ پتہ چلے کہ نمو کی صلاحیت کس میں ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقسیم علیحدگی ہے' بیع نہیں اور اندازہ و تقسیم کرنے والا ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے' اور یہ کہ جس کے ہاتھ میں پھل ہے' وہ اندازہ کے بعد اس میں تصرف کر سکتا ہے' جب کہ اپنے شریک کے حصہ کا محافظ ہو۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آیا تو ان کے لڑکے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ خیبر کا مال لینے کے لئے تشریف لے گئے۔ یہودیوں نے انہیں تکلیف دی اور مکان سے نیچے گرا دیا جس سے ان کا ہاتھ اکھڑ گیا اور انہوں نے مال دینے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں شام کی طرف جلاوطن کر دیا اور خیبر کے علاقہ کو صلح حدیبیہ میں شریک صحابہ میں تقسیم کر دیا۔

فصل (٦٥)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عقد ذمہ اور جزیہ وصول کرنے کا طریقہ

ہجرت کے آٹھویں سال سورہ براءت کے نازل ہونے سے قبل تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے جزیہ وصول نہیں کیا تھا۔ جب جزیہ کی آیت نازل ہوئی تو آپ نے مجوسیوں ' اہل کتاب سے جزیہ وصول فرمایا' لیکن خیبر کے یہودیوں سے کچھ نہیں لیا' چنانچہ بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا کہ اہل خیبر کے لئے یہ حکم مخصوص ہے' لیکن یہ بات عدم تفقہ کی علامت ہے' کیونکہ آپ نے ان سے آیت جزیہ کے نازل ہونے سے پہلے صلح کرلی تھی۔

پھر اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا کہ آپ اہل کتاب سے جنگ کریں یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں۔ اس لئے اہل خیبر اس میں داخل نہیں ہوئے' کیوں کہ ان سے پرانا معاہدہ چلا آ رہا تھا کہ یہ لوگ ایک مقررہ حصہ پر خیبر کی زمین پر کام کرتے رہیں گے۔ اس لئے ان سے اس کے سواء اور کچھ مطالبہ نہ ہوا اور دوسرے اہل کتاب پر جزیہ لازم کیا گیا' جن کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ نہ تھا۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں شام کی طرف جلاوطن کر دیا تو خیبر کی زمین کی کاشت وغیرہ کے متعلق سابق معاہدہ بھی بدل گیا اور یہود خیبر کی حیثیت بھی دوسرے اہل کتاب کی سی ہوگئی۔ بعض حکومتوں کے دور میں جب شریعت و سنت پر عمل کم ہو گیا تھا' بعض لوگوں نے ایک ایسے مکتوب کا انکشاف کیا جو بظاہر قدیم معلوم ہوتا تھا لیکن جعل سازی سے تیار کیا گیا تھا' جس میں تحریر تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر پر سے جزیہ ساقط کر دیا تھا' اور اس مکتوب میں حضرت علی بن ابی طالب' سعد بن معاذ اور صحابہ کی ایک جماعت کی شہادت موجود تھی۔

اسی وجہ سے اس مکتوب کو جاہلوں کی ایک جماعت نے صحیح سمجھ لیا اور اس پر عمل کرنے لگے۔ آخر میں اس مکتوب کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے پاس بھیجا گیا اور ان سے اس کے مطابق عمل کرنے میں مدد چاہی گئی تو انہوں نے اس پر تھوک دیا اور اس کے باطل اور جھوٹے ہونے پر دس دلیلیں پیش کیں :

پہلی دلیل : حضرت سعد خیبر کی فتح سے پہلے وفات پا چکے تھے۔

دوسری دلیل : جزیہ کا حکم اس وقت نازل نہیں ہوا تھا۔

تیسری دلیل : اس مکتوب میں بیکار اور سخت زمین کے ساقط کرنے کا ذکر ہے' حالانکہ یہ چیزیں آپ کے زمانہ میں مقرر نہ تھیں بلکہ بعد کے ظالم بادشاہوں نے انہیں مقرر کیا تھا اور بعد تک مقرر رہیں۔

چوتھی دلیل : اس مکتوب کا کسی عالم نے ذکر نہیں کیا ہے اور نہ کسی سیرت و حدیث کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے' اور نہ سلف کے زمانہ کے یہودیوں نے اسے پیش کیا' کیوں کہ انہیں علم تھا کہ وہ لوگ اس کی حقیقت سے باخبر ہیں' لیکن جب سنت کا علم کم ہو گیا تو بعض لوگ تحریف شدہ مکتوب کو سامنے لے آئے اور بعض خیانت پسندوں نے ان کی مدد کی مگر اللہ تعالیٰ نے اس خیانت کا پردہ فاش کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء نے اس کے باطل ہونے کو واضح کر دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بت پرستوں سے جزیہ وصول نہیں کیا۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ مذکورہ لوگوں کے علاوہ باقی کفار سے جزیہ وصول نہیں کیا جا سکتا۔ بعض کا خیال ہے کہ اہل کتاب اور دیگر کفار سے بھی جزیہ وصول کیا جائے گا' اور عرب کے بت پرستوں کے سوا عجم کے بت پرستوں سے بھی جزیہ وصول کیا جائے گا۔ پہلا قول امام شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بھی اس کے موید ہیں۔

دوسرا قول امام ابو حنیفہ کا ہے اور دوسری روایت کے مطابق امام احمد کا ہے۔ دوسرے قول کے حامی کہتے ہیں' آپ نے عرب کے بت پرستوں سے جزیہ وصول نہیں کیا' کیونکہ یہ حکم نازل ہونے سے قبل عرب کے تمام بت پرست اسلام لا چکے تھے اور وہاں کوئی بھی بت نہ رہا تھا اور بت پرست مشرک موجود نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد آپ نے تبوک میں عیسائیوں کے ساتھ جہاد کیا۔ اگر سرزمین عرب میں مشرکین ہوتے تو اتنی دور جانے کے بجائے مشرکین سے جہاد کرنا زیادہ اولیٰ تھا۔ جو شخص تاریخ غزوات اسلام سے روشناس ہے وہ بآسانی سمجھ لے گا کہ معاملہ یوں ہی تھا' پس ان سے جزیہ اس لئے نہیں لیا گیا کہ جن سے لینا تھا' ان کا وجود ہی مفقود ہو چکا تھا۔

البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں سے جزیہ لیا ہے' یہ صحیح نہیں کہ ان کے پاس کوئی کتاب بھی تھی جسے اٹھا لیا گیا ہے۔ آتش پرستوں اور بت پرستوں میں کچھ فرق نہیں' بلکہ بت پرست آتش پرستوں کی نسبت قدرے بہتر ہیں' کیونکہ ان میں دین ابراہیمی کے تمسک یک گونہ ظاہر ہوتا ہے اور

آتش پرست حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علانیہ دشمن تھے' اور سنت نبویہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا : "جب مشرکین میں سے کسی دشمن سے دوچار ہو تو اسے تین باتوں میں سے کسی ایک بات ماننے کی دعوت دو' اگر وہ ان میں سے کسی کا انتخاب کرے تو اسے قبول کرلو۔الخ"۔

علاوہ ازیں حضرت مغیرہ نے کسریٰ کے عامل سے بھی فرمایا تھا کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم تم سے جنگ کریں یہاں تک کہ تم اللہ کی عبادت کرو یا جزیہ ادا کرو" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قریش سے فرمایا تھا کہ کیا تم عرب ایک کلمہ کا اقرار کرلو گے؟ کہ جس کی وجہ سے عجم والے تمہیں جزیہ دیا کریں گے۔ وہ کہنے لگے' وہ کلمہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا : «لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ»

آپ نے نجران کے نصاریٰ سے دو ہزار جوڑوں پر مصالحت فرمائی تھی اور یہ کہ وہ لوگ عاریتہ تیس زرہیں تیس گھوڑے اور تیس اونٹ اور ہر قسم کے تیس ہتھیار دیں جس کو مسلمان جہاد میں استعمال کریں اور انہیں واپس کریں۔ اس اثناء میں وہ اس تمام سامان کے ضامن بھی ہوں گے اس کے بدلے ان کی عبادت گاہیں نہیں گرائی جائیں گی' نہ ان کے پادریوں کو باہر نکالا جائے گا' نہ انہیں اپنا دین چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا' بشرطیکہ وہ کوئی شرارت نہ کریں یا سود نہ کھائیں۔ اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرارت یا سودخوری سے ذمی کا عہد ٹوٹ جاتا ہے' اگر یہ عہد مشروط ہو۔

جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو آپ نے یمن کی طرف بھیجا تو حکم دیا کہ ہر بالغ سے ایک دینار یا اس کی قیمت کے برابر معافری لے لو (معافری یمن میں کپڑوں کی ایک قسم ہے)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ میں جنس یا مقدار کی قید نہیں ہے۔ کپڑے' سونا' زیورات ہر چیز ہے اور مسلمانوں کی ضروریات کے مطابق اس کی مقدار میں کمی بیشی بھی جائز ہے' اور ذمی کے حالات کا بھی لحاظ کیا جا سکتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین نے عرب و عجم کے جزیہ میں تفریق نہیں فرمائی ہے' بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے ان مجوسیوں سے بھی جزیہ وصول فرمایا ہے جو عرب تھے' کیونکہ عرب اس وقت ایک ایسی قوم تھی جس کے پاس کوئی الٰہی کتاب نہ تھی اور جماعت اپنی پڑوسی قوموں کے دین پر چل رہی تھی' چنانچہ بحرین کے عرب مجوسی تھے کیونکہ ان کے پڑوس میں فارس کا علاقہ تھا۔ اور تنوخ و بہرہ اور بنو تغلب عیسائی تھے کیونکہ یہ رومیوں کے پڑوس تھے' اور یمن کے قبائل

یہود یمن کی مجاورت کے باعث یہودی تھے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر جزیہ کے احکام نافذ فرمائے اور ان کے آباء واجداد کا اعتبار نہیں کیا نہ اس بات کا خیال فرمایا کہ یہ لوگ اہل کتاب کے دین میں کب داخل ہوئے۔

یہ بھی ثابت ہے کہ بعض انصاریوں کی اولاد نے حضرت عیسی کی شریعت کے ذریعہ یہودی مذہب کی منسوخی کے بعد اسے قبول کرلیا تھا۔ ان کے باپ نے انہیں زبردستی اسلام میں داخل کرنا چاہا تو یہ آیت نازل ہوئی :

﴿ لَآ إِكْرَاهَ فِى ٱلدِّينِ ﴾

دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی " ہر بالغ سے ایک دینار لینا" اس بات کی دلیل ہے کہ بچوں اور عورتوں سے جزیہ نہ لیا جائے گا۔

اور جس روایت میں « من كل حالم أو حالمة » یعنی بالغ مرد وعورت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں وہ موصول نہیں بلکہ منقطع ہے اور اس اضافہ کا دیگر راویوں نے ذکر نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے بعض راویوں کی تفسیر سے اس کا اضافہ ہو گیا ہو۔

فصل (٦٦)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بعثت سے وفات تک کفار و منافقین کے ساتھ معاملہ کا طریقہ

آغاز نبوت میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی بھیجی' اس میں یہ ہدایت تھی :

﴿ اَقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ﴾

یعنی اپنے اس رب کے نام سے پڑھئے جو سب کا خالق ہے جو آپ کی نبوت کی شہادت تھی۔ پھر آپ پر یہ آیت نازل فرمائی

﴿ يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ﴾

اے کملی والے اٹھئے اور ڈرائیے۔

جو آپ کی رسالت کا اعلان تھا۔ اس کے بعد پھر آپ کو حکم ملتا ہے کہ اپنے رشتہ داروں کو ڈرائیے اور اپنی قوم اور سارے عربوں اور تمام جہاں والوں کو ڈرائیے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد دس سے کچھ زیادہ برس بغیر جنگ کے تبلیغ و دعوت دین کا کام کرتے رہے اور آپ کو صبر و درگذر کرنے کا حکم دیا جاتا رہا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کی اجازت ملی اور قتال و جہاد کی بھی اجازت اس طرح ملی جو آپ سے قتال کرے اس سے آپ قتال کریں۔ پھر عمومی طور پر قتال و جہاد کا حکم ہوا تاکہ پورا دین اللہ کے لئے ہو جائے۔ اب جہاد کی اجازت کے بعد کفار کی تین قسمیں ہو گئیں :

ایک وہ جن سے آپ نے صلح و معاہدہ کر لیا تھا۔

دوسرے وہ جن سے جنگ ہوتی رہی۔

تیسرے وہ جن سے جزیہ ادا کرنے کا معاملہ طے ہو گیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ہدایت دی گئی کہ مصالحین اور معاہدین سے عہد پورا کیا

جائے اور جو عہد و پیمان توڑ دے' اس سے قتال کیا جائے۔

سورہ براءت میں تینوں قسموں کے متعلق احکامات واضح کر دیئے گئے۔ اس میں اہل کتاب سے متعلق فرمایا گیا کہ ان سے جنگ کی جائے یا پھر وہ جزیہ ادا کریں یا اسلام قبول کریں' اور کفار و منافقین سے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے ساتھ تلوار سے اور منافقین کے ساتھ دلائل سے جہاد فرمایا۔ کفار کے معاہدوں سے اعلان براءت کرتے ہوئے ان کی تقسیم کر دی۔

ایک قسم کے ساتھ قتال کا حکم دیا۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے عہد شکنی کی اور اپنے وعدے پر قائم نہ رہے۔

دوسری قسم وہ تھی جنہوں نے عہد شکنی نہ کی اور ان کے معاہدے وقتی تھے۔ آپ نے ان سے جہاد نہ فرمایا بلکہ ان کے متعلق معاہدوں کی میعاد پوری کرنے کا حکم دیا۔

تیسری قسم وہ تھی جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ تھا' یا ان کے معاہدے مطلق تھے' اور انہوں نے آپ کے ساتھ جنگ بھی نہ کی تھی۔ ان کے متعلق یہ حکم ہوا کہ انہیں چار ماہ کی مہلت دی جائے۔ جب یہ مدت گذر جائے تو پھر ان سے جنگ کی جائے۔ مندرجہ ذیل آیت میں اس مدت کا ذکر ہے :

﴿ فَسِيحُواْ فِي ٱلْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ ﴾ [التوبة : ٢]

زمین میں چار ماہ چلو پھرو۔

ذیل کی آیت میں حرمت والے مہینوں سے یہی مراد ہے :

﴿ فَإِذَا ٱنسَلَخَ ٱلْأَشْهُرُ ٱلْحُرُمُ ﴾ [التوبة : ٥]

جب حرمت والے مہینے گذر جائیں۔

ان مہینوں میں پہلا دس ذی الحجہ سے شروع ہوتا ہے اور ربیع الاخر کی دس تاریخ کو چار ماہ پورے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قول "منھا اربعۃ حرم" میں جو چار مہینوں کا ذکر ہے وہ یہاں مراد نہیں ہے' کیوں کہ ان میں ایک رجب کا مہینہ تنہا ہے اور تین ایک ساتھ یعنی ذوالقعدہ' ذوالحجہ' اور محرم۔ ان مہینوں میں مشرکین کو چلنے پھرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا' کیونکہ ایک ساتھ نہ ہونے سے ایسا ممکن نہ تھا' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان مہینوں کے گذرنے کے بعد جنگ کا حکم تھا' چنانچہ عہد شکنی کرنے والوں سے آپ نے جنگ کی اور جن سے معاہدہ نہ تھا' انہیں اور جن سے بلا تعین مطلق معاہدہ تھا۔ انہیں چار مہینے کی مہلت دی' عہد پورا کرنے والوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وفا کا حکم تھا پھر یہ سب

لوگ مسلمان ہو گئے۔ آپ نے اسی طرح ذمیوں پر جزیہ مقرر کیا۔ معاملہ کے اعتبار سے اس طرح تین قسم کے لوگ تھے۔ ایک جنگ کرنے والے' دوسرے وہ جن سے معاہدہ تھا' اور تیسرے وہ جو ذمی تھے۔ اس طرح تمام اہل زمین تین قسموں میں بٹ گئے۔ ایک مسلمان جن کا آپ پر ایمان تھا۔ دوسرے مصالحین جنہیں آپ سے کوئی خوف نہ تھا۔ تیسرے محاربین جنہیں آپ کی طرف سے ڈر لگا رہتا تھا۔

منافقین کے متعلق آپ کا طریق کار یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظاہر اعمال کو قبول کرنے اور باطن کے حالات اللہ کے سپرد کرنے کا حکم دیا' اور اس بات کا حکم دیا کہ ان سے علم اور دلیل کی روشنی میں مناظرہ کیا جائے اور ان سے اعراض اور سختی برتنے کا حکم ہوا اور اچھے انداز سے انہیں سمجھانے کا حکم ہوا اور ان کا جنازہ پڑھنے اور ان کی قبروں پر کھڑے ہونے سے منع فرما دیا اور یہ ارشاد ہوا کہ : اگر ان کے لئے بخشش طلب کریں پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہ بخشے گا۔

فصل (٦٧)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کے ساتھ معاملہ کا طریقہ

اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ہمراہ رکھئے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام یاد کرتے ہیں اور اس کی رضا چاہتے ہیں۔ مزید حکم ہوتا ہے کہ ان سے آپ کی نگاہ نہ ہٹے۔ انہیں معاف کریں۔ ان کے لئے بخشش طلب کریں اور مشورہ لیتے رہیں اور ان کے حق میں دعا کرتے رہیں۔دوسری طرف یہ بھی حکم ہوتا ہے ان میں سے جو نافرمانی کرے اور جہاد سے پیچھے رہ جائے ' اس کو چھوڑ دیں' یہاں تک کہ وہ توبہ کرلے اور آپ کی اطاعت کرے جیسا کہ آپ نے تین پیچھے رہنے والوں سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔

نیز آپ کو یہ بھی حکم تھا کہ شرفاء اور دوسروں پر یکساں حد جاری فرمائیں ' آپ کو یہ بھی ہدایت تھی کہ بروں اور جاہلوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ برائی کا احسان سے' جہالت کا حلم سے' ظلم کا عفو و درگذر سے' قطع رحمی کا صلہ رحمی سے بدلہ دیں۔ ایسے برتاؤ اور معاملہ سے دشمن بھی مخلص دوست بن جائیں گے۔

جنات و شیاطین سے بچنے کے لئے آپ کو استعاذہ کا حکم دیا گیا اور ان تمام اخلاق حسنہ کا ذکر سورہ اعراف' مومنین' حم سجدہ کے تین مقامات پر آیا ہے۔ اس لئے کہ حاکم کا رعایا کے ساتھ تین قسم کا معاملہ ہوتا ہے۔ ان کے اوپر اس کا لازمی حق ہوتا ہے' اور حاکم انہیں حکم دیتا ہے۔ ایسی صورت میں کوتاہی یا زیادتی کا بھی امکان ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ اپنے حق کو لینے میں آپ ان کی سہولت کا خیال رکھیں اور اس کا نام عفو ہے۔ اسی طرح آپ کو حکم تھا کہ انہیں معروف کا حکم دیں اور ایسی باتوں کا جنہیں عقول سلیمہ اور فطرت مستقیمہ جانتی ہو۔اسی طرح اپنے حکم میں آپ سختی بھی نہ کریں' آپ کو یہ بھی حکم تھا کہ ان کی جہالت کے مقابلہ میں اعراض و بے توجہی سے کام لیں۔

یہ ہے روئے زمین پر بسنے والے جنوں' انسانوں' مومنوں' کافروں کے ساتھ آپ کی سیرت طیبہ اور معاملہ حسنہ کا خاکہ۔

فصل (۶۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کا بیان

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا پہلا لشکر ہجرت کے ساتویں ماہ رمضان کے مہینے میں روانہ فرمایا' جس کا پرچم حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کو دیا تھا۔ آپ نے مہاجرین میں سے تیس صحابہ کو شام سے آنے والے قریش کے قافلے کے مقابلہ میں ارسال کیا' جس میں ابوجہل تین سو آدمیوں کے ہمراہ آ رہا تھا' جب دونوں فریقین آمنے سامنے ہوئے تو مجدی بن عمرو جھنی نے جو دونوں فریق کا حلیف تھا' کوشش کرکے بیچ بچاؤ کیا اور جنگ نہ ہوئی۔

پھر ہجرت کے آٹھویں ماہ شوال کے آخر میں عبیدہ بن حارث کی سرکردگی میں ایک چھوٹا سا لشکر وادی رابغ کی طرف روانہ کیا' جس میں صرف مہاجرین ساٹھ کی تعداد میں شریک تھے' اور ابوسفیان سے وادی رابغ میں مقابلہ ہوا جس کے ہمراہ دو سو آدمی تھے۔ اس جنگ میں تیراندازی ہوئی' تلوار نہ چلی' نہ باقاعدہ جنگ ہوئی۔ اسے صرف مڈبھیڑ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص وہاں موجود تھے۔ اللہ کے راستہ میں انہوں نے سب سے پہلے تیر مارا۔ ابن اسحاق نے اس کو حضرت حمزہ کے لشکر سے پہلے ذکر کیا ہے۔

پھر ہجرت کے نویں ماہ آپ نے بیس سواروں کو حضرت سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں حرار کی طرف بھیجا۔ اس کا مقصد قریش کا ایک قافلہ تھا' جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ قافلہ جا چکا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس غزوہ ابواء میں شریک ہوئے۔ یہ پہلا غزوہ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے۔ آپ صرف مہاجرین کے ساتھ نکلے۔ قریش کے ایک قافلہ کی تلاش تھی لیکن مزاحمت کی نوبت نہ آئی۔ پھر آپ اسی سال ماہ ربیع الاول میں دو سو صحابہ کو لے کر ابواط کی طرف غزوہ میں نکلے' قریش کا ایک قافلہ مقصود تھا لیکن مزاحمت کے بغیر ہی واپس آ گئے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے تیرھویں ماہ کرز بن جابر کے تعاقب میں نکلے۔ جس نے مدینہ

میں مویشیوں پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی جانب وادی سفوان پہنچے تو وہ بچ کر نکل چکا تھا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے سولھویں ماہ ڈیڑھ سو مہاجرین کے ساتھ قریش کے ایک قافلہ سے معارضت کے لئے نکلے جو شام کی طرف جا رہا تھا۔ جب آپ حضرات ذوالعشیرہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ قافلہ گذر گیا ہے۔ یہی قافلہ جب شام سے واپس آنے لگا تو پھر آپ اس کے طلب میں نکلے اور بدر کا واقعہ و غزوہ پیش آیا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے سترھویں ماہ رجب میں عبداللہ بن جحش اسدی کو وادی نخلہ کی طرف بارہ آدمیوں کے ہمراہ ارسال کیا۔ دو دو آدمی ایک ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ چنانچہ قریش کے ایک قافلہ سے جنگ کے لئے وادی نخلہ میں پہنچ گئے۔ راستہ میں سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کی سواری کا اونٹ گم ہو گیا' اور وہ اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے اور عبداللہ بن جحش دور نکل گئے۔ جب اسلامی لشکر وادی نخلہ میں داخل ہوا تو قریش کا قافلہ ان کے پاس سے گذرا' مسلمانوں نے سوچا کہ آج رجب کی آخری تاریخ ہے اور اگر ہم انہیں چھوڑ دیں گے تو حرم میں داخل ہو جائیں گے۔

آخر میں مسلمانوں نے حملہ کا فیصلہ کیا۔ کسی نے عمرو بن حضرمی کو تیر مارا اور وہ قتل ہو گیا' اور عثمان و حکم کو گرفتار کر لیا گیا اور نوفل بھاگ گیا۔ یہ لوگ قافلہ کا سامان اور قیدی لے کر حاضر خدمت ہوئے اور خمس نکال کر الگ کر لیا۔ اسلام میں یہ پہلا خمس اور پہلا قتل اور پہلے دونوں قیدی تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل سے ناراضگی اور بیزاری کا اعلان کیا۔ قریش اس واقعہ سے بھڑک اٹھے اور انہیں موقع ہاتھ لگ گیا' چنانچہ وہ کہنے لگے 'محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر حرام میں قتل کو جائز قرار دیا اور مسلمانوں پر بھی اس واقعہ کا سخت اثر ہوا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی :

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلشَّهْرِ ٱلْحَرَامِ ﴾ [البقرة : ٢١٧]

لوگ آپ سے حرمت والے مہینہ میں جنگ سے متعلق سوال کرتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ وہ بات ہے جس کو تم نے منکر سمجھا' یہ اگرچہ برائی ہے لیکن کافروں نے اللہ کا کفر کیا' اس کی راہ سے اور اس کے گھر سے روکا' اور اس کے اہل مسلمانوں کو وہاں سے نکال دیا۔ نیز جس شرک پر تم قائم ہو اور جو جو تمہاری طرف سے فتنے بپا کئے گئے' یہ ساری باتیں شہر

حرام میں قتال سے بھی زیادہ بری اور سنگین ہیں۔

اکثر مفسرین نے اس آیت میں فتنہ کی تفسیر شرک سے کی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسا شرک ہے جس کی طرف دعوت دی جاتی ہے اور جو اسے نہ مانے اسے سزا دی جاتی ہے' اس لئے جہنم میں ان سے کہا جائے گا :

﴿ ذُوقُواْ فِتْنَتَكُمْ ﴾ [الذاريات : ١٤]

اپنے فتنہ کا مزہ چکھو۔

حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ اس آیت میں فتنہ سے تکذیب مراد ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے فتنہ کا انجام چکھو' جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا کہ :

﴿ ذُوقُواْ مَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ﴾ [الزمر : ٢٤]

اپنی کمائی کا مزہ چکھو۔

اس سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے :

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ فَتَنُواْ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ ﴾ [البروج : ١٠]

بیشک وہ لوگ جنہوں نے فتنہ میں ڈالا مومن مردوں اور مومن عورتوں کو۔

اس آیت میں فتنہ کی تفسیر مومنوں کو آگ میں جلانے سے کی گئی ہے لیکن یہ لفظ اس سے زیادہ عام ہے' اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مومنوں کو ان کے دین کے سلسلہ میں فتنہ میں ڈالنے کے لئے عذاب میں مبتلا کیا اور قرآن کی جن آیتوں میں فتنہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ جیسے ارشاد باری ہے :

﴿ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ ﴾ [الأنعام : ٥٣]

ہم نے بعضوں کو بعض کے ذریعہ سے آزمایا ہے۔

﴿ إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ ﴾ [الأعراف : ١٥٥]

یہ سب تیری آزمائش ہے۔

اس سے نعمتوں اور مصیبتوں کے ذریعہ بندوں کی آزمائش مراد ہے۔ یہ فتنہ کا ایک رنگ ہے' اور مشرکین کا فتنہ اس سے مختلف ہے اور اسی طرح مومن کا مال و اولاد کے بارے میں فتنہ ایک اور چیز ہے۔ مسلمانوں کے درمیان جو فتنہ ہوا جیسے جنگ جمل اور جنگ صفین ان میں اس کا رنگ بھی مختلف ہے'

ایسے فتنے کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ ہے کہ دونوں فریق سے علیحدہ رہا جائے۔

کبھی فتنہ سے مراد گناہ بھی ہوتا ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ :

﴿أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا﴾ [التوبة : ٤٩]

خبردار یہ لوگ فتنہ میں گر پڑے۔

یعنی یہ لوگ نفاق کے فتنہ میں پڑ گئے اور رومی عورتوں کے فتنہ کے مقابلہ میں اسے اختیار کر لیا۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوستوں اور دشمنوں کے درمیان منصفانہ فیصلہ کیا ہے' اور اپنے محبوب بندوں کو تنبیہہ کی کہ ان سے غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن چوں کہ انہوں نے تاویل کی تھی' اس لئے ان سے جو تقصیر ہوئی ہے' اسے توحید فرمانبرداری اور ہجرت کے صلہ میں معاف کر دیا جائے گا۔

فصل (۶۹)

غزوہ بدر کا عظیم اور تاریخی معرکہ

ہجرت کے دوسرے سال ماہ رمضان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ شام سے قریش کا ایک قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں آرہا ہے' تو آپ نے لوگوں سے نکلنے کا مطالبہ کیا اور اس کے لئے زیادہ اہتمام نہیں کیا' بلکہ جلدی میں تین سو تیرہ سے کچھ زائد صحابہ کرام کے ساتھ نکلے' جن کے پاس صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے' اور لوگ باری باری ان پر سوار ہوتے تھے۔

ادھر ابوسفیان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی اطلاع مل چکی تھی اور اس نے قافلہ کے تحفظ کے لئے مکہ اطلاع بھیجوادی۔ جب اہل مکہ کو اطلاع ملی تو حسب ارشاد باری تعالیٰ :

﴿ بَطَرًا وَرِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ﴾ [الأنفال : ٤٧]

اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لئے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے دونوں فریق کو بغیر سابقہ تیاری و وعدہ کے جمع کردیا چنانچہ ارشاد ہے کہ :

﴿ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِى ٱلْمِيعَـٰدِ ﴾ [الأنفال : ٤٢]

اگر تم باہم وعدہ کرتے تو وقت میں اختلاف کر بیٹھتے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آپ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا تو مہاجرین نے اس موقع پر لائق تحسین نقطہ نظر پیش کیا' پھر دوسری اور تیسری مرتبہ بھی استفسار پر انہوں نے غیر معمولی ایثار و قربانی پیش کرنے کا یقین دلایا۔ اس پر انصار سمجھ گئے کہ روئے سخن ہماری طرف ہے۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذ نے جلدی سے آگے بڑھ کر انصار کے موقف کی وضاحت ان الفاظ میں کی :

اے اللہ کے رسول: آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے۔ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر آپ حکم فرمائیں گے تو ہم اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپ صلی

اللہ علیہ وسلم برک غماد تک ہمیں جانے کا حکم فرمائیں گے تو ہم ضرور وہاں تک جائیں گے۔

اسی طرح حضرت مقداد نے فرمایا کہ ہم آپ کو حضرت موسی کی قوم بنی اسرائیل کی طرح جواب نہ دیں گے' بلکہ آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہو کر دشمنوں سے جنگ کریں گے۔

صحابہ کرام کا یہ جواب سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بے حد خوش ہوئے' اور فرمایا کہ چلو خوشخبری حاصل کرو۔ مجھ سے اللہ تعالیٰ نے دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا ہے اور میں کافروں کی جائے ہلاکت دیکھ چکا ہوں۔

دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر پیش قدمی کرتے چلے آ رہے تھے یہاں تک کہ بدر کے قریب پہنچ گئے اور مشرکین کے دستے بھی سامنے آ گئے' تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ خداوندی میں دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا شروع کی اور اللہ تعالیٰ سے مدد و نصرت طلب فرمائی اور تمام مسلمانوں نے بھی تضرع و زاری کے ساتھ مدد چاہی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ : میں آپ کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد بھیج رہا ہوں جو یکے بعد دیگرے پہنچیں گے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں ایک ہزار فرشتوں کے اترنے کا ذکر ہے اور سورہ آل عمران میں تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کے اترنے کا ذکر ہے تو اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں۔

ایک یہ کہ دوسری آیت کا تعلق جنگ احد سے ہے' اور اس میں ایک لگائی گئی شرط ہے جس کے فوت ہونے سے امداد کا وعدہ بھی پورا نہ ہوا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا بھی تعلق غزوہ بدر سے ہے اور آیت کا سیاق اس کی دلیل ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۲۳ سے ۱۲۵ تک میں یہی مذکور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کی دعاء پر پہلے ایک ہزار فرشتوں سے مدد ہوئی' پھر تین ہزار کے ذریعہ اور پھر پانچ ہزار کے ذریعہ' اس طرح مختلف مراحل پر امداد کا اثر خوشگوار ہوا اور مومنوں کو ڈھارس ملتی رہی۔

پہلے فریق کا کہنا ہے کہ واقعہ غزوہ احد کے سیاق کا ہے اور بدر کا ذکر درمیان میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بدر کے موقع پر اپنی نعمت یاد دلائی ہے' پھر احد کے قصہ کو بیان کیا ہے' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ﴿أَلَن يَكْفِيَكُمْ﴾ فرمایا ہے' پھر یہ وعدہ فرمایا ہے کہ اگر مسلمان صبر اور تقوی اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ پانچ ہزار فرشتوں سے ان کی مدد فرمائے گا۔

اس طرح یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے اور بدر میں جس امداد کا ذکر ہے وہ اللہ تعالیٰ کا

قول ہے۔ اس میں پانچ ہزار کا ذکر ہے اور بدر کی امداد ایک ہزار سے ہوئی تھی۔ پہلی امداد مشروط تھی اور دوسری مطلق۔

سورہ آل عمران میں احد کا واقعہ مکمل مذکور ہوا ہے اور بدر کا ذکر درمیان میں آگیا ہے' اور سورہ انفال میں بدر کے واقعہ کا مکمل ذکر ہوا ہے۔ اس طرح آل عمران اور انفال دونوں سورتوں کا سیاق مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ﴿ وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا﴾ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ یہ احد کا دن ہے اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مذکورہ امداد اسی دن ہوئی تھی۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس تعداد کے ساتھ بدر کے دن امداد ہوئی تھی اور فوری طور پر آنے کا تعلق احد کے دن سے ہے۔

جب قریش جنگ کا پختہ ارادہ کر کے نکلے تھے تو انہیں اپنے اور بنی کنانہ کے درمیان دشمنی کا خیال ہوا' چنانچہ ابلیس سراقہ بن مالک کی شکل میں ان کے پاس آیا۔ سراقہ بنی کنانہ کا ایک بڑا سردار تھا' کہنے لگا آج تم پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارے ہمراہ رہوں گا تاکہ بنی کنانہ تمہیں کچھ بھی ایذا نہ دے سکیں۔ وہ اس وعدہ پر نکل پڑے اور جب لڑائی شروع ہوئی اور شیطان نے اللہ تعالیٰ کا لشکر دیکھا جو آسمان سے نازل ہوا تھا تو وہ ایڑیوں کے بل وہاں سے فرار ہو گیا۔

قریش کہنے لگے' ارے سراقہ' کہاں چلے' کیا تم نے یہ نہ کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور مفارقت اختیار نہ کروں گا' تو ابلیس نے جواب دیا' میں وہ (مخلوق) دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے۔ ابلیس نے جب یہ کہا کہ میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے تو صحیح کہا۔ لیکن جب یہ کہا' میں اللہ سے ڈرتا ہوں تو جھوٹ بولا۔ ایک قول کے مطابق اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بھی ان کے ہمراہ ہلاک نہ کر دیا جائے اور ظاہری معنی سے یہی معلوم ہوتے ہیں۔

جب منافقین نے یہ دیکھا کہ اللہ کی جماعت تھوڑی اور اس کے دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے تو انہیں یہ گمان ہوا کہ فتح کا دارومدار کثرت پر ہے۔ اس لئے وہ کہنے لگے کہ "مسلمانوں کو ان کے مذہب نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے"۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ فتح کا دارومدار توکل پر ہے' کثرت تعداد پر نہیں' اور یہ کہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ حقدار خواہ وہ کمزور ہو' وہ اس کی مدد کرتا ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شوال کے مہینہ میں غزوہ بدر اور اس کے قیدیوں کے معاملات سے فارغ ہوئے تو پھر آپ بنفس نفیس سات دن کے بعد غزوہ بنی سلیم کے لئے روانہ ہوئے۔ "الکدر" نامی

چشمہ کے پاس تین دن قیام فرما کر واپس آ گئے اور کسی لڑائی کی نوبت نہ آئی۔

غزوہ سویق :

جب مشرکین کا گروہ ذلیل و رسوا اور غمزدہ حالت میں واپس گیا' تو ابو سفیان نے نذر مانی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جنگ کئے بغیر سر پر پانی نہ ڈالوں گا۔ چنانچہ دو سو سواروں کے ہمراہ نکل کر مدینہ کے ایک علاقہ میں سلام بن مشکم کے یہاں مقیم ہوا۔ اس نے اسے شراب پلائی اور اس خبر کو لوگوں سے پوشیدہ رکھا۔ جب صبح ہوئی تو اس نے کھجور کے چند درخت کاٹ ڈالے۔ ایک انصاری اور ایک ان کے حلیف کو قتل کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس کی تلاش میں تشریف لے گئے' لیکن وہ بھاگ چکا تھا۔ زاد راہ کی کثرت کے باعث کفار نے کافی مقدار میں ستو پھینک دیئے' تاکہ کچھ بوجھ کم ہو جائے' چنانچہ مسلمانوں نے وہ ستو اٹھا لئے۔ اس طرح اس غزوہ کا نام ہی غزوہ سویق پڑ گیا۔ یہ واقعہ غزوہ بدر کے دو ماہ بعد پیش آیا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نجد کے علاقہ میں غطفان کے غزوہ کے لئے نکلے اور ماہ صفر میں ہجرت کے تیسرے سال پورا مہینہ وہیں قیام فرمایا اور بغیر جنگ کئے واپس لوٹ آئے۔

ماہ ربیع الاول میں مدینہ ہی میں مقیم رہے پھر قریش کے ارادہ سے حجاز کے ایک علاقے نجران کی طرف تشریف لے گئے۔ یہاں پر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ ربیع الثانی اور جمادی الاول کے دو ماہ وہاں قیام کر کے واپس لوٹ آئے۔

پھر غزوہ بنی قینقاع پیش آیا اور کعب بن اشرف قتل کیا گیا۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کی عہد شکنی اور اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ آزمائی کی وجہ سے ان کے قتل کی اجازت عطا فرمائی۔

غزوہ احد :

جب سرداران قریش ایک ایک کر کے بدر میں موت کے گھاٹ اتارے گئے اور سرداری ابو سفیان بن حرب کے حصہ میں آئی تو اس نے عربوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اکسانا اور جمع کرنا شروع کیا' اور بڑے ساز و سامان سے مدینہ کا رخ کیا اور احد پہاڑی کے دامن میں ڈیرہ ڈالا اور احد کا مشہور معرکہ پیش آیا۔

اس روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں شریک ہونے والے جوانوں کا جائزہ لیا جن میں کچھ ایسے بھی نوجوان حاضر تھے جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم عمر خیال فرما کر لوٹا دیا۔ ان میں عبداللہ بن عمر' اسامہ بن زید' زید بن ثابت' عرابہ بن اوس تھے' اور جنہیں قدرے توانا تصور فرمایا' انہیں اجازت مرحمت فرمادی۔ ان میں سمرہ بن جندب' رافع بن خدیج' جن کی عمریں پندرہ سال تھیں۔

ایک قول یہ ہے کہ جس کی عمر پندرہ سال کی تھی' اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور جس کی عمر اس سے کم نکلی' اسے واپس کر دیا کیونکہ وہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے عمر کے بجائے طاقت کا اعتبار فرمایا تھا۔ بالغ ہونے یا نہ ہونے کا اعتبار نہیں کیا تھا' چنانچہ اس کی دلیل میں حضرت ابن عمر کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں کہ : جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ میں طاقت دیکھی تو اجازت دے دی۔ پھر علامہ ابن قیم نے حضرت اصیرم کے واقعہ کا ذکر کیا ہے جو احد کے دن مسلمان ہوئے تھے اور اسی دن شہید ہو گئے۔

پھر پہاڑ پر ابوسفیان نے چڑھ کر آواز دی' کیا تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے؟ آپ نے فرمایا کچھ جواب نہ دو' پھر کہنے لگا' کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہے' پھر آپ نے جواب سے منع فرما دیا' پھر پوچھا کیا تم میں عمر بن خطاب ہے' پھر بھی کسی نے جواب نہ دیا تو وہ مشرکین سے پکار کر کہنے لگا۔ ان سب کا کام تمام ہو گیا۔ اگر یہ زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔ اب حضرت عمر سے نہ رہا گیا اور چلا اٹھے 'او دشمن خدا' ہم سب زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تجھے ذلیل و خوار کرنے کے لئے باقی رکھا ہے۔

اس کے بعد ابوسفیان نے کہا' "اعل ھبل" ھبل کی جے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا جواب کیوں نہیں دیتے؟ کہنے لگے کیا کہیں؟ فرمایا' کہو (اللہ اعلی و اجل) اللہ سب سے اونچا اور بڑا ہے۔ ابوسفیان نے کہا "لنا العزی و لاعزی لکم" ہمارا حامی عزی بت ہے' تمہارے پاس کوئی عزی نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین کی کہ کہو : "اللہ مولانا ولا مولی لکم"۔ اللہ ہمارا مددگار اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ ابوسفیان نے کہا' آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے اور جنگ برابر کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا' برابر کیسے؟ ہمارے مقتول جنت میں ہیں اور تمہارے جہنم میں۔

اس کے بعد ابوسفیان نے کہا کہ بعض مقتولین کی ہیئت تمہیں بگڑی ہوئی ملے گی' میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا لیکن ایسا ہونے پر مجھے کوئی دکھ بھی نہیں ہے۔

فصل (۷۰)

غزوہ احد سے مستنبط احکام و مسائل

اس غزوہ سے یہ معلوم ہوا کہ جب جہاد کا آغاز ہو جائے اور اسلحہ پہن لیا جائے تو دشمن سے جنگ کئے بغیر واپس نہ ہونا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ دشمن جب ملک میں داخل ہو جائے تو نکلنا جائز نہیں۔

تیسرے یہ کہ جو بچے نابالغ ہوں اور جنگ کی طاقت نہ رکھتے ہوں' انہیں واپس کر دیا جائے۔

چوتھے یہ کہ عورتوں کو لے کر جہاد کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت انس ابن نضر وغیرہ نے کیا۔ اس طرح عورتیں جہاد میں شریک ہو سکتی ہیں اور ان سے مدد لی جا سکتی ہے۔

پانچویں یہ کہ اگر امام زخمی ہو جائے تو وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے اور اس کے پیچھے سب بیٹھ کر نماز پڑھیں۔

چھٹے یہ کہ شہادت کی دعا کرنا اور اس کی تمنا کا اظہار کرنا ممنوع نہیں' جیسا کہ ابن جحش نے کیا تھا۔

ساتویں یہ کہ اگر کوئی مسلمان خودکشی کرے تو وہ جہنمی ہوگا' جیسا کہ قزمان کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

آٹھویں یہ کہ شہید کو غسل نہ دیا جائے اور نہ اس کی نماز جنازہ پڑھائی جائے اور جو کپڑے پہنے ہو اس کے علاوہ دوسرے کپڑوں میں اسے کفن بھی نہ پہنایا جائے۔ ہاں اگر اس کے کپڑے دشمن اتار لے تو دوسرا کفن دیا جا سکتا ہے۔ شہید کو اپنے ہی کپڑوں میں دفن کرنا مستحب ہے یا واجب' اس میں اختلاف ہے' مگر راجح قول یہ ہے کہ واجب ہے۔

نویں یہ کہ اگر حالت جنابت میں شہید ہو جائے تو غسل دیا جائے جیسا کہ ملائکہ نے حضرت حنظلہ کو غسل دیا تھا۔

دسویں یہ کہ شہداء کو میدان جنگ ہی میں دفن کیا جائے' کیونکہ آپ نے صحابہ کو واپس میدان جنگ

میں لاکر دفن کرنے کا حکم دیا تھا۔

گیارھویں یہ کہ ایک قبر میں دو یا تین شہداء کو دفن کیا جا سکتا ہے۔

بارھویں یہ کہ اگر کوئی مسلمان غلطی سے کسی مسلمان کو کافر سمجھ کر قتل کردے تو امام پر بیت المال سے دیت دینا واجب ہے' کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ کے والد کی دیت دینی چاہی تو حضرت حذیفہ نے دیت لینے سے احتراز کیا اور اسے مسلمانوں پر صدقہ کر دیا۔

تیرھویں یہ کہ معذور شخص بھی جہاد میں شریک ہو سکتا ہے جیسا کہ آپ نے ایک لنگڑے صحابی کو اجازت دے دی تھی۔

غزوہ احد میں جو حکمتیں پوشیدہ ہیں' ان پر اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران کی آیتوں میں جو ﴿ وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ ﴾ سے شروع ہو کر آیت ۱۶۰ پر ختم ہوتی ہیں' روشنی ڈالی ہے۔

سب سے بڑی حکمت یہ تھی کہ مسلمانوں کو معصیت' بزدلی اور اختلاف کے انجام بد سے آگاہ کیا گیا اور بتایا کہ جو رسوائی انہیں ہوئی' وہ اسی وجہ سے تھی تاکہ اس کے اسباب سے اجتناب کریں۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ رسول اور ان کے متبعین کبھی فتحیاب ہوں اور کبھی شکست سے دوچار۔ لیکن بالاخر فتح ان کی ہوگی' کیوں کہ اگر ہمیشہ فتح ان کی ہو تو پھر آزمائش اور سبق آموزی کا مقصد پورا نہ ہوگا' چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

﴿ مَّا كَانَ ٱللَّهُ لِيَذَرَ ٱلْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَآ أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ ٱلْخَبِيثَ مِنَ ٱلطَّيِّبِ ﴾

[آل عمران : ١٧٩]

جس حالت پر تم ہو اس پر اللہ مومنوں کو نہیں چھوڑ سکتا یہاں تک کہ برے کو اچھے سے ممتاز کردے یعنی مومنوں اور منافقوں کے درمیان جو اختلاف ہے اسے باقی نہیں رکھا جائے گا' بلکہ امتیاز کیا جائے گا' جس طرح احد کے دن آزما کر ممتاز کیا گیا۔ ارشاد ہے کہ :

﴿ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى ٱلْغَيْبِ ﴾ [آل عمران : ١٧٩]

یعنی تمہیں اللہ تعالیٰ غیب سے آگاہ نہیں کرے گا۔

اس سے وہ غیب مراد ہے جو مومنین و منافقین کے درمیان امتیاز پیدا کردے۔ یہ دونوں فریق اللہ کے علم میں الگ الگ ہیں' لیکن وہ یہ چاہتا ہے کہ ظاہر میں بھی ان کے درمیان امتیاز ہو جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے ارشاد :

﴿ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ ﴾ [آل عمران: ۱۷۹]

اور اللہ رسولوں میں جس کو چاہتا ہے' برگزیدہ بناتا ہے۔

اس سے اطلاع علی الغیب کی نفی کا استدراک ہے' جس کا معنی یہ ہے کہ رسولوں کو اللہ تعالیٰ غیب کی باتوں سے بھی آگاہ کرتا ہے جیسا کہ سورہ جن میں وارد ہے۔ اس لئے تمہاری سعادت اس میں ہے کہ اس غیب پر ایمان رکھو جس سے رسول واقف ہیں۔ اگر تم ایمان رکھو گے اور ڈرتے رہو گے تو تمہیں بڑا اجر ملے گا۔

ایک حکمت اولیاء اللہ کی عبودیت کا اظہار کہ کس طرح خوشی و رنج اور محبت و نفرت ہر حال میں یہ عبادت پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ یہی اس کے حقیقی بندے ہیں' نہ کہ وہ جو صرف خوشی کی حالت میں اس کی عبادت کرتے ہیں۔

ایک حکمت یہ ہے کہ اگر مومنوں کو ہمیشہ کامیابی عطا کی جاتی تو ان کا حال وہی ہوتا جو رزق کی کشادگی میں ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ تدبیر کرتا ہے اور اپنی حکمت کے مطابق سب کچھ مہیا کرتا ہے یا سلب کرتا ہے۔

ایک حکمت یہ ہے کہ بندے جب اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی و انکساری کرتے ہیں تو وہ فتح و کامیابی کے مستحق ہو جاتے ہیں کیونکہ فتح و نصرت کی پوشاک' عاجزی و انکساری کے مظاہرہ کے بعد اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ ﴾ [آل عمران: ۱۲۳]

اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب کہ تم ذلیل تھے۔

ایک حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے کچھ ایسے درجات بنائے ہیں جہاں تک رسائی ان کے اعمال کے ذریعہ نہیں ہو سکتی' بلکہ بعض آزمائشوں پر پورا اترنے کے بعد ان درجات کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے ایسے اسباب پیدا کئے جو آزمائش کے بعد بندوں کو ان مقامات کا مستحق بنا دیں۔ اس کے ساتھ اس نے بندوں کو نیک عمل کی توفیق بھی دی۔

ایک حکمت یہ ہے کہ دائمی عافیت مسلسل فتح' طویل مالداری بندہ کے اندر دنیا کی طرف رغبت و میلان میں اضافہ کرتے ہیں۔ طبیعت کے اندر جمود پیدا ہو جاتا ہے' اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکلنے سے رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں جب اللہ تعالیٰ بندے کے ساتھ خیر خواہی کرتا ہے تو اس

کو کچھ ایسی آزمائشوں میں مبتلا کر دیتا ہے جو اس کے لئے علاج ثابت ہوں اور اس کے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا کریں اور آخرت کی طرف انابت کا سبب بنیں۔

نیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہادت اولیاء اللہ کے اعلیٰ مراتب کی علامت ہے۔ شہداء اس کے خواص و مقربین میں شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنے بندوں میں سے شہداء کا انتخاب فرمائے۔ نیز اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنے کا قصد فرماتا ہے تو ان کے لئے ایسے اسباب مہیا کرتا ہے جو ان کی ہلاکت و بربادی کا موجب ہوں' اور ان اسباب میں سب سے بڑا جرم ان کا کفر و بغاوت' نافرمانی اور اولیاء اللہ کی ایذا رسانی میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اس سے اولیاء اللہ کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور دشمنوں کو مٹانے کے اسباب مہیا ہوتے ہیں' اسی کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

﴿ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾ [آل عمران : ١٣٩]

تم ست نہ بنو' تم غم نہ کرو' تم ہی بلند رہو گے' بشرطیکہ مومن رہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی حوصلہ افزائی فرمائی اور ان کو تسلی دی اور اس سبب و حکمت کی طرف توجہ دلائی جس کی وجہ سے کفار کو ان پر غلبہ حاصل ہوا تھا' چنانچہ ارشاد ہے :

﴿ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ﴾ [آل عمران : ١٤٠]

اگر تم کو زخم پہنچا ہے تو ایسا ہی ان کو بھی پہنچا ہے۔

یعنی تمہیں ست پڑنے یا غم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نقصان کافروں کا بھی ہوا ہے اور انہوں نے یہ سب شیطان کی راہ میں برداشت کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا کہ اس زندگی میں دن پھرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک وقتی منفعت ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ دوستوں اور دشمنوں دونوں کو باری باری دیتا ہے' لیکن آخرت کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ وہاں کا فائدہ صرف دوستوں کو حاصل ہوگا۔ نیز اس میں حکمت یہ ہے کہ مومن اور منافق کے درمیان امتیاز پیدا ہو جائے۔ ویسے اللہ تعالیٰ ہر شخص کو جانتا ہے لیکن اس سے مقصود یہ ہے کہ سب لوگ اس کا مشاہدہ کرلیں اور اپنی آنکھوں سے معرفت حاصل کرلیں' کیونکہ محض علم غیب پر ثواب و عذاب مرتب نہیں ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک اور حکمت کا ذکر فرمایا تاکہ مسلمانوں میں بعض کو درجہ شہادت عطا کرے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی :

﴿ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴾ [آل عمران : ١٤٠]

اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اس میں صراحت ہے کہ وہ ان منافقین کو ناپسند کرتا ہے جو احد کے دن اس کے نبی کو چھوڑ کر لوٹ آئے اور جنگ میں شریک نہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ان سے محبت نہیں فرماتا اس لئے وہ درجہ شہادت سے بھی محروم رہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی حکمت بیان کی ہے کہ مومنوں کو گناہ سے پاک و صاف کیا جائے اور منافقوں سے انہیں علیحدہ کیا جائے' اور کافروں کو ختم کیا جائے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کی تردید فرمائی کہ جنت میں بغیر جہاد فی سبیل اللہ کے جایا جا سکتا ہے۔ ارشاد ہے کہ :

﴿ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا۟ ٱلْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ جَـٰهَدُوا۟ مِنكُمْ ﴾

[آل عمران : ١٤٢]

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے' حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو جانا نہیں۔

یعنی ابھی تم سے ایسا فعل صادر نہیں ہوا ہے' کیونکہ جزاء معلوم واقعہ پر مرتب ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ڈانٹ پلائی کہ تم جس جہاد کی تمنا کرتے تھے اور جانے کا شوق رکھتے تھے' اس میں شکست کھا گئے' چنانچہ فرمایا :

﴿ وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ ٱلْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴾

[آل عمران : ١٤٣]

تم موت کا سامنا کرنے سے پہلے موت کی تمنا کرتے تھے پس تم نے اسے دیکھ لیا۔

نیز اس غزوہ میں یہ حکمت ہے کہ یہ واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع کا مقدمہ تھا اور شکر گذار وہ ہیں جنہوں نے نعمتوں کی قدر کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک ثابت قدم رہے اور راہ فرار اختیار نہیں کی۔

پھر مسلمانوں کو توبیخ کی کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو جائیں یا قتل ہو جائیں تو انہیں فرار نہیں ہونا چاہیے' بلکہ ان پر واجب ہے کہ اس کے دین اور توحید پر قائم رہیں اور اسی پر مریں۔ ہر جان دار کو بہر حال موت آنی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ رہنے کے لئے مبعوث نہیں

فرمایا۔ اسی طرح بہت سے انبیاء اور ان کے متبعین قتل کئے جا چکے ہیں' لیکن ان کے متبعین میں کوئی سستی یا کمزوری نہیں پیدا ہوئی بلکہ انہوں نے جام شہادت کو بڑے ذوق و شوق سے نوش کر لیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان اسباب کا ذکر فرمایا جن سے انبیاء کرام اور ان کی قوموں کو فتح و کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ تھا ان کا اعتراف قصور اور توبہ و استغفار اور ثابت قدمی اور نصرت و مدد کے لئے دعائیں اور آہ و زاری' چنانچہ ارشاد ہے :

﴿ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَن قَالُوا۟ رَبَّنَا ٱغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِىٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَٱنصُرْنَا عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴾ [آل عمران: ١٤٧]

ان کا صرف یہ کہنا تھا کہ اے اللہ ہمارے گناہ بخش دے۔ ہماری زیادتیوں کو معاف فرما دے۔ ہمیں ثابت قدم رکھ' اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ گناہوں کی وجہ سے دشمنوں کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اور انہی سے شیطان انسانوں کو بہکاتا ہے اور شکست سے دوچار کرتا ہے۔

گناہوں میں سے بعض گناہ حقوق میں قدرے کوتاہیوں سے ہوتے ہیں اور بعض گناہ حدود سے تجاوز کرنے سے صادر ہوتے ہیں' اور فتح و مدد کا دار و مدار اطاعت و فرمانبرداری پر ہے۔ اس وجہ سے لوگوں نے ایک طرف گناہوں سے توبہ و استغفار کیا' اور دوسری طرف ثابت قدمی اور مدد و نصرت کی دعا کی' کیونکہ اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ اس طرح انہوں نے دونوں جانبوں کی رعایت کی۔ ایک جانب توحید و انابت کا جو مدد و نصرت کا مقتضی ہے' اور دوسری جانب مدد کی رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے' یعنی گناہ و اسراف سے توبہ و استغفار۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے دشمن منافقین اور کفار کی تابع داری سے منع فرمایا کیونکہ وہ اگر ایسا کرتے ہیں تو دنیا و آخرت دونوں جگہ خسارہ میں رہیں گے۔ اس میں اشارہ ہے کہ منافقین نے احد کی کامیابی کے بعد کفار کی پوری تابع داری اختیار کر لی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ مومنوں کا مولیٰ اور بہترین مددگار ہے۔ جس نے اس ذات پاک سے محبت کی وہی کامیاب ہو گا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ وہ کفار اور دشمنان اسلام کے دلوں میں رعب و ہیبت مسلط کر دے گا جس کی وجہ سے انہیں حملہ کی جراءت و ہمت نہ ہو گی اور ایسا ان کے شرک و کفر کی وجہ سے ہو گا اور جس مسلمان کا ایمان شرک و کفر کی آمیزش سے پاک و صاف ہو گا وہ امن و سلامتی وہدایت سے

ہمکنار ہو گا۔

مزید فرماتا ہے کہ فتح و نصرت کا وعدہ سچا ہے۔ اگر وہ طاعت اور فرمانبرداری پر گامزن رہے تو مدد و نصرت کا سلسلہ جاری رہے گا اور فتح و کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ اگر انہوں نے اطاعت چھوڑ دی تو مدد و نصرت بھی منقطع ہو جائے گی اور آزمائش کے طور پر ان کے دشمن مسلط ہو جائیں گے تاکہ انہیں معصیت و گناہ کا انجام معلوم ہو جائے۔ اس کے بعد یہ بھی بتا دیا کہ یہ ساری لغزشیں خدا نے معاف فرما دیں وہ مومنین پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ دشمنوں کو مسلط کرنے کے بعد معافی کے کیا معنی؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی معافی نہ ہوتی تو دشمن مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیتے لیکن یہ عفو الٰہی کا ہی کرشمہ تھا کہ مسلمانوں کو جڑ سے ختم کرنے پر دشمنوں کے عزم و اتفاق کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں روک دیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس وقت کا منظر یاد دلایا جب وہ پہاڑ کی طرف چڑھتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کی طرف مڑ کر دیکھتے نہیں تھے۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پیچھے سے پکار پکار کر یہ فرما رہے تھے' اے اللہ کے بندو' میں رسول اللہ یہاں ہوں۔

اس فرار کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں یکے بعد دیگرے آزمائشوں سے دوچار کیا' اور ان پر رنج و غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ایک رنج تو فرار کا' دوسرا شیطان کے اس نعرے کا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قتل کر دیئے گئے۔

بعض علماء نے " غما بغم " یکے بعد دیگرے کی تفسیر یہ کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرار ہو کر رنج و غم میں مبتلا کیا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں رنج و غم میں مبتلا کیا' لیکن پہلی تفسیر چند دلائل کی وجہ سے زیادہ مناسب ہے۔

اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ " لکی لا تاسوا" یعنی تاکہ تم غم نہ کرو' اس میں غم کے بعد غم کی حکمت پر تنبیہ ہے یعنی اس غم کو بھلا دینا جو فتح کے بجائے شکست حاصل ہونے سے پیدا ہوا تھا اور یہ چیز اس غم سے حاصل ہو سکتی ہے جس کے بعد دوسرا غم ہو۔

دوم یہ کہ یہ تشریح حقیقت کے مطابق ہے' کیونکہ مسلمانوں کو ایک تو مال غنیمت سے محرومی کا رنج و غم تھا دوسرے شکست سے دوچار ہونے اور قتل و زخم کھانے کا' مزید براں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

خبر وفات کا اور دشمنوں کے اچانک پہاڑ کی طرف سے حملہ آور ہونے کا۔ اس لئے یہاں پر خاص طور پر دو غم مراد نہیں ہیں بلکہ پے در پے آزمائشوں سے دوچار ہونا ہے۔

سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قول " بغم " اجر و ثواب کا تکملہ ہے نہ کہ ثواب کی جزا ہے تو معنی یہ ہوتے کہ تمہیں ایک غم سے متصل دوسرا غم دیا' کیوں کہ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر فرار ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی کہ "اس مورچے پر جمے رہیں" کی خلاف ورزی کی آپسی اختلافات کا شکار ہوئے اور بزدلی و مایوسی کا مظاہرہ کیا۔ اور ان میں ہر فعل ایک قسم کے غم کا موجب و سبب ثابت ہوا۔

مزید اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر یہ فضل و کرم رہا کہ طبیعتوں میں بعض وہ صفات سیئہ جو کہ مدد و نصرت کے لئے مانع بنتی ہیں' ان کو جبری طور پر کچھ اسباب پیدا کر کے خارج فرما دیا جو بظاہر ناخوشگوار تھے اور اس سے مسلمانوں کو بخوبی علم ہوا کہ توبہ و استغفار کرنا' ان صفات سے بچنا' انتہائی ضروری ہے جیسا کہ کبھی کبھی بعض بیماریوں کی وجہ سے جسم کو صحت و قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر مزید رحم و کرم فرمایا۔ ان پر اونگھ طاری کر کے اس غم کو دور فرما دیا اور یہ اونگھ جنگ میں کامیابی کی علامت ہے۔ یہ غزوہ بدر میں بھی طاری ہوئی تھی' اور اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ بعض لوگوں پر یہ نیند نہیں طاری ہوئی' کیونکہ انہیں اسلام' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے علاوہ اپنی جانوں کا غم کھائے ہوئے تھا اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں جاہلانہ بدگمانیاں رکھتے تھے۔

اس بدگمانی کی تفسیر علماء نے یہ کی ہے کہ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا' اور آپ کی جد وجہد کمزور ہو جائے گی' اور یہ بھی سوچتے تھے کہ جو کچھ ہوا وہ قضاء و قدر الٰہی سے نہیں ہوا اور اس میں کوئی حکمت بھی نہیں۔

چنانچہ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ وہ لوگ قضاء و قدر' حکمت الٰہی اور دین الٰہی کے غلبہ کے منکر تھے۔ یہی وہ بدگمانی ہے جس کا مشرکین اور منافقین عقیدہ رکھتے تھے جس کا ذکر سورہ فتح میں ہے۔ ایسے خیالات کو بدگمانی سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ کیونکہ ایسا عقیدہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات' اسماء اور اس کی حکمت و حمد اور اسکی ربوبیت و الوہیت اور اسکے وعدوں کے سچے ہونے کے متعلق رکھنا شایان شان نہیں ہے۔

اس لئے جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے دین کو غالب نہیں کرے گا اور باطل کو حق پر غلبہ دے گا جس سے حق کمزور پڑ جائے گا جس کے نتیجہ میں وہ اٹھ نہ سکے گا تو اس کی یہ

سوچ بد ظنی ہوگی۔ اگر کوئی اس طرح کے کام میں تقدیر الٰہی کا انکار کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و ملکیت کا منکر ہے اور جو اس میں اس کی حکمت کا انکار کرے جس پر وہ حمد کا مستحق ہے اور یہ سمجھے کہ اس کا کام حکمت الٰہی سے خالی صرف مشیئت ہے تو یہ کفار کا گمان ہے اور کفار کے لئے جہنم کی خرابی و تباہی ہے۔

بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کی شان میں بدگمانیاں رکھتے ہیں خصوصا ان چیزوں میں جو قضاء و قدر سے متعلق ہوتی ہیں' اور اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی حمد و حکمت پر پورا ایمان و یقین رکھتا ہو' اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے مایوس ہوا وہ بھی بدگمانی کا شکار ہوا اور جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالیٰ نیکو کار کو عذاب دے سکتا ہے اور اس کے اور دشمن کے درمیان یکساں معاملہ کر سکتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ برا گمان رکھتا ہے۔

جس نے یہ خیال کیا کہ اس نے مخلوق کو امر و نہی کا پابند نہیں بنایا ہے اور ان کو کسی عمل پر ثواب و عذاب نہیں دے گا اور جس میں وہ اختلاف کریں اس میں اپنا حکم و فیصلہ بیان نہیں کرے گا' وہ بھی بدگمانی کا شکار ہوا۔

اسی طرح یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ بغیر سبب کے عمل صالح کو ضائع کر دے گا۔ بغیر گناہ کئے سزا دے گا اور دشمنوں کی معجزات کے ذریعہ مدد فرمائے گا۔ جن کے ذریعہ انبیاء کرام کی تائید ہوتی تھی اور اس کا ہر کام اچھا ہے خواہ ساری عمر عبادت کرنے والے کو دوزخ میں ڈالدے اور ہمیشہ معصیت کرنے والے پر انعام و اکرام کرے۔ دونوں حسن میں برابر ہیں۔ کسی ایک کام کا محال ہونا بغیر سچی خبر کے معلوم نہیں ہو سکتا۔ عقل ایک کے قبح اور دوسرے کے حسن کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح جو شخص یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات اور افعال کے بارے میں ایسی چیزوں کے ذریعہ خبر دی ہے جو باطل ہیں اور حق کو چھوڑ دیا ہے اور اس کی خبر دینے کے بجائے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور تشبیہ اور باطل کے ذریعہ تصریح کی ہے اور یہ چاہا کہ مخلوق اس کے کلام کی تحریف میں ذہنی کاوش سے کام لے اور اسماء و صفات کی معرفت کے بارے میں کتاب الٰہی کی جگہ انسان عقول پر اعتقاد کرے بلکہ یہ چاہا کہ انسان اس کے کلام کو اپنی معروف زبان پر نہ محمول کریں حالانکہ اسے حق کو واضح کرنے اور ان الفاظ کو دور کرنے پر قدرت ہے جن سے لوگ باطل عقیدے میں پڑ جاتے ہیں۔

اسی طرح جو یہ سمجھے کہ اللہ اور رسول کے سوا اس نے اور اسکے پیش روؤں نے حق کو واضح کیا ہے اور ہدایت و رہنمائی انہی کے کلام میں ہے اور کلام الٰہی کے ظاہری معنی سے گمراہی کے علاوہ کچھ اور

حاصل نہیں' تو ایسا سوچنے والے تمام لوگ اللہ کے ساتھ بدترین گمان رکھتے ہیں اور ایسا گمان دور جاہلیت کا گمان ہے۔

جو یہ گمان رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی کائنات میں ایسی بھی چیزیں ہیں جسے وہ نہیں چاہتا اور جس کی ایجاد و تکوین پر وہ قادر نہیں ہے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی ہے۔ اور جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالیٰ ازل سے ابد تک معطل ہے اور افعال پر قدرت نہیں رکھتا پھر بعد میں اس پر قادر ہو جاتا ہے' اور یہ کہ وہ نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور نہ مخلوقات کا علم رکھتا ہے تو یہ بھی بدگمانی کا مرتکب ہے اور جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالیٰ نہ ارادہ فرماتا ہے اور نہ کلام سے متصف ہے اور نہ اس نے کلام کیا اور نہ کرے گا اور نہ حکم دیا اور نہ منع کیا تو اس نے بھی بدگمانی کی۔

جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر عرش پر مخلوق سے جدا نہیں ہے اور تمام مقامات کی نسبت اس کے حق میں برابر ہے اور جو سبحان ربی الاعلی کی طرح سبحان ربی الاسفل کہے تو یہ بدترین گمان ہے۔

جس نے یہ خیال کیا کہ کفر اور فسق و معصیت کو اسی طرح پسند کرتا ہے جس طرح اطاعت و عبادت کو تو اس نے بھی بدگمانی کی۔ اور جس نے یہ سمجھا کہ وہ نہ تو پسند کرتا ہے نہ راضی ہوتا ہے' نہ ناراض ہوتا ہے نہ دوست رکھتا ہے نہ دشمن سمجھتا ہے' نہ کسی سے قریب ہوتا ہے نہ کسی کو قریب کرتا ہے' تو یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی ہے اور یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ دو متضاد چیزوں کے درمیان برابری کرے گا' یا دو برابر چیزوں کے درمیان تفریق کرے گا یا ایک کبیرہ گناہ سے تمام عمر کی نیکیوں کو ضائع کر کے گناہ کے مرتکب کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دے گا تو یہ بھی بدگمانی ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات یا اس کے رسول نے جن صفات سے اسے متصف کیا ہے' ان کے خلاف عقیدہ رکھنا یا ان کو معطل گردانا بدگمانی ہے۔

اس طرح اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے اس کا لڑکا ہے یا شریک ہے یا بغیر اس کی اجازت کے کوئی سفارشی ہے یا اس کے اور مخلوق کے درمیان کچھ وسائل ہیں جو ضرورتوں کو اس تک پہنچاتے ہیں یا اس کے پاس کے انعامات اطاعت کی طرح معصیت سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں' یا جب اس کی رضا کے لئے کوئی چیز چھوڑ دی جاتی تو وہ اس سے بہتر عوض نہیں دیتا یا محض چاہنے پر وہ بلا سبب بندے کو سزا دیتا ہے یا سچی رغبت و خوف کے باوجود بندے کو نامراد بنا دیتا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دشمنوں کو مسلط کر

دیتا ہے یا آپ کی وفات کے بعد لوگوں نے خود رائی سے کام لے کر اہل بیت پر ظلم و زیادتی کی اور ان کے کسی گناہ کے بغیر اللہ اور اہل بیت کے دشمنوں کو غلبہ حاصل ہو گیا لیکن ان کی کوئی مدد نہ کرسکا۔ پھر ان ہی دشمنوں کو جنھوں نے آپ کے دین میں تبدیلی کردی تھی قبر میں آپ کا ہم خواب بنا دیا جہاں امت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ ان پر بھی سلام بھیجتی ہے۔

تو یہ باطل عقائد اور بدگمانیاں وہ شخص رکھتا ہے جو یا تو کافر ہے یا بدعتی اور لوگوں میں ایک بڑی تعداد الا ماشاء اللہ اس طرح کی بدعقیدگی اور بدگمانی کی شکار ہے' اور بڑی تلاش و جستجو کے بعد ہی اس کا علم ہوتا ہے ورنہ تو احساس تک نہیں ہو پاتا۔ اس لئے ہر شخص اپنے آپ کا جائزہ لے اور محاسبہ کرے کہ کیا وہ اس بیماری سے محفوظ ہے بقول شاعر :

اگر محفوظ ہو تو بڑی بلا سے محفوظ ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ محفوظ نہ ہونگے۔

اس لئے ہر عاقل شخص کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے دعا و استغفار کرنا چاہیے کہ مذکورہ بالا بدگمانیوں سے محفوظ رکھے اور صحیح اسلامی عقیدہ کو اپنانے اور اس کے مطابق عمل صالح کی توفیق دے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کلام کو بتایا جو ایسا گمان رکھنے والوں کے باطل گمان سے صادر ہوا یعنی ان کا یہ کہنا کہ :

﴿ هَل لَّنَا مِنَ ٱلْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ﴾ [آل عمران : ١٥٤]

اس معاملہ میں ہمارا بھی کچھ ہے۔

مزید یہ کہنا کہ :

﴿ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ ٱلْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا ﴾ [آل عمران : ١٥٤]

اگر معاملہ میں ہمارا کچھ ہوتا تو ہمیں یہاں قتل نہ کیا جاتا۔

اس قول سے وہ تقدیر ثابت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی مذمت نہ کی جاتی اور یہ جواب دینا مناسب نہ ہوتا کہ :

﴿قل إن الأمر كله لله﴾ [آل عمران : ١٥٤]

آپ فرما دیجئے کہ معاملہ پورا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

ان کا خیال تھا کہ اگر معاملہ ان کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ قتل نہیں کئے جاتے تو مذکورہ آیت سے

ان کی تکذیب کی گئی اور واضح کیا گیا کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

اگر تقدیر میں قتل کیا جانا لکھا ہے تو گھر میں بیٹھا شخص بھی میدان جنگ میں ضرور پہنچے گا اور قتل کیا جائے گا۔

اس میں فرقہ قدریہ کی واضح طور پر تردید ہوتی ہے۔

پھر اس تقدیر میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری حکمت کا ذکر فرمایا ہے یعنی ان کے دلوں میں چھپے ہوئے ایمان یا نفاق کا امتحان جس سے مومن کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ منافقین کی باطنی کیفیات ظاہر ہو جاتی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ایک اور دوسری حکمت کا ذکر کیا ہے یعنی مومنوں کے دل کی صفائی اور پاکیزگی کیونکہ دلوں پر نفسانی خواہشات اور فطری و مزاجی آزادی' شیطانی مکرو فریب اور رسم و رواج کے غلبہ کی وجہ سے ایسے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں جو ایمان و یقین کے منافی ہوتے ہیں۔ اگر دلوں کو ہمیشہ عافیت حاصل رہے تو ان سب کے برے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اسلئے انسانوں کیلئے بربنائے رحم و کرم اس طرح کی شکست اور ناکامی بسا اوقات ناگزیر ہو جاتی ہے تاکہ ان کی قدرے اصلاح ہو سکے اور یہ بھی ایک طرح کی مدد اور نصرت ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان سچے مسلمانوں کا ذکر کیا جو میدان جنگ سے بھاگ آئے تھے اور ان کا یہ فعل گناہوں کی وجہ سے تھا اور شیطان ایسے اعمال کی وجہ سے انہیں پھسلاتا ہے جو کہ دشمن کی قوت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے کیونکہ اعمال کے اثرات اچھے اور برے دونوں ہوتے ہیں۔ اگر انسان ایسے دشمن کے مقابلہ میں راہ فرار اختیار کرلے جس کا مقابلہ کر سکتا تھا تو یہ برے اعمال کے اثرات و نتائج سے ہوا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ مسلمانوں کو معاف کر دیا گیا' کیونکہ وہ میدان جنگ سے کسی شک کی بنیاد پر نہیں بھاگے تھے' بلکہ ایک عارضی سبب سے ایسا ہو گیا تھا مزید بتایا کہ جو کچھ ہوا وہ ان کی شامت اعمال تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿أَوَلَمَّآ أَصَٰبَتۡكُم مُّصِيبَةٞ قَدۡ أَصَبۡتُم مِّثۡلَيۡهَا﴾ [آل عمران : ١٦٥]

کیا جب تمہیں کچھ تکلیف پہنچی جس سے دگنی تم ان کو پہنچا چکے تھے۔

اس مضمون کو کئی سورتوں میں مزید وضاحت سے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَمَآ أَصَٰبَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ أَيۡدِيكُمۡ وَيَعۡفُواْ عَن كَثِيرٍ ﴾

[الشوری : ۳۰]

جو کچھ تم کو مصیبت پہنچی ہے سب تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے اور بہت سے قصور معاف کر دیتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

﴿ مَّآ أَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ ٱللَّهِۖ وَمَآ أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفۡسِكَۚ ﴾ [النساء : ۷۹]

جو بھلائی تم کو پہنچی ہے وہ اللہ کی مہربانی سے ہے اور جو تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہارے نفس سے ہے۔

اس سے اس بات کا علم ہوا کہ نعمتوں کا حصول اس کے محض فضل و کرم کا نتیجہ ہے اور مصیبتوں کا نزول اس کے عدل و انصاف کا تقاضہ ہے پھر آیت کو اس جملہ پر ختم فرمایا :

﴿ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيرٌ ﴾ [آل عمران : ۱۶۵]

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ عدل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرت بہت عام ہے۔ اس سے تقدیر اور اسباب دونوں کا اثبات ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سبب بندوں کی طرف اور قدرت عامہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے۔ پہلی چیز سے فرقہ جبریہ کی تردید ہوگی اور دوسری بات سے فرقہ قدریہ کی تردید ہو گئی۔

اسی طرح کا مضمون اس آیت میں مذکور ہے :

﴿ لِمَن شَآءَ مِنكُمۡ أَن يَسۡتَقِيمَ ○ وَمَا تَشَآءُونَ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ رَبُّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾

[التکویر : ۲۸، ۲۹]

اس کے لئے جو راہ راست پر سیدھا چلنا چاہے اور تم چاہ کر کامیابی حاصل نہیں کر سکتے مگر جس وقت خدا ہی چاہے جو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔

اس آیت میں قدرت کا ذکر کرنے میں یہ لطیف نکتہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اس لئے ان امور کی وضاحت سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی بات کو ایک دوسری آیت میں اس طرح واضح فرمایا ہے :

﴿ وَمَآ أَصَٰبَكُمۡ يَوۡمَ ٱلۡتَقَى ٱلۡجَمۡعَانِ فَبِإِذۡنِ ٱللَّهِ ﴾ [آل عمران : ۱٦٦]

اور جو تکلیف تم کو دو لشکروں کے مقابلہ کے دن پہنچی وہ بھی اللہ کے حکم سے تھی۔

اور اس اجازت سے تکوینی و تقدیری اذن مراد ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تقدیر کی حکمت میں یہ بتایا کہ علانیہ طور پر مومنین اور منافقین میں فرق ظاہر ہو سکے اور لوگوں کو ان کی معرفت ہو جائے چنانچہ منافقین نے جن کے دل میں شک و شبہات تھے اپنی زبان سے ان کا اظہار کیا اور مسلمانوں نے اسے سنا اور اللہ تعالیٰ کی اس پر نکیر بھی سنی تو انہیں اس کا انجام بھی معلوم ہو گیا۔

ان مذکورہ تفصیلات کے بعد ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس غزوہ میں کتنی حکمتیں، نعمتیں، نصیحتیں اور ہدایتیں پوشیدہ ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو شہداء کے سلسلہ میں بڑی خوش اسلوبی سے تسلی و تسکین دی :

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ ٱلَّذِينَ قُتِلُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتًۢا ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ ﴾ [آل عمران : ١٦٩]

اللہ کی راہ میں قتل کئے جانے والوں کو مردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ زندہ ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے شہداء کے لئے دائمی زندگی، قرب خداوندی، مسلسل رزق کی فراہمی، غیر معمولی نعمتوں کے حصول کے بعد ان کی فرحت و رضاء الٰہی اور جو مسلمان بھائی ابھی ان سے نہیں جا ملے ان سے مل کر ان کی خوشی کا اہتمام ہونا مزید براں ان پر نعمتوں اور انعام و اکرام کی تجدید سے ان مذکورہ چیزوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش کے مقابلہ میں غیر معمولی نعمت کا ذکر کیا ہے جس کے حصول کے بعد بڑی سے بڑی مصیبت آزمائش لاشی نظر آتی ہے۔ وہ بعثت نبوی کی نعمت ہے۔ اگر اس کے عظیم فوائد پر غور کیا جائے تو یہ سب مصیبتیں انتہائی معمولی نظر آتی ہیں۔ مزید اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ ان آزمائشوں کے سبب خود مسلمان تھے اس لئے ان کو ان اسباب سے پرہیز کرنا چاہیے اور یہ سب قضاء و قدر سے نازل ہوئی تھی۔ اس لئے ہمیشہ ان کو خدائے وحدہ لاشریک لہ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور ان حکمتوں کو اس لئے ذکر فرما دیا تاکہ اس کی تقدیر پر ایمان اور حکمتوں پر یقین رکھیں اور اس سے بدگمان نہ ہوں، اور اس کے اسماء حسنہ اور صفات علیا کے ذریعہ اس کی معرفت اور بصیرت حاصل کریں۔

پھر تسلی و تسکین دینے کے طور پر یہ فرمایا کہ اگر مسلمان نصرت اور غنیمت سے محروم ہو گئے ہیں تو اس کے عوض بڑی نعمتیں ملی ہیں۔ پھر آخر میں شہداء کے متعلق تسلی دی ہے کہ ان پر غم نہ کریں بلکہ خود بھی شوق شہادت کا جذبہ پیدا کریں۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

فصل (۱۷)

حمراء الاسد کا واقعہ

جب جنگ احد ختم ہو گئی اور مشرکین مکہ واپس لوٹ گئے تو مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ مشرکین دوبارہ حملہ کا ارادہ کر رہے ہیں۔ یہ خبر ان پر بے حد گراں گذری چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ان کا تعاقب کرو اور دیکھو کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا ارادہ رکھتے ہیں اگر وہ گھوڑوں کو چھوڑ کر اونٹوں پر سوار ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ مکہ جا رہے ہیں اور اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہیں اور اونٹوں کو روانہ کر چکے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ مدینہ کا ارادہ رکھتے ہیں تو قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر وہ مدینہ کا ارادہ رکھتے ہوں گے تو میں آگے بڑھ کر ان سے مقابلہ کروں گا۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ میں ان کے تعاقب میں نکلا کہ دیکھوں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ جانے پر اندازہ ہوا کہ وہ گھوڑوں کو چھوڑ کر اونٹوں پر سوار ہو کر مکہ واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں۔

جب مشرکین مکہ واپسی کا ارادہ کر کے نکلنے لگے تو ابوسفیان نے کہا کہ اب ہمارا اور تمہارا وعدہ اگلے سال بدر کے مقام پر ملاقات کا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہہ دو کہ ہاں ضرور ملیں گے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم نے ان کا زور توڑ دیا ہے لیکن ہم نے ان کو ایسے چھوڑ دیا ہے۔ وہ دوبارہ اپنی قوت اکٹھا کر لیں گے۔ اس لئے ہمیں لوٹ کر ان کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو لوگوں میں یہ اعلان فرمایا کہ وہ جہاد کے لئے تیار ہو جائیں اور وہی لوگ نکلیں جو غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے' چنانچہ لوگوں نے اس ندا پر باوجود شکستہ ہونے کے لبیک کہا۔ صرف حضرت جابر رضی اللہ عنہ اپنے والد کی حالت کی وجہ سے اجازت چاہی تو انہیں نہ جانے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ اس طرح صحابہ کرام چل کر مقام حمراء الاسد پہنچے۔

اس موقع پر ابو سفیان نے مدینہ جانے والے ایک مشرک سے کہا کہ اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارا ایک پیغام پہنچا دو تو میں تم کو مکہ واپسی پر ایک سواری کے وزن کے بقدر کشمش دوں گا تو اس نے کہا کہ ضرور۔ ابو سفیان نے کہا کہ کہہ دینا کہ ہم نے مسلمانوں پر بھرپور حملہ کا پلان بنایا ہے تاکہ ان کو نیست و نابود کر دیں۔ جب مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچا تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھے :

﴿ حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝ فَانقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ﴾ [آل عمران: ۱۷۳، ۱۷۴]

اللہ ہم کو کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ پھر وہ خدا کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس آئے' ان کو کچھ بھی ضرر نہ پہنچا اور اللہ کی مرضی پر چلے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

غزوہ احد ماہ شوال سنہ ۳ ہجری میں پیش آیا' جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے اور سال کے بقیہ مہینے وہیں ٹھہرے۔ جب محرم کا چاند طلوع ہوا تو آپ کو اطلاع ہوئی کہ خویلد کے دونوں لڑکے طلیحہ و سلمہ اپنی قوم کے ہمراہ بنی اسد کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ پر ابھار رہے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے حضرت ابو سلمہ کو ڈیڑھ سو افراد دے کر ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ جب یہ سرفروشوں کی جماعت ان کے علاقہ میں پہنچی تو انہیں ایک اونٹ اور کچھ بکریاں مال غنیمت کے طور پر ملیں اور یہ لوگ بغیر کسی مزاحمت کے مدینہ واپس آ گئے۔

محرم کی پانچویں تاریخ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ خالد بن سفیان ھذلی جنگ کے ارادے سے لوگوں کو جمع کر رہا ہے' چنانچہ عبداللہ بن انیس کو اس کی طرف بھیجا' انہوں نے اسے قتل کیا۔

صفر کے مہینے میں قبیلہ عضل اور قارہ سے ایک جماعت خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور اپنے کو مسلمان ظاہر کیا اور درخواست کی کہ ان کے ہمراہ ان صحابہ کو بھیجا جائے جو عالم دین ہوں اور انہیں قرآن سکھائیں' چنانچہ آپ نے حضرت خبیب سمیت چھ صحابہ کی ایک جماعت حضرت مرثد بن ابی مرثد الغنوی کی سربراہی میں روانہ فرمادی' چنانچہ ان کو دھوکہ دے کر شہید کر دیا گیا۔

واقعہ بئر معونہ :

اسی یعنی ہجرت کے چوتھے سال صفر کے مہینے میں بئر معونہ کا واقعہ پیش آیا۔

غزوہ بنو نضیر :

پھر ربیع الاول میں غزوہ بنو نضیر پیش آیا۔ امام زہری کا خیال ہے کہ یہ غزوہ بدر کے چھ ماہ بعد پیش آیا تھا' لیکن یہ ان کا تسامح یا غلطی ہے' کیوں کہ یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ غزوہ احد کے بعد پیش آیا تھا۔ بدر کے بعد غزوہ قینقاع پیش آیا تھا۔ اسی طرح غزوہ قریظہ غزوہ خندق کے بعد اور خیبر حدیبیہ کے بعد' اس طرح یہود کے ساتھ کل چار غزوات پیش آئے۔

غزوہ ذات الرقاع :

پھر جمادی الاول میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ ذات الرقاع میں خود بنفس نفیس حصہ لیا۔ یہ نجد کا غزوہ ہے' اور بنی غطفان کے ارادے سے نکلے۔ اس غزوہ میں آپ نے صلاۃ خوف ادا فرمائی۔ اس غزوے کے متعلق ابن اسحاق اور اہل سیر و مغازی کا یہی قول ہے اور اس کو لوگوں نے روایت بھی کیا ہے' لیکن یہ بہت مشکل سا مسئلہ ہے۔ بظاہر پہلی صلاۃ خوف آپ نے غزوہ عسفان میں پڑھی ہے' جیسا کہ ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ غزوہ عسفان غزوہ خندق کے بعد پیش آیا اور آپ سے یہ بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ اس کو غزوہ ذات الرقاع میں پڑھی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خندق و عسفان کے بعد واقع ہوا تھا۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابو موسیٰ صحیحین کی روایت کے مطابق غزوہ ذات الرقاع میں شریک تھے۔

غزوہ بدر ثانیہ :

جب آئندہ سال شعبان کا مہینہ آیا اور ایک روایت کے مطابق ذوالقعدہ کا' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو سفیان سے وعدہ کے مطابق ایک لشکر لے کر نکلے۔ آخر بدر کے مقام پر پہنچے اور وہاں مشرکین کا انتظار کیا۔ ابو سفیان بھی مکہ سے دو ہزار کا لشکر لے کر نکلا اور ان کے ساتھ پانچ سو سوار تھے اور یہ جب مرالظہران پہنچے جو مکہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ہے تو وہ لوگ کہنے لگے' یہ خشک سالی کا سال ہے' اس لئے مناسب ہے کہ ہم واپس لوٹ جائیں۔

غزوہ دومۃ الجندل :

ربیع الاول سنہ ۵ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دومۃ الجندل کی طرف نکلے۔ وہاں آباد قبیلوں کے مویشیوں پر حملہ ہوا' اور ان میں سے کچھ مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگے۔ اس حملہ کو سن کر

اہل قبیلہ دومتہ الجندل بھاگ کھڑے ہوئے۔

غزوہ مرتسیع :

یہ غزوہ ماہ شعبان سنہ ۵ ہجری میں واقعہ ہوا۔ وجہ یہ ہوئی کہ بنی مصطلق کا سردار حارث بن ابی ضرار اپنے قبیلہ اور قرب و جوار کے عربوں کا ایک جم غفیر لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے نکلا۔

مدینہ خبر پہنچی تو آپ نے پہلے حضرت بریدہ اسلمی کو بنی مصطلق کی خبر لانے بھیجا۔ پھر آپ خود مسلمانوں کی ایک جمعیت کے ساتھ نکلے' جب مرتسیع نام مقام پر پہنچے تو حارث کی فوج خود بخود منتشر ہو گئی' مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے حملہ کیا اور قیدی اور ساز و سامان بطور غنیمت حاصل کیے۔

فصل (۷۲)

واقعہ افک

غزوہ مر-سیع سے "افک" کا مشہور واقعہ بھی تعلق رکھتا ہے۔ جس کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھیں۔ واپسی پر جبکہ لشکر ایک جگہ پڑاؤ ڈالے تھا' وہ استنجاء کے لئے میدان میں گئیں۔ واپس آئیں تو معلوم ہوا کہ گلے کا ہار جو بہن سے عاریتہ لائی تھیں گم ہے۔ فورا تلاش میں واپس ہوئیں۔ اسی اثناء میں لشکر نے کوچ کر دیا۔ جو لوگ ان کا کجاوہ اونٹ پر باندھا کرتے تھے انہوں نے جلدی میں کجاوہ اٹھا کے یہ سمجھتے ہوئے باندھ دیا کہ وہ اندر ہیں۔ یہ اس وقت کم سنی کی وجہ سے بہت ہلکی پھلکی تھیں' اس لئے انہیں کچھ محسوس نہ ہوا۔

حضرت صفوان بن المعطل لشکر کے پیچھے پیچھے چلتے تھے کہ گری پڑی چیزیں اٹھالیں' ان کی نظر جب حضرت عائشہ پر پڑی تو اناللہ کہہ کر سکتہ میں آگئے۔ وہ انہیں پہچانتے تھے کیونکہ پردہ شروع ہونے سے پہلے بارہا دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے کچھ کہا سنا نہیں ' ادب سے اونٹ قریب لا کے بیٹھا دیا اور وہ سوار ہو گئیں۔ یہ خود مہار تھامے پیدل روانہ ہوئے یہاں تک کہ لشکر سے آملے۔ لوگوں نے یہ بات دیکھی تو اپنی اپنی سمجھ کے مطابق تاویلیں کرنے لگے۔ ابن ابی منافق کو معلوم ہوا تو فورا تہمت لگا دی اور شہرت دینے لگا۔

مدینہ میں افتراء پردازوں نے ہر طرف شور مچانا شروع کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول بالکل خاموش رہے پھر صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارتا طلاق کی صلاح دی کیونکہ معاملہ مشکوک ہو چکا تھا اور شک کے مقابلہ میں یقین کو ترجیح دینا مناسب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رنج و غم سے نجات مل جائے جو لوگوں کی چہ میگوئیوں اور الزام سے لاحق ہوا تھا۔ لیکن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس کی مخالفت کی اور ساتھ ہی رکھنے کا مشورہ دیا کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اور ان کے والد ماجد

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے غیر معمولی محبت و تعلق رکھتے ہیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عفت و عصمت اور تدین کا پورا یقین رکھتے ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب نبی کی شریک حیات اور اپنے صدیق کی لڑکی کو افتراء پردازوں کے الزامات کے مصداق بنائے۔

دراصل دونوں کے نقطہ نظر کا اختلاف ان بنیادوں پر تھا اور ان سب صحابہ کرام کو یقین کامل تھا کہ حضرت عائشہ ام المومنین عصمت و عفت کی پیکر ہیں اور ہر طرح کے شک و شبہات سے بالا تر ہیں اور رسول اکرم و نبی اطہر کی شریک حیات غیر پارسا ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس لئے حضرت ابو ایوب اور دوسرے صحابہ کرام کی زبان سے بیک وقت یہ نکلا : ﴿ سُبْحَٰنَكَ هَٰذَا بُهْتَٰنٌ عَظِيمٌ ﴾ سبحان اللہ ' یہ تو کھلی ہوئی تہمت ہے۔

اس واقعہ کے بعد کامل ایک ماہ تک وحی کا سلسلہ موقوف رہا مگر جب وحی آئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کے ساتھ آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب براءت کی آیات پڑھیں تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسرت سے اچھل پڑے اور صاحبزادی سے کہنے لگے اٹھو' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خودداری اور جراءت قابل ذکر ہے۔ انہوں نے جواب دیا' اللہ کی قسم! میں ان کا ہرگز شکریہ ادا نہ کروں گی۔ میں صرف اپنے اللہ کا شکریہ ادا کروں گی جس نے میری براءت نازل فرمائی۔ یہ جواب ان کی پاک دامنی' بلند ہمتی اور ثابت قدمی کی بہترین مثال ہے۔

جب وحی کے ذریعہ براءت ثابت ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تہمت لگانے والے لوگوں کو اسی اسی درے لگوائے کیوں کہ تہمت لگانے کا جرم ثابت ہو گیا تھا۔

اس جگہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں قدرے توقف و تحقیق سے کیوں کام لیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ان حکمتوں کے اظہار کے لئے تھا جو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے اندر پوشیدہ کر رکھی تھیں' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قیامت تک آنے والے آپ کے امتیوں کے لئے بطور امتحان و آزمائش مقصود تھیں تاکہ کچھ لوگوں کو پست اور کچھ لوگوں کو بلند کیا جائے۔

آزمائش ہی کا تقاضا تھا کہ ایک ماہ تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا اور پوری حکمت الٰہی کا ظہور عمل میں آیا۔ اس طرح مومنوں کے ایمان میں اضافہ اور عدل و حسن ظن پر ثابت قدمی میں زیادتی ہوئی' اور

منافقین اپنے نفاق و افتراء پردازی پر جمے رہے۔ اس طرح ان کے پوشیدہ ارادے بالکل نمایاں ہو گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے والد ماجد کی شان عبودیت اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان پر تمام ہوئیں' کیونکہ انہوں نے اللہ کے حضور عاجزی و حاجتمندی کا اظہار کیا اور مخلوق سے کٹ کر خالق سے امید باندھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس موقع کا پورا حق اس وقت ادا کر دیا جب ان کے والدین نے فرمایا کہ اٹھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری براءت کی وحی نازل فرما دی ہے' تو کہنے لگیں' اللہ کی قسم میں ان کی طرف خود نہ جاؤں گی اور میں صرف اللہ ہی کی حمد و ثناء کروں گی کیونکہ اسی نے میری براءت نازل فرمائی ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ فوری طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل حقیقت سے مطلع فرما دیتا تو یہ تمام امور اور حکمتیں فوت ہو جاتیں اور کسی کو کچھ معلوم نہ ہوتا۔ مزید اللہ تعالیٰ کی یہ بھی مشیئت تھی کہ جو اس کے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا کا مرتبہ ہے' اسے ظاہر کرے اور خود بنفس نفیس ان کا دفاع کرے' اور ان دشمنوں کی تردید کرے جو آپ کی طرف بے بنیاد باتیں منسوب کر رہے ہیں۔

مزید یہ کہ اس افتراء و تہمت کا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینا تھا جب کہ آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام تھا۔ اس وقت ان کی پاک دامنی کے لئے خود آپ کی شہادت موزوں نہ تھی۔ آپ کو حضرت عائشہ کی براءت کا پورا یقین تھا اور دوسرے مومنوں سے زیادہ آپ کے پاس دلائل و قرائن تھے' لیکن کمال صبر و تحمل کی وجہ سے آپ خاموش رہے اور صبر و ثبات کا حق ادا فرما دیا اور اس کی عدیم المثال روایت قائم فرما دی اور جب حضرت عائشہ کی براءت کے سلسلہ میں وحی نازل ہو گئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے عبداللہ بن ابی کے جس نے تہمت میں حصہ لیا تھا' کوڑے لگانے کا حکم فرمایا۔ تو علماء نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں :

پہلا جواب : یہ ہے کہ حدود جاری ہونے سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے لیکن چونکہ ابن ابی منافق تھا' اس لئے حدود کا مستحق نہیں بلکہ اس کے لئے دردناک عذاب کا وعدہ ہے۔

دوسرا جواب : یہ ہے کہ حدود اسلامیہ کا نفاذ تو اقرار سے ثابت ہوتا ہے یا گواہوں کی شہادت سے اور اس کے سلسلہ میں نہ تو کسی نے گواہی دی اور نہ اس نے خود اعتراف و اقرار کیا' کیونکہ اس کے گروہ

کے لوگ اس کے خلاف گواہی نہیں دے سکتے تھے اور وہ خود مسلمانوں کے سامنے اس طرح کی باتیں نہیں کرتا تھا اس لئے حد سے محفوظ رہا۔

تیسرا جواب : یہ ہے کہ حد قذف میں یہ اصول ہے کہ جس پر تہمت لگائی جائے' وہ تہمت لگانے والے پر حد جاری کرنے کا مطالبہ کرے اور حضرت عائشہ نے اس کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

چوتھا جواب : یہ ہے کہ بربنائے مصلحت اس پر حد نہیں جاری کی گئی جس طرح نفاق کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی قتل نہیں کیا گیا کیونکہ وہ اپنی قوم کا سردار تھا اور اس کی طرف سے فتنہ انگیزی کا اندیشہ تھا اور لوگوں میں اسلام سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ ان بعض وجوہ کی بنا پر حد جاری نہیں کی گئی۔

اس غزوہ سے واپسی پر عبداللہ بن ابی نے کہا کہ :

﴿ لَئِن رَّجَعْنَآ إِلَى ٱلْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ ٱلْأَعَزُّ مِنْهَا ٱلْأَذَلَّ ﴾ [المنافقون : ۸]

اگر ہم مدینہ واپس گئے تو عزت والے ذلت والوں کو وہاں سے باہر نکال دیں گے۔

حضرت زید بن ارقم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچائی۔ عبداللہ بن ابی عذر کرتا ہوا آیا اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے یہ بات نہیں کہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ منافقین میں حضرت زید بن ارقم کی تصدیق نازل فرمائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید سے فرمایا کہ خوش ہو جاؤ' اللہ تعالیٰ نے تمہاری تصدیق کر دی اور مزید فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے کان کا حق ادا کر دیا۔

حضرت عمر جو حاضر مجلس تھے' عرض کیا' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عباد بن بشیر کو حکم دیجئے کہ اس بد بخت کی گردن مار دیں۔ آپ نے فرمایا نہیں' لوگ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو قتل کرا دیتے ہیں۔

فصل (۷۳)

غزوہ خندق

یہ غزوہ شوال سنہ ۵ ہجری میں واقع ہوا۔ سبب یہ ہوا کہ یہودیوں نے جب احد میں مشرکین کی کامیابی اور مسلمانوں کی شکست دیکھی اور سنا کہ ابو سفیان آئندہ سال پھر حملہ کرنے والا ہے' تو ان کی بھی ہمتیں بلند ہو گئیں' چنانچہ یہود کے سردار قریش کے پاس گئے۔ انہیں حملہ کے لئے اکسایا اور اپنی امداد و اعانت کا یقین دلایا۔ ان کے وعدے سے قریش کو اور زیادہ جراءت ہوئی' اور وہ ان کے صلاح و مشورہ سے جنگ کی تیاریاں کرنے لگے اور قبیلہ غطفان اور دوسرے قبائل عرب کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرنے لگے۔ تھوڑی ہی مدت میں ایک لشکر جرار فراہم ہو گیا' جس میں دس ہزار جانباز مختلف قبائل عرب میں سے تھے اور یہودی بھی شریک تھے۔ سپہ سالاری ابو سفیان کو دی گئی' اور اس فوج گراں نے سیلاب بلا بن کر مدینہ کی سمت پیش قدمی شروع کی۔

اطلاع ملنے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی کے مشورے سے مدینہ کے گرد خندق کھدوائی اور تین ہزار مجاہدوں کی جمعیت لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے نکلے اور خندق پر پڑاؤ ڈال دیا۔ عین اس وقت یہودی قبائل نے معاہدہ توڑ دیا اور قریش سے مل گئے اور منافقین کا نفاق کھل گیا جس کا اثر مسلمانوں پر بہت برا ہوا اور بہت سے لوگ بددل ہو گئے۔

اس دوران مشرکین کا لشکر بھی آ پہنچا اور چاروں طرف سے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ پورے ایک مہینہ تک محاصرہ اپنی پوری شدت سے جاری رہا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس نازک گھڑی میں دستگیری کی اور دشمنوں کی شکست کا سامان غیب سے کر دیا۔ ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آندھی کا ایک ہولناک طوفان بھیج دیا جس نے کفار کو سخت بدحواس کر ڈالا اور وہ بڑی ابتری کے ساتھ فرار ہو گئے۔ اس طرح بلا کسی بڑے کشت و خون کے دشمنان اسلام رسوا و خوار ہو کر شکست یاب ہوئے اور مسلمانوں کا دبدبہ ہر طرف قائم ہو گیا۔

کفار کی ناکام واپسی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ واپس تشریف لے آئے اور ہتھیار کھولنے لگے۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچا کہ بنو قریظہ کو ان کی عہد شکنی کی سزا دیجئے' چنانچہ فوراً منادی کرا دی گئی کہ ہر شخص نماز عصر سے پہلے پہلے بنی قریظہ کی سرزمین میں پہنچ جائے اور خود بھی فوراً روانہ ہو گئے۔ یہودیوں نے بھی مقابلہ کیا' لیکن بالآخر مقہور و مغلوب ہوئے۔ جن کی قسمت میں قتل ہونا تھا قتل ہوئے' باقی ذلت میں پڑے حتیٰ کہ کوئی نام لینے والا نہ رہا۔ ان دونوں لڑائیوں میں دس مسلمان شہید ہوئے۔

اس مقام پر علامہ ابن قیم نے قبیلہ عرینہ کے لوگوں کا واقعہ ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ اس سے درج ذیل احکام ثابت ہوتے ہیں :

۱۔ اونٹ کا پیشاب پینا جائز ہے۔

۲۔ جس جانور کا گوشت کھانا جائز ہے' اس کا پیشاب پاک ہے۔

۳۔ جنگجو کفار اگر اموال پر قبضہ کرلیں تو انہیں ہاتھ پیر کاٹنے اور قتل کی سزا دی جائے گی۔

۴۔ مجرم جیسا جرم کرے ویسا ہی معاملہ اس کے ساتھ کیا جائے گا۔

چنانچہ ان لوگوں نے چرواہے کی آنکھوں میں سلائی ڈالی تھی' تو ان کی آنکھوں میں بھی سلائی ڈالی گئی۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ واقعات مستقل حکم کا درجہ رکھتے ہیں اگرچہ اس وقت تک اسلامی حدود کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے لیکن نازل ہونے کے بعد اس کا اثبات ہوا نہ کہ ابطال۔

فصل (۷۴)

صلح حدیبیہ کا واقعہ

یہ غزوہ ذی القعدہ سنہ ٦ ہجری میں واقع ہوا۔ تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کے ہمراہ عمرہ کی غرض سے مکہ روانہ ہوئے۔ ایک جاسوس پہلے سے بھیج دیا تھا کہ قریش کی نقل و حرکت سے آگاہ کرتا رہے۔ مقام عسفان میں پہنچے تو مخبر نے خبر دی کہ قریش نے اپنی تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ وہ آپ سے جنگ کریں گے اور کعبہ سے قریب نہ ہونے دیں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ اپنی طرف سے کوئی چھیڑ نہ کی جائے لیکن اگر کوئی راستہ روکے تو پھر جنگ کی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ رائے پسند کی اور آگے بڑھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام حدیبیہ پہنچ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام دے کر مکہ بھیجا کہ ہم جنگ کے ارادے سے نہیں آئے' صرف عمرہ مقصود ہے' اس لئے ہمیں نہ روکو۔ قریش نے یہ پیغام بے پروائی سے سنا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ جو کچھ تم نے کہا ہے ہم نے سن لیا' بس رہنے دو۔ اس کے بعد صلح کی بات چیت شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے جھگڑے کی صورت پیدا ہو گئی۔ فریقین نے ایک دوسرے پر پتھراؤ کیا اور تیر برسائے۔ اسی دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ حضرت عثمان کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس سے مسلمانوں میں سخت غم و غصہ پیدا ہو گیا اور سب نے درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی کہ لڑیں گے اور کسی حال میں بھی نہ بھاگیں گے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جلد ہی مکہ سے صحیح و سالم واپس آ گئے جس سے جوش ٹھنڈا ہوا اور صلح کی گفتگو از سر نو شروع ہوئی۔ پھر حسب ذیل شرطوں پر عہد نامہ لکھا گیا :

۱۔ دس سال تک جنگ و جدل موقوف رہے اور کوئی کسی کو نہ ستائے۔

۲۔ مسلمان اس وقت واپس جائیں۔ آئندہ سال آ سکتے ہیں مگر نیزے اور تیر نہ لائیں۔ صرف

تلواروں کی اجازت ہے اور وہ بھی نیاموں کے اندر رہوں۔

۳۔ مکہ میں تین دن قیام رہے گا۔ اس کے بعد فوراواپسی ہوگی۔

۴۔ ان دس سالوں میں جو مسلمان قریش کے پاس آئے گا' وہ اسے واپس نہ کریں گے' لیکن قریش کا جو آدمی مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا' وہ اسے واپس کردیں گے۔

اس آخری شرط نے مسلمانوں کو نہایت برہم کردیا اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے ' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ شرط بھی ہم منظور کرلیں گے؟ آپ نے جواب دیا' ہمارا جو آدمی ان کے پاس چلا جائے گا خدا کی اس پر رحمت ہوگی اور ان کا جو آدمی ہمارے پاس آجائے گا' اور ہم ان کے حوالے کردیں گے' اللہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا۔

معاہدہ مکمل ہوگیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اٹھو ' قربانی کرو اور سر منڈاؤ۔

صلح حدیبیہ کے بعض اہم واقعات :

اس موقع پر قبیلہ خزاعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں داخل ہوا اور قبیلہ بکر قریش کی حمایت میں۔

۱۔ صلح حدیبیہ ہی کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے کعب بن عجرہ کے متعلق یہ حکم نازل فرمایا کہ حج میں سر نہ منڈانے والے فدیہ میں روزہ رکھیں یا صدقہ یا قربانی کریں۔

۲۔ اسی صلح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرنے والوں کے لئے تین بار اورقصر کرانے والوں کے لئے ایک بار دعائے مغفرت فرمائی۔

۳۔ اسی موقع پر دس آدمیوں کی جانب سے ایک اونٹ نحر (ذبح) فرمایا اور سات آدمیوں کی جانب سے ایک گائے ذبح کی۔

۴۔ اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اونٹ کو ھدی میں دیا جو کہ ابوجہل کی ملکیت میں رہ چکا تھا تاکہ مشرکین جل اٹھیں۔

۵۔ اسی وقت سورہ فتح نازل ہوئی۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو کچھ عورتیں مسلمان ہوکر آئیں لیکن اللہ

تعالیٰ نے انہیں واپس کرنے سے منع فرمادیا۔ کہا گیا کہ عورتوں کے معاملہ میں یہ شق منسوخ ہو گئی۔

ایک قول یہ ہے کہ قرآن کے ساتھ سنت کو محدود کر دیا گیا اور ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ صلح حدیبیہ میں صرف مردوں کے متعلق یہ شرط طے ہوئی تھی' چنانچہ مشرکین نے چاہا کہ اس کا دونوں صنفوں (مرد و عورت) پر اطلاق کیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سے انکار فرمایا۔

صلح حدیبیہ سے مستنبط بعض احکام و مسائل :

۱۔ یہ معلوم ہوا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کیا جا سکتا ہے' اور میقات سے عمرہ کا احرام باندھنا افضل ہے' جیسا کہ حج کا احرام۔ جس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ "بیت المقدس سے عمرہ کا احرام باندھنے والے کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں" وہ ثابت نہیں۔

۲۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تنہا عمرہ میں قربانی کا جانور بھیجنا سنت ہے اور اس میں علامت لگانا سنت ہے نہ کہ مثلہ کیا جائے کیونکہ یہ ممنوع ہے۔

۳۔ معلوم ہوا کہ دشمنان اسلام کو جلانا مستحب ہے۔

۴۔ نیز معلوم ہوا کہ امیر کو چاہیے کہ دشمنوں کی نقل و حرکت کا اندازہ کرنے کے لئے جاسوس ارسال کرے۔

۵۔ نیز اہل شرک سے بوقت ضرورت جہاد میں تعاون و مدد حاصل کرنا جائز ہے' چنانچہ عیینہ خزاعی سے جو کہ کافر تھا آپ نے مدد لی تھی۔

۶۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ امام رعیت سے مشورہ کر سکتا ہے تاکہ صحیح رائے سامنے آئے' لوگوں کو اطمینان قلب ہو اور حکم الٰہی پر عمل ہو۔

۷۔ معلوم ہوا کہ مشرکین کی اولاد کو جنگ سے پہلے قید کرنا جائز ہے۔

۸۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ غلط بات کی خواہ غیر مکلف کی طرف منسوب ہو تردید کرنی چاہیے' چنانچہ جب لوگوں نے کہا کہ قصواء اونٹنی اڑ گئی ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ اڑی نہیں' اور نہ اسے زیبا ہے۔

۹۔ دین کی خبر پر حلف اٹھانا جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔ جس سے اس کی تاکید ہو' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی سے زاید بار حلف اٹھانا ثابت ہے' اور تین مقامات پر تو اللہ تعالیٰ نے تصدیق کے لئے حلف اٹھانے کا حکم دیا۔ جیسا کہ سورہ یونس' سورہ سبأ اور سورہ تغابن میں مذکور ہے۔

۱۰۔ مشرکین' اہل بدعت' فسق و فجور میں مبتلا لوگ بھی اگر اللہ کی محرمات کی عظمت و احترام کا مطالبہ کریں تو اس سلسلہ میں ان سے تعاون کرنا چاہیے اور دوسروں کو ان سے روکنا چاہیے اور حرمات اللہ کی تعظیم میں تو ان کی مدد کرنا چاہیے' البتہ ان کے ذاتی فسق و فجور میں بالکل تعاون نہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیز پر مدد طلب کرنے والے شخص کی بہرحال مدد کی جائے' بشرطیکہ اس سے کوئی ناپسندیدہ چیز کا ظہور لازم نہ آئے۔

یہ مقام بہت نازک اور مشکل ہے' اس لئے بہت سے صحابہ کے دلوں میں تنگی پیدا ہوئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وجہ سے اس موقع پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور حضرت ابو بکر نے انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب دیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ تمام صحابہ میں افضل تھے' اللہ' رسول اور دین کے بارے میں ان کی واقفیت سب سے زیادہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت میں سب سے زیادہ سخت تھے۔ اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر کے علاوہ کسی اور صحابی سے دریافت نہیں کیا۔

۱۱۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کی جانب دائیں طرف مائل ہو کر نکلے تھے۔ اسی وجہ سے امام شافعی کا قول ہے کہ اس کا بعض حصہ حرم میں ہے اور بعض حصہ حل میں۔ اسی واقعہ کے ضمن میں امام احمد نے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں نماز پڑھتے تھے اور قیام حدود حرم سے باہر تھا۔ اس میں نہ بھی اشارہ ہے کہ اجر میں اضافہ کا وعدہ پورے حرم سے متعلق ہے۔ صرف مسجد سے نہیں اور آپ کے ارشاد گرامی «صَلاَةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ» کی حیثیت وہی ہے جو آیت کریمہ فَلَا يَقْرَبُوا۟ ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ اور سُبْحَـٰنَ ٱلَّذِىٓ أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِۦ لَيْلًا مِّنَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ میں ہے۔

۱۲۔ معلوم ہوا کہ جو مکہ کے قریب اترے اسے چاہیے کہ حل میں اترے اور حرم میں نماز ادا کرے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

۱۳۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر امام صلح کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

۱۴۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر مسلم قاصدوں کی آمد کے موقع پر فخر اور شان و شوکت اور امام کی توقیر و تعظیم کے لئے کسی کا بطور محافظ تلوار لے کر کھڑا ہونا مناسب و جائز ہے۔ یہ تکبر مذموم میں شمار

نہیں ہو گا' جیسا کہ حضرت مغیرہ اس موقع پر آپ کے سر کے پاس تلوار لے کر کھڑے تھے اور وہ آپ کے روزانہ کے معمول میں نہ تھا۔

۱۵۔ دوسرے یہ کہ قاصد کے سامنے اونٹوں کو بھیجنے سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ کفار کے قاصدوں کے سامنے اسلامی شعائر کا اظہار مستحب ہے۔ مغیرہ بن شعبہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ اسلام مجھے قبول ہے اور مال سے کوئی مطلب نہیں' اس بات کی دلیل ہے کہ معاہدہ والے مشرک کا مال محفوظ ہے۔ اس پر قبضہ نہیں کیا جائے گا' بلکہ واپس کر دیا جائے گا کیوں کہ مغیرہ امان کے بعد ان کی مصاحبت میں آیا تھا۔ پھر بے وفائی کر کے قبضہ کر لیا' لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مال سے کوئی تعرض نہ کیا' نہ مدافعت کی' نہ ضمانت دی' کیونکہ یہ واقعہ مغیرہ کے اسلام قبول کرنے سے پہلے پیش آیا۔

۱۶۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مصلحتہ شرمگاہ کا نام کھلے الفاظ میں لیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر نے عروہ بن مسعود کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ «اَمْصُصْ بَظْرَ اللاَّتِ وَالْعُزّٰى» لات وعزی کی شرمگاہ چوسو' اور جیسا کہ جاہلیت کے دور کے نعروں کو دہرانے والے شخص کے حق میں باپ کی شرمگاہ کی وضاحت کا حکم ہے۔

اس میں کسی طرح کا کنایہ نہیں کیا گیا ہے۔ کیوں کہ ہر مقام کے مناسب ایک بات ہوتی ہے۔

۱۷۔ قاصدین کی بے ادبی پر صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ جیسا کہ عروہ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی پکڑنے پر آپ کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

۱۸۔ نیز معلوم ہوا کہ مستعمل پانی' نخامہ و بلغم وغیرہ جیسے مواد پاک ہیں۔

۱۹۔ معلوم ہوا کہ نیک فال لینا مستحب ہے' کیوں کہ سہیل کی آمد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اب کام آسان ہو گیا"۔

۲۰۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مصلحت کی بنیاد پر مشرکین کا ساتھ دے کر صلح کرنا جائز ہے۔

۲۱۔ اگر کوئی شخص وقت کے تعین کے بغیر قسم کھائے یا نذر مانے یا کوئی وعدہ کرے تو اس کی تعمیل فوری ضروری نہیں بلکہ اسے مہلت رہے گی۔

۲۲۔ حلق کروانا قصر سے افضل ہے۔ عمرہ میں بھی حج کی طرح حلق یا تقصیر ہے۔ حج یا عمرہ میں زبردستی روکے گئے شخص کے لئے بھی حلق یا تقصیر کرنا ہے۔

۲۳۔ محصر اسی جگہ قربانی کرے جہاں اسے روکا گیا' چاہے حل ہو یا حرم' یہ ضروری نہیں کہ جانور کسی شخص کو دے تاکہ وہ حرم میں لے جا کر اس کی قربانی کرے اور یہ کہ ھدی کے اپنے پہنچنے سے پہلے وہ شخص حلال نہ ہو گا' کیوں کہ قرآن میں ارشاد گرامی ہے :

﴿ وَٱلْهَدْىَ مَعْكُوفًا أَن يَبْلُغَ مَحِلَّهُۥ ﴾ [الفتح : ٢٥]

اور قربانیوں کو قربان گاہ تک پہنچنے سے روکا کہ وہ اپنی جگہ پر کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

۲۴۔ جس جگہ ان لوگوں نے قربانی کی تھی وہ حل کا مقام تھا کیوں کہ حرم پورا کا پورا قربانی کی جگہ ہے۔ اگر جانور وہاں پہنچ جاتا تو آیت میں روکنے کا ذکر نہ ہوتا۔

۲۵۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ محصر پر قضا واجب نہیں ہے۔ اس صلح کے بعد والے عمرہ کو عمرۃ القضاء اس لئے کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دوبارہ کرنے پر معاہدہ کیا تھا۔

۲۶۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حکم عام کی تعمیل فوری ضروری ہے ورنہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے فوراً عمل نہ کرنے پر ناراض نہ ہوتے۔ صحابہ کا یہ توقف و تردد سعی مغفور تھی' نہ کہ سعی مشکور۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی کوتاہیوں کو معاف کر دیا تھا اور جنت کا حقدار کر دیا تھا۔

۲۷۔ کفار سے اس شرط پر معاہدہ جائز ہے کہ اگر مسلمان مردوں میں سے کوئی آئے تو اسے واپس کر دیا جائے۔ اگر عورتیں آئیں تو انہیں نہ لوٹایا جائے کیونکہ ان کا لوٹانا جائز نہیں۔ اس معاہدہ کا یہی جزء قرآن کی نص سے منسوخ ہے۔ دوسرے اجزاء کی منسوخی کا دعویٰ صحیح نہیں۔

۲۸۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی عورت مسلمان ہو کر شوہر کے نکاح سے بھاگ آئے تو ایسی صورت میں متفقہ و متعینہ قیمت ادا کی جائے اور مہر مثل کا اعتبار نہ ہو گا۔

۲۹۔ کفار کے پاس حسب معاہدہ امام کے پاس آنے والے کسی شخص کو لوٹانے میں وہ شخص داخل نہ ہو گا جو اسلام کی حالت میں امام کے علاوہ کسی اور علاقہ میں چلا جائے۔ ایسا شخص اگر امام کے علاقہ میں آئے گا تو بغیر طلب اس کا لوٹانا ضروری نہیں۔

۳۰۔ اگر کسی نے بھاگ کر آنے والے مسلمان کو حوالہ کر دیا اور پھر وہ راستہ میں ان لوگوں کو قتل کر دے' تو اس پر دیت یا قصاص واجب نہ ہو گا اور نہ امام اس کا ذمہ دار ہو گا۔

۳۱۔ اگر کسی مسلمان بادشاہ اور کافروں کے درمیان کوئی معاہدہ ہوا ہو تو کسی دوسرے علاقہ کا حاکم ان پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ شیخ اسلام ابن تیمیہ نے ایسا ہی فتویٰ دیا ہے۔ انہوں نے مشرکین کے ساتھ ابو

بصیر کے معاملہ کی مثال بطور دلیل پیش کی ہے۔

واقعہ صلح حدیبیہ میں بعض مخفی حکمتیں :

اس واقعہ میں جو بے شمار حکمتیں پنہاں ہیں' انھیں سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی شمار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہاں بعض حکمتوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ یہ معاہدہ عظیم الشان فتح کا پیش خیمہ تھا' اور اللہ تعالیٰ کی یہ سنت طیبہ ہے کہ جو بھی عظیم المرتبت و جلیل القدر کام کرتا ہے تو اس کے لئے پہلے مقدمات اور تمہید قائم فرماتا ہے جو اس کا سبب بنتی ہیں اور اس کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

۲۔ یہ معاہدہ سب سے بڑی فتح تھی کیونکہ لوگوں نے ایک دوسرے کو امان دے دی' اور مسلمان اور کفار آپس میں آزادانہ ملنے لگے۔ انہیں اسلام و قرآن کی دعوت دینے لگے' اور اسلام کے متعلق علانیہ مناظرے شروع ہو گئے۔ مخفی طور پر جو مسلمان تھا' وہ بھی ظاہر ہو گیا اور اس مدت میں جس نے چاہا' وہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ اس طرح وہ شرائط جنہیں کفار نے اپنے فائدہ کے لئے معاہدہ میں شامل کیا تھا' مسلمانوں کے حق میں مفید ہو گئیں۔ کفار عزت کی سوچ رہے تھے لیکن انہیں ذلت نصیب ہوئی اور مسلمانوں نے اللہ کے سامنے عاجزی کی تو انہیں عزت حاصل ہوئی۔ اس طرح باطل کے سہارے حاصل ہونے والی عزت حق کی وجہ سے ذلت بن گئی۔

۳۔ اس معاہدہ کو اللہ تعالیٰ نے ایمان و یقین میں اضافہ کا سبب قرار دیا۔ قضا و قدر الٰہی پر رضا وعدوں کی تصدیق اس کے وعدوں کا انتظار' پھر سکینہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا مشاہدہ جس کے ذریعہ دلوں کو اطمینان نصیب ہوا اور انہیں قوت حاصل ہوئی' جس کی انہیں سخت ضرورت تھی' کیونکہ حالات ایسے سنگین تھے کہ پہاڑ بھی ڈگمگا جاتا۔

۴۔ اس صلح نامہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے تمام گذشتہ و آئندہ گناہوں کی بخشش کا سبب بنایا اور ان پر اپنی نعمت کے اتمام اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت اور غالب نصرت کا سبب قرار دیا۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے دلوں کو اضطراب و پریشانی کے موقع پر سکون و اطمینان سے متصف فرمایا' پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی بیعت کا ذکر فرمایا اور اسے اس طرح موکد کیا کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ کی ہی بیعت ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک ان کے ہاتھوں پر تھا تو گویا کہ

ان پر اللہ تعالیٰ کا دست مبارک تھا۔

پھر خبر دی کہ اس عہد کو توڑنے والے کی اس حرکت کا زوال خود اس پر آکر رہے گا' اور ان اعراب کا ذکر فرمایا جنھوں نے عہد شکنی کی اور اللہ کے ساتھ بدظنی کا ثبوت دیا۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی وجہ سے مومنوں سے راضی ہوا اور اس وقت ان کے قلوب جس صدق و وفا سے پر تھے' خدا ہی خوب جانتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر سکینہ طمانیت' اور رضا نازل فرمائی' اور ان کو فتح و نصرت سے ہمکنار کیا اور کثیر مال غنیمت سے نوازا۔

سب سے پہلی فتح اور غنیمت خیبر میں حاصل ہوئی تھی پھر فتوحات و غنائم کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے کھل گیا۔

مسلمانوں سے مخالفین کے ہاتھوں کو روکنے کا جو ذکر ہے' اس کی تفسیر میں بعض لوگوں کا قول ہے کہ اہل مکہ کے شر سے محفوظ کرنا مراد ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہودیوں کی طرف اشارہ ہے جو صحابہ کے مدینہ سے نکلنے کے بعد وہاں پر موجود مسلمانوں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ بعض حضرات کا قول ہے کہ خیبر کے لوگ اور قبیلہ اسد و غطفان کے حلیف لوگ مراد ہیں۔ لیکن صحیح و راجح قول یہ ہے کہ آیت ان تمام دشمنان اسلام کے حق میں عام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے :

﴿ وَلِتَكُونَ ءَايَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴾ [الفتح : ٢٠]

اور تاکہ مومنوں کے لئے نشانی بن جائے۔

نشانی بننے والی چیز کو بعض نے ہاتھوں کے روکنے کو اور بعض نے فتح خیبر کو قرار دیا ہے۔ اس نعمت کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نعمت ہدایت سے بھی نوازا اور ان سے ایسی فتوحات و غنائم کا وعدہ فرمایا جن کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی تفسیر فتح مکہ' روم' فارس اور خیبر کے بعد مشرق و مغرب کی دیگر فتوحات سے کی گئی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر کفار اولیاء اللہ سے جنگ کریں تو انہیں نصرت نہ ملے گی اور پیٹھ پھیر کر فرار ہو جائیں گے' اور اس کے بندوں میں یہ اللہ تعالیٰ کی سنت قدیمہ چلی آ رہی ہے اور اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں آیا کرتی۔

اگر یہاں یہ سوال کیا جائے کہ ایسی صورت حال غزوہ احد میں کیوں پیش نہیں آئی' تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ صبر و تقوی کی شرط سے مشروط ہے' اور احد کے دن چونکہ مسلمانوں نے صبر

کا دامن چھوڑ دیا تھا اور سستی اور بزدلی کا مظاہرہ کیا اور تقوی کے بجائے مخالفت و نافرمانی میں ملوث ہو گئے' اس لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا نہ ہوا۔

پھر مذکورہ مردوں اور عورتوں کی وجہ سے ہاتھوں کو روکنے کا ذکر کیا اور ان سے عذاب کو اس طرح دور کیا جس طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کے وقت آپ کے سبب عذاب کو ہٹایا تھا۔

پھر کفار کے دلوں کی حمیت کا ذکر فرمایا جس کا مرجع ان کی جہالت اور ظلم و زیادتی ہے' اور اس حمیت جاہلیہ کے مقابلہ میں اپنے اولیاء کے دلوں میں جو اطمینان و سکینت نازل فرمائی ہے' اس کا ذکر فرمایا۔ اور کلمہ تقوی کو اس لئے ضروری قرار دیا ہے کہ اس سے عام طور پر وہ تمام باتیں مراد ہیں' جن سے اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا ہو اور سب سے اعلیٰ و افضل کلمہ اخلاص ہے۔

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر مبعوث فرمایا تاکہ اسے باقی تمام ادیان پر غالب کر دے۔ پس جب دین اسلام کے اتمام کا اور تمام ادیان پر غلبہ عطاً کرنے کا کفیل خود اللہ تعالیٰ ہو گیا تو اس میں مسلمانوں کے قلوب کو قوت و فرحت حاصل ہوئی اور اس عہد پر انہیں یقین حاصل ہوا کہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ حدیبیہ کے روز جو چشم پوشی واقع ہوئی وہ دشمن کی مدد و نصرت اور اپنے رسول و دین سے اعراض تھا' اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور وعدہ کیا کہ اس دین کو باقی تمام ادیان پر غالب کر دے گا اس کے بعد اللہ نے اپنے رسول کا اور ان کی پاکباز جماعت کا ذکر کیا اور ان کی بہترین تعریف فرمائی۔ جب کہ فرقہ روافض اس کے برعکس بات کہتے ہیں۔

فصل (۷۵)

غزوہ خیبر

موسیٰ بن عقبہ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے لوٹ کر مدینہ تشریف لائے تو تقریباً بیس دن ٹھہرے' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی طرف نکلے اور اللہ تعالیٰ نے حدیبیہ ہی میں اس کا وعدہ فرما دیا تھا۔

مدینہ پر حضرت سباع بن عرفطہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔ اس وقت حضرت ابو ہریرہ پہلی مرتبہ مدینہ پہنچے اور صبح کی نماز میں حضرت سباع ابن عرفطہ سے پہلی رکعت میں ﴿ كٓهيعٓصٓ ﴾ اور دوسری رکعت میں ﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ﴾ سنی۔ نماز ہی میں کہنے لگے کہ : "فلاں شخص کا ناس ہو' اس کے پاس دو پیمانے ہیں' جب کوئی چیز ناپ کر دیتا ہے تو چھوٹے پیمانے سے اور جب لیتا ہے تو بڑے پیمانے سے لیتا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے حضرت سباع سے ملاقات کی۔ غزوہ سے واپسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو مال غنیمت میں شریک فرمایا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پہنچ کر صبح کی نماز ادا فرمائی۔ اس کے بعد مسلمان سوار ہوئے تو اہل خیبر اپنے کھیتوں اور کام کاج کی جگہوں کی طرف نکلے اور انہیں مسلمانوں کی آمد کا علم تک نہ تھا بلکہ وہ اپنے کھیتوں کی طرف نکلے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اللہ اکبر خیبر برباد ہو گیا' اللہ اکبر خیبر برباد ہو گیا' جب ہم ایک قوم کے علاقہ میں اترے تو ڈرائے جانے والوں کی صبح بری ہوئی۔

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا عطا فرمایا جس کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے' پھر مصنف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے کا حال اور عامر بن الاکوع کا واقعہ نقل کیا ہے۔

چنانچہ اس محاصرہ کے بعد بالآخر خیبر کے یہودی پست ہو گئے اور انہیں اس بات پر صلح کرنی پڑی کہ جلاوطن ہو جائیں اور ہتھیاروں کے علاوہ جتنا مال و متاع اپنی بار برداریوں پر لے جا سکتے ہیں' لے جائیں لیکن جب جلاوطنی کا وقت آیا تو عرض کرنے لگے آپ ہمیں رہنے دیں ہم اس زمین سے خوب واقف ہیں

اور وعدہ کرتے ہیں کہ اس کی اصلاح و درستگی اور حفاظت کرتے رہیں گے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے پاس اس وقت کھیتی باڑی کے لئے آدمی نہ تھے' آپ نے یہودیوں کی درخواست منظور کرلی اور جلاوطنی عارضی طور پر ملتوی کر کے آدھی بٹائی پر انہیں زمینیں دے دیں۔

معاہدہ میں کوئی میعاد مقرر نہ تھی بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی پر موقوف تھا جب تک چاہیں انہیں رکھیں۔ اور معاہدہ میں یہ بھی شرط رکھی کہ سونا اور چاندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوگا اور وہ اس کو چھپائیں گے نہیں اور نہ کوئی چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اوجھل کریں گے۔ اگر انہوں نے ایسی حرکت کی تو پھر نہ ذمہ ہے اور نہ عہد ہوگا۔ لیکن انہوں نے ایک مشک جس میں مال اور حی ابن اخطب کے زیورات تھے' چھپالی۔ وہ اسے بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت خیبر کی طرف اٹھا لے گئے۔ اس کے بعد مصنف نے پورا قصہ ذکر کیا ہے۔ صلح کے بعد آپ نے ابن ابی الحقیق کے علاوہ کسی کو قتل نہیں کرایا۔

اسی غزوہ میں صفیہ بنت حی بن اخطب قید ہو کر آئیں اور وہ ابن ابی الحقیق کی زوجیت میں تھیں اور اسلام لے آئیں تھیں۔ آپ نے انہیں اپنے لئے منتخب کر لیا اور آزاد کر کے زوجیت میں لے آئے۔ نقد مہر ادا نہیں کیا بلکہ آزادی کو مہر قرار دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی پیداوار چھتیس سہم میں تقسیم فرما دی۔ ہر سہم ایک سو سہم کا تھا گویا کہ کل چھتیس سو سہم بن گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم اور مسلمانوں کے لئے نصف یعنی اٹھارہ سو سہم تھے۔ باقی نصف یعنی اٹھارہ سو سہم اس کے محافظین اور وہاں پر مسلمانوں کے امور کے لئے چھوڑ دیئے گئے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ خیبر کا ایک حصہ حملے سے اور ایک حصہ صلح سے فتح ہوا۔ چنانچہ جو حصہ لڑائی سے فتح ہوا اسے اہل خمس اور غانمین میں تقسیم کر دیا گیا اور جو حصہ صلح سے فتح ہوا اسے منتظمین اور مسلمانوں کے امور اور مصالح عامہ کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

امام بیہقی کی یہ وضاحت امام شافعی کے مذہب کے اس قاعدہ پر مبنی ہے کہ جنگ کے ذریعہ فتح کی جانے والی تمام زمینوں کو تقسیم کرنا واجب ہے' لیکن جو سیر و مغازی کا مطالعہ کرے گا' اس پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ خیبر قوت سے فتح ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بزور قوت اس علاقہ پر قابض ہوئے۔ اگر مصالحت سے فتح ہوا ہوتا تو آپ جلاوطن نہ کرتے۔ البتہ امام کو اختیار ہے کہ

چاہے تو زمین تقسیم کرے یا روک رکھے۔ اگر چاہے تو کچھ تقسیم کرے کچھ روک رکھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تینوں طرح کے افعال ثابت ہیں' چنانچہ آپ نے بنو قریظہ و بنو نضیر کی زمین کو تقسیم کر دیا تھا' مکہ کو تقسیم نہیں کیا' اور خیبر کے ایک حصہ کو تقسیم کر دیا اور ایک حصہ کو باقی رکھا۔

اہل حدیبیہ میں سے سوائے حضرت جابر بن عبداللہ کے کوئی خیبر سے غیر حاضر نہ تھا۔ آپ نے ان کے لئے حصہ لگایا۔ اسی غزوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آپ کے چچا زاد بھائی جعفر بن ابی طالب اور ان کے ساتھی بھی آئے۔ ان کے ہمراہ ابو موسی اشعری اور ان کے رفقاء اشعری قبیلہ کے لوگ تھے۔

اسی جنگ میں ایک یہودی عورت زینب بنت الحارث نے زھر ملا کر بھنی ہوئی بکری تحفہ میں پیش کی جسے آپ نے اور بعض صحابہ نے تناول کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اسے کوئی سزا نہیں دی اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے اس عورت کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ کھانے والوں میں بشر بن البراء کا انتقال ہو گیا تو آپ نے اس عورت کو قتل کروا دیا۔

جب قریش کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیبر پر حملہ کی خبر ملی تو انہوں نے آپس میں شرط لگائی۔ بعض کہتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ غالب ہوں گے' اور بعض لوگ کہتے تھے کہ دونوں حلیف اور خیبر کے یہودی غالب ہوں گے۔ مصنف نے یہاں حجاج بن علاط جو مسلمان ہو گئے تھے' اور فتح خیبر میں شریک تھے ان کا واقعہ ذکر کیا ہے۔

غزوہ خیبر سے مستنبط احکام و مسائل :

اس غزوہ سے مندرجہ ذیل فقہی احکام و مسائل ثابت ہوئے۔

۱۔ حرمت والے مہینوں میں کفار سے قتل و قتال جائز ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محرم میں خیبر کی جانب روانہ ہوئے تھے۔

۲۔ مال غنیمت تقسیم کرنے میں سوار کو تین حصے اور پیدل کے لئے ایک حصہ دینا چاہئے۔

۳۔ ایک فوجی کے لئے جائز ہے کہ اگر اسے کھانے کی کوئی چیز ملے تو اسے استعمال کرے اور اس میں سے خمس ادا نہ کرے' جس طرح حضرت عبداللہ بن مغفل کو چربی کی ایک بوری ملی تو انہوں نے نبی اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اسے اپنے لئے مخصوص کر لیا۔

۴۔ اگر جنگ کے خاتمہ پر کچھ لوگ میدان میں آئیں تو انہیں حصہ نہیں ملے گا جب تک تمام لشکر اجازت نہ دے دے' کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے اہل سفینہ کے متعلق مشورہ فرمایا تھا۔

۵۔ پالتو گدھوں کا گوشت حرام ہے کیونکہ وہ گندہ ہوتا ہے۔ یہ قول ان صحابہ کے قول پر مقدم سمجھا جائے گا' جنھوں نے یہ علت بتائی ہے کہ یہ سواری و باربرداری کا جانور ہے اور اس قول پر مقدم ہے کہ اس کا خمس نہیں نکالا جائے گا اور اس پر بھی مقدم ہے کہ یہ گندگی کھاتا ہے۔

۶۔ امام کے لئے صلح کا معاملہ کرنا جائز ہے اور یہ کہ جب چاہے اسے فسخ کر دے۔ صلح اور امان کے معاملہ کو شرائط پر معلق کرنا اور متہم لوگوں کو سزا کے بعد ثابت رکھنا' یہ حکم شرعی عدالت ہے نہ کہ ظالمانہ سیاست۔

۷۔ قرائن کا لحاظ کرنا جائز ہے' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''کہ مال زیادہ تھا اور مدت تھوڑی'' اور یہ کہ جس شخص کا جھوٹ ثابت ہو جائے' اس کے قول کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی۔

۸۔ اگر اہل ذمہ اپنے آپ پر عائد شدہ شرائط میں سے کسی کی مخالفت کر دیں تو ان کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے' نیز یہ کہ جس نے تقسیم سے قبل غنائم میں سے کچھ لے لیا وہ اس کا مالک نہ ہو گا' اگرچہ وہ چیز اس کے حق سے بھی کم ہو' جیسا کہ آپ نے ایک تسمہ لینے کے متعلق فرمایا ''آگ کا ایک تسمہ''۔

۹۔ نیک فال لینا جائز ہے بلکہ مستحب ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں کے ساتھ کدال کلہاڑی اور ٹوکری دیکھ کر یہ فال لیا کہ خیبر ویران ہو جائے گا۔

۱۰۔ معاہدہ کو توڑنے والے اگر با اختیار افراد ہوں تو عورتوں اور بچوں کے حق میں بھی معاہدہ ٹوٹ جائے گا' اور اگر کسی جماعت کا ایک فرد بقیہ افراد کی موافقت کے بغیر عہد توڑ دے تو عورتوں اور بچوں کے حق میں عہد نہیں ٹوٹے گا' جیسا کہ قیدیوں میں سے اگر کسی کا خون آپ مباح قرار دیں تو یہ حکم اس کی عورتوں اور بچوں کو شامل نہ ہو گا۔

۱۱۔ اپنی لونڈی کو آزاد کرنا پھر آزاد کرنے کے بعد اس سے نکاح کرنا اور آزادی کو حق مہر مقرر کرنا جائز ہے اور لونڈی کے اذن اور گواہوں اور ولی کے بغیر اسے زوجہ بنا لینا جائز ہے' جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ کے معاملہ میں کیا تھا۔

۱۲- آدمی کا اپنے یا دوسرے کے بارے میں جھوٹ بولنا جائز ہے' بشرطیکہ دوسرے کو اس سے کچھ نقصان نہ ہو اور اس آدمی کا حق اسے مل جائے۔ جس طرح حجاج نے کیا تھا اسی طرح کافر کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔

۱۳- جو آدمی کسی کو زہر دے کر قتل کر دے تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا جیسا کہ ایک یہودیہ کو حضرت بشر بن براء کے قتل کے عوض قتل کیا گیا۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر سے نکل کر وادی قری تشریف لے گئے۔ وہاں یہودیوں کی ایک جماعت رہتی تھی۔ وہاں جب یہ لوگ پہنچے تو انہوں نے تیر مارنے شروع کر دیئے' اس حملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام مدعم قتل ہو گیا تو لوگوں نے کہا کہ جنت اسے مبارک ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا' ہرگز نہیں' قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو چادر اس نے خیبر کے روز تقسیم سے قبل لی تھی وہ اس پر آگ بن کر شعلہ زن ہو گی۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ ان کی صف بندی فرمائی اور یہودیوں کو اسلام کی دعوت دی۔ اس کے بعد ایک آدمی نکلا اس کے مقابلے میں حضرت زبیر بن عوام نکلے اور انہوں نے اس کو قتل کر دیا پھر ایک اور نکلا اسے بھی قتل کر دیا' پھر ایک اور شخص سامنے آیا جس کے مقابلے میں حضرت علی نکلے اور اس کا کام تمام کر دیا۔

اس طرح کفار کے گیارہ آدمی یکے بعد دیگرے قتل ہو گئے۔ جونہی ایک قتل ہو جاتا' دوسروں کو دعوت اسلام دی جاتی' جب نماز کا وقت آجاتا تو آپ صحابہ کے ساتھ نماز ادا فرماتے پھر واپس آکر انہیں اسلام کی دعوت دیتے اس کے بعد مقابلہ فرماتے۔ آخر شام ہو گئی۔ اور جب صبح ہوئی اور ابھی سورج ایک نیزہ بھی اونچا نہ ہوا تھا کہ آپ نے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا' اور مقام کو بزور شمشیر فتح فرمالیا اور باشندوں کے ساتھ اہل خیبر کا سا سلوک و معاملہ کیا۔

یہی حشر اہل فدک کا بھی ہوا۔ تیماء کے یہودیوں کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو خائف ہو گئے اور صلح کی درخواست بھیجی' جو منظور ہوئی اور اہل خیبر کی شرطوں پر ان سے بھی معاملہ کر لیا اور وہ اپنے مال و جائیداد کے ساتھ وہیں مقیم رہے۔

یہ لوگ حضرت عمر کے دور خلافت میں بھی وہاں سے نہیں نکالے گئے' کیوں کہ تیماء اور وادی قری کے علاقے بلاد شام میں مانے جاتے تھے اور اس سے نچلا علاقہ مدینہ تک حجاز میں داخل ہے۔ اس کے بعد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔ واپسی پر ایک شب ایک جگہ اترے اور حضرت بلال سے فرمایا کہ "ہمارے لئے فجر کی نماز کا خیال رکھنا" پھر مصنف نے بقیہ حدیث ذکر کی۔ ایک روایت میں ہے کہ حدیبیہ سے واپسی کی بات ہے اور لوگوں کا قول ہے کہ تبوک سے واپسی پر آپ نے یہ فرمایا تھا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جو نماز کے وقت سو جائے یا بھول جائے تو اس کے لئے نماز کا وقت اس گھڑی میں ہے جب وہ بیدار ہو یا اسے یاد آجائے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ سنن راتبہ کی فرائض کی طرح قضاء کرنی ہوگی اور قضاء نماز کی ادائیگی کے وقت اذان و اقامت بھی ہوگی اور قضاء نماز کو باجماعت ادا کر سکتا ہے اور اس کو فوراً ادا کرنا چاہئے' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اسے چاہئے کہ جب یاد آئے اسے ادا کرے" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکان نزول سے کچھ دور جا کر ادا کی کیونکہ وہ شیطان کی جگہ تھی اور اس سے بہتر جگہ پر تشریف لے گئے۔ اس کی وجہ سے جو تاخیر ہوئی اس کا کوئی لحاظ نہیں کیونکہ یہ بھی نماز کے لئے ہی تھی۔ اس میں یہ بھی تنبیہ ہے کہ شیطان کی جگہوں پر نماز سے اجتناب کیا جائے گا جیسے حمام وغیرہ۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس آئے' مہاجرین کو خیبر کے مال سے حصہ ملا تو انہوں نے انصار کو ان کے عطیات واپس کردئے جو انہوں نے ان صحابہ کو دے رکھے تھے۔

خیبر سے واپسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شوال تک مدینہ میں رہے اور اس زمانہ میں آپ نے چھوٹے چھوٹے دستے روانہ فرمائے۔ ان میں سے ایک دستہ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کا تھا جنہوں نے اپنے ساتھیوں کو آگ میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا۔ جب آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ "اگر وہ لوگ اس میں داخل ہو جاتے تو اس سے کبھی نہ نکلتے۔ اطاعت امیر صرف معروف میں ہے"۔ اگر یہ کہا جائے کہ اگر وہ آگ میں داخل ہو جاتے تو وہ اپنے خیال میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہوئے داخل ہوتے۔ گویا از روئے تاویل وہ خطاوار سمجھے جاتے۔ اس لئے جنہم میں وہ دائمی طور پر کیسے رہ سکتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ آگ میں اپنے آپ کو ڈالنا معصیت ہے' اس لئے خودکشی کرنے کی پاداش میں وہ ہمیشہ اس میں رہتے' کیونکہ خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی اطاعت جائز نہیں اور اطاعت امیر سے آگ میں داخل ہونا اللہ اور اس کے رسول کی معصیت ہوگی۔ اس طرح یہ اطاعت ہی سزا کا مستوجب ہو جاتی' کیونکہ یہ حرکت خود ہی معصیت کی حیثیت رکھتی ہے' اور اگر داخل ہو جاتے تو

گویا اللہ اور اس کے رسول کے نافرمان ہوتے۔ اس آدمی کے متعلق جو خودکشی کرے ایسا حکم ہے تو جو آدمی دوسرے مسلمان کو امیر کے حکم سے ناجائز ایذا دے تو اس کی کیا حالت ہوگی۔

اور ایسے بازی گروں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو آگ میں کود جاتے ہیں اور جہلاء سمجھتے ہیں کہ یہ حضرت ابراہیم کی میراث ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح حضرت ابراہیم پر آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی بن گئی تھی۔ اسی طرح ان پر بردا و سلاما بن جائے گی اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ حال رحمانی میں آگ کے اندر کودے ہیں' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ حال شیطانی میں داخل ہوئے' کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ بازی گر ایک خاص قسم کا لباس استعمال کرتے ہیں اور لوگوں پر ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اولیاء الرحمٰن میں سے ہیں حالانکہ وہ اولیاء شیطان میں سے ہیں۔

فصل (٧٦)

فتح مکہ کا عظیم واقعہ

فتح مکہ تاریخ اسلام کا وہ عظیم واقعہ ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین' اور اپنے رسول' لشکر اسلام اور حرم امین کو عزت بخشی جس سے آسمان والے مسرت سے جھوم اٹھے اور جس کی شہرت و سربلندی' ثریا و کہکشاں سے زیادہ بلند و تابناک ثابت ہوئیں اور لوگ گروہ در گروہ دین اسلام میں داخل ہونے لگے۔

واقعہ یوں پیش آیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰ رمضان المبارک سنہ ۸ ہجری کو مکہ کی طرف دس ہزار مجاہدین کا لشکر لے کر روانہ ہوئے' کیونکہ قریش مکہ نے صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے معاہدہ خود ہی توڑ دیا تھا۔

جب اسلامی فوج مرالظہران نامی مقام پر پہنچی تو آپ نے رات کے وقت آگ جلانے کا حکم دیا جس سے قرب و جوار کے تمام علاقے روشن ہو گئے۔ قریش کو اب تک خبر نہ تھی۔ انہیں ڈر تو تھا مگر یہ وہم و گمان بھی نہ گذرا تھا کہ مسلمان اس تیزی سے سر پر آپہنچیں گے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدین کے ساتھ بالائی مکہ سے شہر میں داخل ہوئے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس فرمان کے ساتھ مکہ کے نشیبی مقام کی طرف سے بھیجا کہ اگر کوئی مزاحمت ہو تو اسے بے تکلف دفع کر دیں' جس میں دو مسلمان شہید ہوئے اور بارہ مشرک قتل کئے گئے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے داخلے کے بعد خانہ کعبہ کا رخ فرمایا۔ مہاجرین و انصار آپ کے ارد گرد چل رہے تھے' یہاں تک کہ وہ مسجد حرام میں داخل ہوگئے اور طواف بیت اللہ فرمایا۔ آپ کے ہاتھ میں کمان تھی جس سے تین سو ساٹھ بتوں میں سے ایک ایک کو مار کر زمین پر گراتے اور فرماتے :

﴿ جَآءَ ٱلۡحَقُّ وَزَهَقَ ٱلۡبَٰطِلُۚ إِنَّ ٱلۡبَٰطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ [الإسراء: ٨١]

حق آگیا اور باطل نکل بھاگا۔ باطل ہی ہمیشہ شکست اٹھانے والا ہے۔

پھر کعبہ کے اندر جا کر نماز پڑھی۔ لوٹ کر باہر آئے۔ قریش صف بستہ کھڑے تھے۔ آپ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا اے قریش! تمہارے خیال میں تم سے کیا سلوک کروں گا۔ سب پکار اٹھے' اچھا سلوک۔ فرمایا : "میں اس وقت تم سے وہی کہوں گا جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔ آج تم پر کچھ بھی الزام و ملامت نہیں' جاؤ تم سب آزاد ہو"۔

فتح مکہ سے مستنبط احکام و مسائل :

۱۔ اس غزوہ سے یہ معلوم ہوا کہ اہل عہد اگر ان لوگوں سے جنگ کریں گے جن سے امام المسلمین کا معاہدہ ہے تو اس کی وجہ سے خود وہ امام المسلمین سے جنگ کرنے والے تصور کئے جائیں گے۔

چنانچہ امام کو حق ہے کہ ان پر چڑھائی کرے اور ان کو اس کی اطلاع کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں جب ان سے خیانت کا خطرہ ہو تو پھر پیشگی اطلاع دینی ضروری ہوگی اور خیانت پائی جائے تو انہیں عہد شکن سمجھا جائے گا اور یہ کہ اگر خیانت پر تمام افراد راضی ہوں تو سب کے حق میں معاہدہ ٹوٹ جائے گا جس طرح سب کے حق میں منعقد ہوا تھا۔

۲۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل عرب کے ساتھ دس سالہ جنگ بندی کا معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ مدت کے لئے جائز ہے یا نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ مصلحت و ضرورت کے پیش نظر جائز ہے۔

۳۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب امام سے ناجائز یا غیر واجب باتوں کے متعلق سوال کیا جائے اور وہ خاموش رہے تو اس کی خاموش رضامندی نہیں بن سکتی۔ جیسے ابوسفیان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تجدید عہد کی درخواست کی۔ آپ خاموشی رہے تو آپ کی اس خاموشی سے تجدید عہد کا مطلب نہیں لیا جا سکتا۔

۴۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کفار کے قاصدوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا حالانکہ ابوسفیان پر عہد شکنی کے باعث حد ثابت ہو چکی تھی' لیکن چونکہ وہ اپنی قوم کی جانب سے قاصد بن کر آئے تھے' اس لئے انہیں قتل نہیں کیا گیا۔

۵۔ مسلمان جاسوس کو قتل کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ عورت کو بوقت ضرورت و مصلحت عامہ کی خاطر برہنہ کرنے کی دھمکی دی جا سکتی ہے' جیسا کہ حضرت

علی نے جاسوس عورت کے ساتھ کیا تھا۔

۷۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو اپنی خواہش کے بغیر اللہ کے لئے غصہ اور دینی حمیت کی وجہ سے بطور تاویل کافر یا منافق کہہ دے تو وہ گنہگار نہ ہوگا۔

۸۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ کبھی کبھی بڑی نیکیوں سے مٹ جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ إِنَّ ٱلْحَسَنَـٰتِ يُذْهِبْنَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ ۚ﴾ [هود: ١١٤]

نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

اور اس کے برعکس بھی ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے :

﴿ لَا تُبْطِلُوا۟ صَدَقَـٰتِكُم بِٱلْمَنِّ وَٱلْأَذَىٰ﴾ [البقرة: ٢٦٤]

اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع نہ کرو۔

ایک اور جگہ مزید فرمایا :

﴿ أَن تَحْبَطَ أَعْمَـٰلُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ [الحجرات: ٢]

ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال اکارت ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو۔

پھر مصنف نے حاطب بن بلتعہ اور ذوالخویصرہ کے واقعات کو ذکر کر کے فرمایا : کہ اہل عقل و خرد اس مسئلہ کی حیثیت اور اس کی ضرورت کو جانتے ہیں' اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی معرفت و حکمت کے ایک عظیم باب سے واقف ہوتے ہیں۔

۹۔ نیز اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ میں بغیر احرام کے قتال مباح کے لئے داخل ہونا جائز ہے' لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو حج یا عمرہ کے ارادہ سے داخل ہو' اسے احرام باندھنا ضروری ہے۔ ان کے علاوہ دوسری صورتوں میں وہی واجب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے واجب کیا ہے۔

۱۰۔ نیز اس میں صاف واضح بیان ہے کہ مکہ مکرمہ قوت و طاقت سے فتح ہوا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنان اسلام کو قتل کرا دیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز فرمایا تھا : "مکہ کو اللہ تعالیٰ نے باحرمت بنایا ہے۔ صرف لوگوں ہی نے محترم نہیں بنا رکھا ہے"۔ اس لئے اس کی حرمت شرعی قدیم ہے۔ اس عالم کی پیدائش سے قبل اس کی حرمت ہو چکی تھی۔ اس کے بعد اللہ کے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

زبان مبارک سے اس کا اظہار ہوا تھا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ : "اس میں خون بہانا جائز نہیں" یعنی خونریزی کی یہ حرمت حرم کے ساتھ خاص ہے اور دوسری جگہ جائز ہے جبکہ اس کا شرعی تقاضا موجود ہو جس طرح کہ حرم کے درختوں کو کاٹنا حرام ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ "اس کے درخت کاٹے نہیں جائیں گے"۔ ایک روایت میں ہے کہ "کانٹے نہ توڑے جائیں گے"۔

اس سے صاف طور پر کانٹوں اور عوسج کو کاٹنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے لیکن علماء نے خشک پودے کاٹنے کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ وہ مردہ کے مشابہ ہے۔ ایک روایت میں "لا یخبط شوکھا" کے الفاظ آئے ہیں جن سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پتے کا توڑنا حرام ہے۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "حرم کی گھاس بھی نہ کاٹی جائے گی" اس میں کوئی اختلاف نہیں اور اس سے مراد وہی پودے ہیں جو خودرو ہوں "خلا" تر گھاس کو کہتے ہیں اور "اذخر" اس نص سے مستثنیٰ ہے اور اس کا استثناء اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حکم اذخر کے علاوہ باقی سب پر مشتمل ہے لیکن اس میں کماۃ اور زمین میں چھپی ہوئی چیز داخل نہیں ہے' کیونکہ یہ پھل کے حکم میں ہے۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ "حرم کے شکار کو وہاں سے بھگایا نہ جائے" یہ اس بات کی صراحت ہے کہ شکار کا قتل اور اس کی گرفتاری کا کسی طریقہ سے بھی سبب بننا حرام ہے' حتیٰ کہ اسے اپنی جگہ سے بھگانا بھی نہیں چاہئے کیوں کہ اس جگہ وہ ایک محترم حیوان ہے' اور سبقت کر کے ایک جگہ حاصل کر چکا ہے' اس لئے وہ اس جگہ کا زیادہ مستحق ہے۔ حاصل یہ کہ حرم کا جانور اگر کسی جگہ سبقت کر کے پہنچ جائے تو اسے وہاں سے پریشان کر کے بھگایا نہ جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ "حرم میں گری ہوئی چیز کو جاننے والے کے سوا کوئی نہ اٹھائے"۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ "اس کی پڑی ہوئی چیز کو اٹھانا تعارف والے کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں" اس بات کی دلیل ہے کہ حرم کا لقطہ (گری ہوئی چیز) کسی حال میں کسی کی ملکیت نہیں اور اسے صرف اس کے مالک کو یا جاننے والے ہی کو اٹھانا چاہئے نہ کہ مالک بننے کے لئے ورنہ حرم سے تخصیص کا کچھ بھی فائدہ نہ رہے گا۔ یہ امام احمد سے منقول ایک روایت ہے۔ دوسری روایت میں ان کا اور امام شافعی کا بھی یہ قول ہے کہ ملکیت کے خیال سے اس کا اٹھانا جائز نہیں البتہ اگر مالک کے لئے اس کو محفوظ کرنے کا ارادہ ہو تو جائز ہے۔ اگر اسے کوئی اٹھالے تو مالک کے آنے تک برابر مشتہر کرتے رہنا

چاہیے۔ یہی قول صحیح ہے اور حدیث میں اس کی وضاحت ہے۔ حدیث میں منشد کا جو لفظ ہے' اس کے معنی ہیں 'مشتہر کرنے والا' اور ناشد کے معنی ہیں 'گمشدہ چیز کو تلاش کرنے والا۔

فتح مکہ مکرمہ کے واقعہ کے ضمن میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں اس وقت تک نہیں داخل ہوئے جب تک وہاں سے تصویروں کو نہ ہٹا لیا گیا۔ اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ ایسے مکان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے جہاں تصویریں ہوں' اور یہ حمام میں نماز پڑھنے سے زیادہ مکروہ ہے' کیونکہ حمام میں نماز پڑھنے کی کراہیت نجاست کے خیال سے ہے یا اس وجہ سے ہے کہ شیطان وہاں سکونت اختیار کرتا ہے لیکن تصویروں سے شرک کا اندیشہ ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اکثر قوموں کے اندر تصویروں اور قبروں ہی کے ذریعے شرک داخل ہوا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک یا دو مردوں کو عورت امان دے سکتی ہے' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ہانی کی امان کو معتبر قرار دے دیا تھا۔ اس سے ایسے مرتد کے قتل کا جواز بھی ملتا ہے جس کا ارتداد توبہ نہ کرکے شدید صورت اختیار کر گیا ہو جیسا کہ ابن ابی سرح کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

فصل (۷۷)

غزوہ حنین

ابن اسحاق رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ قبیلہ ہوازن نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اور فتح مکہ کی خبر سنی تو مالک بن عوف نے ہوازن' ثقیف اور جشم کو جمع کیا۔ ان میں ان کا صاحب رائے بوڑھا درید بن صمتہ بھی تھا۔ مصنف نے اس کے بعد غزوہ کی تفصیلات کا ذکر کیا ہے' پھر آگے کی بعض حکمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ پورا فرمایا کہ فتح مکہ کے بعد لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوں گے اور تمام قبائل عرب آپ کی اطاعت اختیار کریں گے۔

جب یہ فتح مبین مکمل ہوئی تو بتقضائے حکمت الٰہی بنو ہوازن اور ان کے پیروکار اسلام لانے سے رک گئے اور ایک جم غفیر تیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے برسرپیکار ہو گئے تاکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کا حکم غالب ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عزت و غلبہ ملے اور ان سے حاصل شدہ مال غنیمت مجاہدین کے لئے بارگاہ الٰہی میں صدلائق شکر و امتنان ثابت ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے بندوں کو ایسی عظیم الشان قوت و شوکت کے سبب غلبہ عطا فرمائے جو اب تک مسلمانوں کو حاصل نہ تھی تاکہ اس کے بعد عربوں میں کسی کو ان کے مقابلہ کی جرأت نہ پیدا ہو سکے۔

نیز اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا تقاضا یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ان کی زبردست قوت و طاقت کے باوجود انہیں شکست و ہزیمت کا مزہ چکھائے تاکہ فتح مکہ کے وقت بلند ہونے والے ان سروں کو جو حرم مکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح سر جھکا کر داخل نہیں ہوئے تھے اور جو لوگ یہ کہتے تھے کہ آج ہم قلت کے سبب مغلوب نہیں ہوں گے۔ انہیں یہ بتائے کہ مدد و نصرت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے' چنانچہ جب مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے تو ان کی دلجوئی کے لئے نصرت کے فرشتے اور اللہ تعالیٰ

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی۔
اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ نصرت وفتح کا لباس وہی زیب تن کرتے ہیں جو تواضع کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى ٱلَّذِينَ ٱسْتُضْعِفُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ ٱلْوَٰرِثِينَ ○ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَٰمَٰنَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَحْذَرُونَ ﴾ [القصص: ٥-٦]

اور جن لوگوں کو زمین میں کمزور کیا جاتا تھا ہم چاہتے تھے کہ ان پر احسان کریں اور ان کو امام بنائیں اور ملک کے وارث بنائیں اور زمین پر انہی کو حکومت دیں اور فرعون و ہامان اور ان فوجوں کو وہ چیز دکھادیں جس سے وہ لوگ ڈرتے تھے

عربوں کے ساتھ غزوہ کی ابتداء بدر سے ہوئی اور خاتمہ حنین سے اور ان دونوں غزوات میں فرشتوں نے لڑائی میں حصہ لیا۔ دونوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کی جانب کنکریاں پھینکیں۔ دونوں سے عربوں کا اشتعال مدھم پڑا۔ چنانچہ بدر میں ان کو خوف محسوس ہوا اور ان کی حدت ٹوٹی اور حنین میں ان کی طاقت کا خاتمہ ہوا۔

غزوہ حنین سے مستنبط بعض احکام ومسائل :

۱۔ اس غزوہ سے یہ معلوم ہوا کہ مشرک سے ہتھیار بطور مستعار لیا جا سکتا ہے۔
۲۔ جنگی اسباب و ذرائع اختیار کرنا توکل علی اللہ کے منافی نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ضمانت کے باوجود اسباب کا اختیار کرنا منافی نہیں ہے۔
۳۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کرنا کہ وہ اپنے دین کو غالب کرے گا' اس کے حکم جہاد کے منافی نہیں ہے۔
۴۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلحہ مستعار لیتے وقت ضمان کی شرط لگا دی تھی۔ اس کے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے کہ آیا آپ نے مستعار سامان کے بارے میں ضمان کی مشروعیت کو بتایا تھا' یا بعینہ اس مستعار سامان کو واپس کرنے کی ضمانت سے متعلق خبر دی تھی۔
۵۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دشمن کے گھوڑے اور سواری کو زخمی کرنا جائز ہے جب کہ اس

سے اس کے قتل پر مدد مل سکتی ہو' اور حیوان کو اس قسم کی ایذا دہی ممنوع نہیں۔

۶۔ اس میں یہ مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو معاف فرما دیا جس نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا بلکہ اس کے سینہ پر ہاتھ پھیر کر دعا بھی دی جس سے وہ سچا مسلمان بن گیا۔

۷۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مال غنیمت کی تقسیم سے قبل کفار کے اسلام لانے کا انتظار کرے تاکہ اسلام لانے کے بعد ان کا مال انہیں واپس کر دیا جائے۔ اس سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ مال غنیمت میں ملکیت تقسیم کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ محض اس پر قبضہ ہو جانے سے نہیں' لہٰذا اگر کوئی شخص تقسیم سے قبل انتقال کر جائے تو اس کا حصہ بجائے وارثوں کے دوسرے مجاھدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک ہے۔

۸۔ وہ عطائے عمومی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو بطور تالیف قلوب کے فرمائی تھی' اس کے متعلق حضرت امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ غنیمت کے مال سے پانچواں حصہ نکالنے کے بعد بقیہ چار حصوں میں سے دیا جائے گا۔ مال غنیمت میں کسی کسی کو زائد حصہ دینے کی مصلحت چونکہ ذوالخویصرہ کی سمجھ میں نہ آ سکی تھی' اس لئے اعتراض کرنے والے نے کہہ دیا' عدل و انصاف کیجئے۔

۹۔ اسلام میں امام کو مسلمانوں کے نائب کی حیثیت حاصل ہے جو مسلمانوں کی مصلحت اور دین کے قیام کے لئے کوشش کرے گا' اگر اسلام کے دفاع کے لئے کسی کو مال دینا پڑے یا سرداران دشمنان اسلام کو اپنے پاس بلانا پڑے تاکہ مسلمان ان کے شر سے محفوظ رہ سکیں تو یہ جائز ہے' کیونکہ شریعت کا اصول یہ ہے کہ بڑے فساد کو روکنے کے لئے چھوٹے فساد کو برداشت کر لیا جائے' اور بڑی مصلحت کے لئے چھوٹی مصلحت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ دونوں قاعدے دین و دنیا کی مصلحتوں کی بنیاد ہیں۔

۱۰۔ اس غزوہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غلام بلکہ جانوروں کو بھی بعض کو بعض کے بدلے ادھار اور کمی بیشی کے ساتھ فروخت کیا جا سکتا ہے' اور یہ کہ دو معاملہ کرنے والے اپنے درمیان غیر محدود مدت مقرر کر لیں اور دونوں راضی ہوں تو بھی جائز ہے' اس لئے کہ اس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں ہے۔

۱۱۔ اس غزوہ میں آپ نے فرمایا کہ "جس نے کسی کافر کو قتل کیا ہو تو اس کا چھینا ہوا مال اس کا ہو گیا' بشرطیکہ اس کے پاس اس کا ثبوت ہو"۔

یہاں پر فقہاء کے درمیان اختلاف ہو گیا کہ یہ شرعی طور پر اس کا مستحق ہے یا شرط کے بعد مستحق

ہوگا۔ اس کے متعلق دو قول ہیں جو امام احمد سے مروی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سامان کا مستحق ہوگا چاہے امام شرط لگائے یا نہ لگائے۔ دوسرا امام کی شرط کے بغیر مستحق نہیں ہے۔

وجہ اختلاف یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت رسول ایسا فرمایا تھا تو پھر یہ فرمان ایک عام شرعی حکم بن جائے گا' جس طرح آپ کا یہ ارشاد کہ :"جس شخص نے کسی قوم کی زمین ان کی اجازت کے بغیر بوئی اس کا پیداوار میں کوئی حصہ نہیں' البتہ اخراجات کا وہ مستحق ہے" یا بحیثیت مفتی آپ نے فرمایا تھا' جیسے آپ نے ابوسفیان کی بیوی ھند بنت عقبہ سے فرمایا کہ "شوہر کے مال سے اتنا لے سکتی ہو جو تمہیں اور تمہارے لڑکے کو کافی ہو"۔ یا بحیثیت امام آپ نے فرمایا تھا کہ ایسی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں آپ کا فرمان امت کے لئے مصلحت میں شامل ہوگا اور بعد میں مصلحت کے اعتبار سے اس کی نگہداشت ضروری ہوگی۔

یہیں سے علماء کے درمیان بہت سے مقامات میں اختلاف پیدا ہوئے۔ آپ کا یہ ارشاد کہ "جو شخص کسی مردہ زمین کو آباد اور زندہ کرے' وہ اس کی ملکیت ہے"۔

۱۲۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دعوی میں ثبوت کے لئے صرف ایک گواہ بغیر قسم کافی ہے' اور اس کے لئے شہادت کے لفظ کا تلفظ بھی مشروط نہیں۔

۱۳۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتول کافر سے چھینے ہوئے مال کا خمس نہیں نکالا جائے گا' اور یہ کہ وہ اصل غنیمت میں سے ہے اور یہ کہ اس کے مستحق حصہ پانے والے اور نہ پانے والے مثلاً عورت اور بچے سب ہیں۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجاہد جتنے کفار کو قتل کرے گا' ان سب کا مال لے گا خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

فصل (۷۸)

غزوہ طائف

جب قبیلہ ثقیف کے لوگ شکست کھا کر بھاگے تو وہ اپنے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئے' اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہو کر ان کے قلعہ کے قریب اترے' چنانچہ اہل قلعہ نے بڑی شدت کے ساتھ تیروں کی بوچھاڑ کردی' جس کی وجہ سے بعض مسلمان زخمی ہوئے اور بارہ آدمی شہید ہوئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے منتقل ہو کر اس جگہ آئے جہاں آج کل طائف کی مسجد ہے اور ان کا اٹھارہ روز محاصرہ جاری رکھا' اور منجنیق کا استعمال فرمایا جو اسلام میں پہلی مرتبہ استعمال کی گئی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ثقیف کے انگور کے باغات کو کاٹنے کا حکم فرمایا' جس میں لوگ فورا مصروف ہو گئے۔

ابن سعد کہتے ہیں کہ لوگوں نے اللہ اور قرابت کا حوالہ دے کر کہا کہ آپ کاٹنے سے منع فرما دیں' تو آپ نے ان کی درخواست قبول فرمالی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے ندا دی کہ جو غلام قلعہ سے اتر کر ہماری طرف آجائے' وہ آزاد ہے۔ یہ سن کر دس سے کچھ زائد آدمی حاضر ہو گئے جن میں ابو بکرہ بھی تھے۔ ان لوگوں کو آپ نے مسلمانوں کے حوالہ کر دیا تاکہ ان کا خیال رکھیں۔

اس بات سے اہل طائف کو سخت صدمہ ہوا' لیکن اس کے باوجود آپ کو فتح طائف کی اجازت نہ ملی' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو روانہ ہونے کا حکم فرمایا۔ بعض صحابہ کو سخت صدمہ ہوا کہنے لگے' طائف فتح تو ہوا نہیں اور ہم واپس چلے جائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا : اچھا کل جنگ کرو۔ صبح لڑائی ہوئی تو کچھ مسلمان زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' ہم کل انشاء اللہ واپس جائیں گے۔ یہ سن کر لوگ خوش ہو گئے اور واپسی کی تیاری شروع کر دی' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لبوں پر تبسم تھا۔ جب سفر کا آغاز ہوا تو آپ نے فرمایا کہ یہ دعاء پڑھو :

«آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ»

ہم توبہ کرتے ہوئے لوٹے' عبادت کرتے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے۔

لوگوں نے درخواست کی کہ قبیلہ ثقیف کے لئے بددعا کیجئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے اللہ ثقیف کو ہدایت دے اور انہیں (مطیع کر کے) ہمارے پاس حاضر کر"۔

محاصرہ طائف کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ کی طرف تشریف لے گئے اور اسی مقام سے عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ میں داخل ہوئے اور عمرہ سے فارغ ہو کر مدینہ تشریف لے گئے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان میں تبوک سے مدینہ تشریف لائے تو اس مہینے قبیلہ ثقیف کا وفد بھی حاضر خدمت ہوا۔ واقعہ یوں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف سے واپس ہوئے تو آپ کے پیچھے عروہ بن مسعود روانہ ہوئے اور آپ کے مدینہ پہنچنے سے قبل آپ سے ملاقات کی اور اسلام قبول کر کے اپنی قوم کی طرف جانے کی اجازت چاہی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جیسا کہ تمہاری قوم سے اندیشہ ہے کہ وہ تم سے جنگ کرے گی' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کر لیا تھا کہ ان لوگوں میں غرور اور نخوت ہے' جس کی وجہ سے وہ قبول اسلام سے رک رہے ہیں۔ عروہ بن مسعود نے عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کے نزدیک ان کی کنواری عورتوں سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہوں' اور وہ واقعی ان میں ایسے ہی محبوب و مطاع تھے' چنانچہ اپنی قوم کو اس امید پر اسلام کی دعوت دینے کے لئے چلے کہ وہ ان کی عظمت اور مرتبہ کے باعث ان کی مخالفت نہ کرے گی' لیکن اس قدر و منزلت کے باوجود جب انہوں نے اسلام کی دعوت دی اور اظہار اسلام کیا تو ہر جانب سے تیر برسنے لگے اور ایک تیر ایسا پیوست ہوا کہ جاں بحق ہو گئے۔ حالت نزاع میں دریافت کیا گیا کہ اپنے خون کے متعلق کیا خیال ہے؟ کہنے لگے : اللہ تعالیٰ نے مجھے اعزاز و اکرام بخشا اور شہادت سے نوازا ہے' اس لئے مجھ میں اور ان شہداء میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شہید ہوئے' کچھ فرق نہیں۔ اس لئے مجھے ان کے ساتھ دفن کرنا۔

لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا تھا کہ "ان کی مثال اپنی قوم میں اس طرح ہے کہ جیسے صاحب یٰس کی اپنی قوم میں تھی"۔

حضرت عروہ کی شہادت کے بعد قبیلہ ثقیف کے لوگ کئی ماہ رکے رہے' پھر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور سمجھ لیا کہ چاروں طرف سے عربوں سے لڑنا ہمارے بس کی بات نہیں' کیونکہ تقریباً سبھی اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس بات پر اتفاق رائے کر لیا کہ عروہ کی طرح نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی آدمی بھیجیں اور انہوں نے اس کے لئے عبد یالیل سے گفتگو کی۔ اس نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور خطرہ محسوس کیا کہ کہیں اس کے ساتھ بھی عروہ جیسا معاملہ نہ ہو' اور اس شرط پر قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ اس کے ساتھ مزید آدمی بھیجے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے بنی احلاف کے دو آدمی اور بنی مالک کے تین آدمی ساتھ کر دیئے۔ ان میں عثمان بن ابی العاص بھی تھے۔ یہ لوگ مدینہ کے قریب پہنچ کر ایک نہر کے قریب اترے جہاں مغیرہ بن شعبہ نے ان کو دیکھ کر تیزی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے چلے تاکہ آپ کو قبیلہ ثقیف کے حاضر ہونے کی اطلاع کر دیں۔ انہیں راستے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ملے۔ کہنے لگے میں تجھے اللہ کی قسم دلاتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مجھ سے پہلے حاضر نہ ہونا' میں آپ کو یہ خوشخبری سناؤں گا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ آخر حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قبیلہ ثقیف کے وفد کی آمد کی اطلاع دی' پھر حضرت مغیرہ ان کے پاس پہنچے اور ظہر کے وقت ان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ان کے پہنچنے کے بعد مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں ان کے لئے خیمہ نصب کیا گیا۔ حضرت خالد بن سعید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قبیلہ ثقیف کے وفد کے درمیان پیغام رسانی کا کام کرتے رہے اور آخر کار وہ مسلمان ہو گئے۔ دوران گفتگو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چند مطالبات کئے۔

پہلا مطالبہ یہ تھا کہ ان کا لات نامی بت تین سال تک رہنے دیا جائے اور اسے نہ توڑا جائے تاکہ قبیلے کے بیوقوفوں کے شر سے محفوظ رہ سکیں' لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا وہ برابر اس کا اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ ایک ماہ باقی رہنے کی درخواست کی' لیکن آپ نے قطعی طور پر کوئی بھی متعینہ مدت دینے سے انکار فرما دیا۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ ان کو نماز پڑھنے اور بتوں کو اپنے ہاتھوں سے توڑنے سے معاف کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : رہا بتوں کا اپنے ہاتھوں سے توڑنے کا معاملہ تو اس سے ہم تمہیں معاف کر دیں گے' لیکن نماز کا معاملہ تو یاد رکھو' جس دین میں نماز نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی نہیں۔

جب یہ لوگ مسلمان ہو گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن ابی العاص کو ان پر امیر مقرر فرما دیا۔ یہ سب سے نوعمر تھے' لیکن دین سیکھنے کا جذبہ ان میں سب سے زیادہ تھا۔ جب ان

لوگوں نے اپنے علاقہ کی طرف واپسی کا ارادہ کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہمراہ حضرت ابو سفیان اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کو لات نامی بت کو توڑنے کے لئے بھیجا۔

جب حضرت مغیرہ نے بت کے اوپر چڑھ کر کلہاڑی برسانا شروع کی' تو قبیلہ ثقیف کی عورتیں روتی چلاتی نکلیں' اس دوران بنی مغیث ان کی حفاظت کے لئے اردگرد موجود تھے تاکہ عروہ رضی اللہ عنہ کی طرح ان پر تیروں کی بوچھار نہ کی جائے۔ جب حضرت مغیرہ نے اسے پوری طرح منہدم کر دیا تو اس سے نکلنے والی دولت کو سمیٹ لیا۔

قبیلہ ثقیف کے وفد کے آنے سے قبل حضرت عروہ بن مسعود کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے ابو ملیح بن عروہ اور قارب بن اسود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر کے اپنے قبیلہ ثقیف سے قطع تعلق کر چکے تھے' چنانچہ اس واقعہ کے بعد آپ نے ان دونوں سے فرمایا کہ : جسے چاہو تم ولی بنالو۔ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ اور رسول کے علاوہ کسی کو ولی نہیں بنائیں گے۔ تو آپ نے فرمایا اور اپنے ماموں ابو سفیان بن حرب کو بھی' چنانچہ ان لوگوں نے اس پر آمادگی ظاہر کر دی۔

طائف کے لوگ مسلمان ہو گئے تو حضرت عروہ کے صاحبزادے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ بتوں کے اندر سے ملنے والی دولت سے ان کے والد کا قرض ادا فرما دیں۔ آپ نے منظور فرما لیا۔ یہ سن کر حضرت قارب نے بھی اپنے والد کے قرضوں کی ادائیگی کی درخواست کی۔ حضرت عروہ اور اسود دونوں بھائی تھے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست سن کر فرمایا کہ تمہارے والد اسود کا انتقال حالت شرک میں ہوا ہے۔ اس پر حضرت قارب نے عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیکن اس طرح ایک مسلمان رشتہ دار کے ساتھ احسان ہو گا۔ اس سے وہ اپنے کو مراد لے رہے تھے۔ وہ قرض تو مجھ پر ہے' چنانچہ آپ نے ان کا بھی قرض اس رقم سے ادا فرما دیا۔

غزوہ طائف سے مستنبط احکام و مسائل :

اس غزوہ سے مندرجہ ذیل فقہی احکام و مسائل ثابت ہوتے ہیں :

۱۔ حرمت والے مہینوں میں قتال کرنا جائز ہے' اور اس کی تحریم منسوخ ہو چکی ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے مکہ کی طرف ماہ رمضان کی آخری تاریخوں میں روانہ ہوئے اور مکہ میں انیس

دن قیام فرمایا۔ پھر قبیلہ ہوازن کی طرف تشریف لے گئے اور ان سے قتال فرمایا' پھر طائف کے لئے روانہ ہوئے اور ان کا تقریباً بیس دن محاصرہ جاری رکھا۔

ان ایام و شہور کے اعداد و شمار پر غور و فکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ محاصرہ کی کچھ مدت ماہ ذوالقعدہ میں بھی تھی۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس مدت میں صرف محاصرہ کیا گیا تھا اور قتال تو ماہ شوال میں ہوا تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابتداء کرنا اور اس کو کسی نہ کسی شکل میں جاری رکھنا دونوں میں فرق ہے۔

۲۔ اس غزوہ سے اس بات کا جواز نکلتا ہے کہ انسان اہل و عیال کے ساتھ جنگ میں جا سکتا ہے' کیونکہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ام سلمہ اور حضرت زینب تھیں۔

۳۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کفار کے مقابلہ میں ان پر پتھر برسانے کے لئے منجنیق نصب و استعمال کیا جا سکتا ہے' خواہ اس سے بے قصور عورتوں اور بچوں کو بھی نقصان پہنچے۔

۴۔ دشمنوں کے درختوں کو بھی کاٹا جا سکتا ہے' جو ان کو نقصان پہنچائے' کمزور کرے اور انہیں غیظ و غضب میں مبتلا کرے۔

۵۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر مشرکین کے غلام بھاگ کر مسلمانوں سے ملیں تو وہ آزاد ہوں گے۔ ابن منذر نے اس پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔

۶۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام جب کسی قلعے کا محاصرہ کرے اور وہ فتح نہ ہو اور وہاں سے کوچ کرنے اور محاصرہ ختم کرنے میں مسلمانوں کی مصلحت ہو تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔

۷۔ اس میں اس کا بھی تذکرہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کے لئے مقام جعرانہ سے احرام باندھا' اور طائف سے جو شخص مکہ میں بغرض عمرہ داخل ہونا چاہے اس کے لئے یہی سنت ہے۔ لیکن عمرہ کا احرام باندھنے کی نیت سے مکہ سے جعرانہ جانے کو کسی عالم نے مستحب نہیں سمجھا ہے۔

۸۔ اس واقعہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمتہ للعالمین و بالمومنین روف رحیم کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جو قوم و قبیلہ آپ سے برسرپیکار ہوئی اور آپ کے صحابہ کی ایک جماعت کو شہید کیا اور آپ کے قاصد حضرت عروہ کو بھی بے دردی سے قتل کر دیا۔ ان تمام بداعمالیوں کے باوجود آپ نے ان کیلئے دعائے خیر فرمائی اور ان کی ہدایت کی تمنا فرمائی۔ یہ آپ کے کمال رحمت و شفقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

۹۔ اس واقعہ سے حضرت ابوبکر صدیق کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کمال محبت اور ہر ممکن آپ سے تقرب و الفت کی خواہش کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے حضرت مغیرہ سے اصرار کیا کہ ان

ہی کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وفد طائف کی آمد کی خوشخبری سنائیں ' تاکہ وہی آپ کی فرحت و مسرت کا سبب بنیں۔ چنانچہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جائز ہے کہ کوئی اپنے دوسرے بھائی سے درخواست کرے کہ وہ اسے ایک نیکی کرنے کا موقع دے۔

بعض علماء کا یہ قول صحیح نہیں کہ نیکیوں میں ایثار کرنا جائز نہیں ' حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار رحمت میں دفن ہونے کے معاملہ میں اپنے آپ پر ترجیح دے دی ' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی درخواست پر انہیں ناگواری نہیں ہوئی ' بلکہ اس کی تکمیل فرمائی۔

۱۰۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شرک اور طاغوتی اڈوں کو ایک دن بھی باقی نہ رکھا جائے ' بلکہ ان کو منہدم کردیا جائے بشرطیکہ انہیں مٹانے اور ختم کرنے کی استطاعت ہو ' کیونکہ یہ جگہیں شرک و کفر کی علامات ہیں جو تمام برائیوں کی جڑ ہیں۔ اس لئے استطاعت ہوتے ہوئے انہیں قائم رہنے دینا ناجائز ہے۔

یہی حکم ان زیارت گاہوں کا بھی ہے جنہیں قبروں پر تعمیر کیا گیا ہے ' اور اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش کی جاتی ہے ' جن پتھروں کی لوگ تعظیم کرتے ہیں ' تبرک حاصل کرتے ہیں ' نذر و نیاز پیش کرتے ہیں ' اور بوسہ دیتے ہیں ' ان میں سے کسی کو قدرت کے بعد باقی رکھنا جائز نہیں۔ ان میں سے اکثر تو لات و عزی و منات کے درجہ کے ہیں ' بلکہ بعض کے ساتھ اس سے زیادہ شرک و خرافات کا رواج ہے ' اور اللہ رحم فرمائے۔ آمین۔

ان مشرکوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ بت پیدا کرتے ہیں ' روزی دیتے ہیں ' مارتے اور زندہ کرتے ہیں ' بلکہ مشرکین بھی وہی اعمال کرتے تھے جو کہ آج کل ان کے مشرک بھائی اپنے یہاں صنم کدوں (مزارات) میں کرتے ہیں۔ اس طرح آج کے لوگ بھی اپنے سے پہلے لوگوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں ' اور ایک ایک مرحلہ پر انہی کی اتباع کر رہے ہیں۔

جہالت کے غلبہ اور علم کی کمی کے باعث اکثر لوگوں پر شرک کا غلبہ ہو چکا ہے ' ان کے نزدیک نیکی بدی بن چکی ہے ' اور بدی نیکی دکھائی دیتی ہے۔ سنت کو بدعت اور بدعت کو سنت سمجھنے لگے ہیں۔ چھوٹوں کی نشوونما اور بڑوں کا بڑھاپا اسی میں گذر رہا ہے۔

شعائر اسلام غائب ہو چکے ہیں اور غربت اسلام نے شدت اختیار کرلی ہے۔ علماء کم ہو گئے ہیں '

سفہاء کا غلبہ ہو گیا ہے اور معاملہ بگڑ چکا ہے اس طرح بحر و بر میں فساد برپا ہو چکا ہے اور لوگ اپنے کرتوتوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ امت محمدیہ میں سے ایک جماعت ضرور ـــ ہمیشہ حق پر قائم اور ثابت قدم رہے گی اور اہل شرک و بدعت کا مقابلہ کرتی رہے گی تا آنکہ اللہ تعالیٰ زمین اور اہل زمین کا وارث بن جائے اور قیامت آ جائے وہی بہتر وارث ہے۔

۱۱۔ اس غزوہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زیارت گاہوں میں جو مال خرچ ہوتا ہے' اسے امام وقت جہاد اور دوسری مصلحتوں میں خرچ کر سکتا ہے۔ ان کو فوجیوں میں تقسیم کر سکتا ہے' اور دوسرے نیک کاموں میں لگا سکتا ہے' اور ان مزارات پر جو اوقاف ہیں ان کا بھی یہی حکم ہے' اور اس سلسلہ میں ائمہ اسلام میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

فصل (۷۹)

غزوہ تبوک

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور ہجرت کا نواں سال شروع ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات کی وصولی کے لئے محصلین کو بھیجا' چنانچہ عیینہ بن حصن کو بنو تمیم کے پاس' یزید بن حصین کو اسلم اور غفار کے پاس' عدی بن حاتم کو طئی اور بنو اسد کے پاس' مالک بن نویرہ کو بنو حنظلہ کے پاس' زبرقان بن بدر اور قیس بن عاصم کو بنو سعد کے پاس' علاء بن حضرمی کو بحرین کے لئے اور علی کو نجران کے لئے روانہ فرمایا۔

اسی سال یعنی رجب سنہ ۹ ہجری میں غزوہ تبوک واقع ہوا' یہ زمانہ سخت تنگی' قحط سالی کا تھا اور آئندہ موسم کا پھل لگ چکا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جنگ کے موقعوں پر کبھی ظاہر نہ کرتے کہ کدھر کا قصد ہے لیکن غزوہ تبوک کے موقع پر تنگ حالی اور بعد مسافت کے باعث صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ رومیوں سے جنگ درپیش ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جد بن قیس سے فرمایا کہ : "اے جد' کیا اس سال رومیوں سے نبرد آزمائی کے لئے چلو گے؟ اس نے حیلہ سازی کی یا رسول اللہ کیا آپ مجھے آزمائش سے معاف نہ رکھیں گے؟ سب لوگ جانتے ہیں کہ مجھے عورتوں سے نہایت رغبت ہے' میں ڈرتا ہوں کہ رومی عورتوں کو دیکھ کر بے اختیار نہ ہو جاؤں' آپ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا : خیر نہ جاؤ' اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی :

﴿ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ ٱئْذَن لِّي وَلَا تَفْتِنِّيٓ ﴾ [التوبة : ٤٩]

ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں' مجھے رہ جانے کی اجازت دے دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالئے۔

منافقوں نے ہمتیں پست کرنا شروع کیں اور کہنے لگے اس گرمی میں نہ جاؤ' اس پر یہ آیت نازل ہوئی :

﴿وَقَالُوا لَا تَنفِرُوا فِي الْحَرِّ ۗ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا ۚ لَّوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ﴾ [التوبة : ٨١]

یہ کہتے ہیں' گرمی میں کوچ نہ کرو۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ سخت ہے' کاش ان میں عقل ہوتی۔

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالداروں کو راہ خدا میں خرچ کرنے کا حکم فرمایا اور انہوں نے تعمیل کی' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر تین سو اونٹ مع ساز و سامان کے اور ایک ہزار دینار پیش خدمت کئے۔

اسی دوران نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ لوگ باچشم تر حاضر ہوئے جن کی تعداد سات تھی اور آپ سے کچھ سواریوں کی درخواست کی' آپ نے فرمایا کہ اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ واپس چلے گئے۔ شدت الم کے باعث ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ ان کے پاس کچھ نہیں کہ جس کے ذریعہ وہ صدقہ کرکے شریک جہاد ہو سکیں۔

اس موقع پر اشعریوں نے ابو موسیٰ کو بھیجا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سواریاں مانگیں۔ آپ اس وقت ناراض تھے۔ غصہ سے قسم کھا کر فرمانے لگے' واللہ میں تمہیں ہرگز سواری نہ دوں گا' اور پھر میرے پاس سواری ہے بھی نہیں' اس کے بعد ہی کچھ اونٹ آ گئے۔ آپ کا غصہ فرو ہو گیا اور انہیں واپس بلا کر اونٹ مرحمت فرمائے۔ ساتھ ہی فرمایا : میں نے تمہیں سواری نہیں دی' لیکن وہ اللہ ہے جس نے یہ اونٹ بھیج دیئے ہیں۔ میں جب قسم کھاؤں گا اور پھر دیکھوں گا کہ اس کے خلاف عمل کرنا بہتر ہے تو قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دوں گا۔

اسی موقع پر ایک رات علیہ بن زید نے نماز پڑھی اور رو رو کر دعا کی : یارب العزت! تو نے جہاد کا حکم دیا ہے لیکن مجھے اتنا نہیں دیا کہ تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دے سکوں' اور نہ اپنے رسول کو اتنا دیا ہے کہ مجھے ساتھ لے جا سکیں۔ اے اللہ! اگر میں جہاد کے ناقابل ہوں تو میں تیری راہ میں ہر وہ تکلیف معاف کرتا ہوں جو کسی مسلمان کے ہاتھ سے مجھے پہنچی ہے' جان کی ہو' مال کی ہو یا آبرو کی۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کی رات صدقہ کرنے والا کہاں ہے؟ اس آواز پر کوئی کھڑا نہیں ہوا۔ آپ نے دوبارہ سوال فرمایا تو حضرت علیہ کھڑے ہوئے' آپ نے ان سے فرمایا "علیہ تیری یہ دعا بطور زکاۃ مقبول لکھ لی گئی"۔

منافقین کی متعدد ٹولیوں نے عذر لنگ پیش کرکے عدم شرکت کی اجازت چاہی' لیکن بارگاہ نبوی سے

انہیں اجازت نہیں دی گئی۔ عبداللہ بن ابی یہود اور منافقین کی ایک جماعت کے ہمراہ وادی وداع میں تھا' کہا جاتا ہے کہ اس کا لشکر دو لشکروں سے کم نہ تھا لیکن روانگی کے وقت یہ سب پیچھے رہ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد بن مسلمہ انصاری کو مدینہ میں نائب مقرر فرمایا' اور حضرت علی بن ابی طالب کو اپنے اہل بیت پر بطور نگراں مقرر فرمایا۔ جب مسلمانوں کا لشکر روانہ ہو گیا تو ابن ابی لشکر کے پیچھے رہ گیا۔

حضرت علی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے عورتوں و بچوں کی نگرانی کے لئے چھوڑ کر جا رہے ہیں' تو آپ نے فرمایا کہ "میرا تمہارا وہی تعلق ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہارون علیہ السلام کا تھا مگر خبردار میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا"۔

اس غزوہ میں کچھ مسلمان بھی پیچھے رہ گئے لیکن ان کے ایمان اور عزم جہاد میں شک یا تذبذب کی وجہ سے نہ تھا۔ ان میں کعب بن مالک' ہلال بن امیہ' مرارہ بن ربیع' ابو خیثمہ' ابوذر غفاری تھے لیکن حضرت ابوذر اور ابو خیثمہ بعد میں جا ملے تھے۔

اس غزوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تیس ہزار فوج تھی' جس میں دس ہزار سوار تھے۔ آپ تبوک میں بیس دن یہاں اقامت پذیر رہے اور نماز قصر کر کے ادا کرتے رہے' اس وقت ہرقل حمص میں تھا۔ حضرت ابو خیثمہ کے جہاد میں شرکت کا واقعہ یوں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ سے رخصت ہوئے چند دن گذرے تھے کہ ابو خیثمہ اپنے گھر گئے۔ اس وقت شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی دونوں بیویاں اپنے خیموں میں پانی چھڑک رہی ہیں' اور پانی بھی خوب ٹھنڈا کر لیا ہے اور کھانا بھی اچھی طرح تیار کر لیا ہے' خیمہ میں داخل ہوتے ہی یہ سب چیزیں دیکھ لیں۔ پھر دل ہی میں کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دھوپ اور گرمی اور آندھی میں رہیں اور ابو خیثمہ ٹھنڈی چھاؤں' لذیذ کھانے' اور خوبصورت عورتوں میں عیش کرے' یہ تو بڑی زیادتی اور ناانصافی ہے' پھر گویا ہوئے' خدا کی قسم میں تم میں سے کسی کے خیمہ میں داخل نہ ہوں گا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملوں گا' پھر انہوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی اور روانہ ہو گئے حتیٰ کہ تبوک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے۔

راستہ میں حضرت ابو خیثمہ کی حضرت عمیر بن وھب سے ملاقات ہوئی' وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں تھے' یہ دونوں رفیق سفر ہو گئے اور جب تبوک سے قریب پہنچے تو ابو خیثمہ نے عمیر

بن وھب سے کہا کہ مجھ سے تخلف کی بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جانے تک مجھ سے الگ نہ ہونا' ایسا نہ ہو کہ راستہ بھول جاؤں۔

جب یہ دونوں تبوک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی منزل کے قریب پہنچے تو لوگ کہنے لگے' دیکھنا کوئی بھٹکا ہوا سوار آ رہا ہے' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ابو خیثمہ ہو گا' عرض کیا گیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم یہ تو ابو خیثمہ ہی ہیں۔ سواری سے اتر کر خدمت اقدس میں حاضر ہو کر سلام کیا اور سارا ماجرا سنایا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا' اچھا کیا اور ان کے لئے دعائے خیر فرمائی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ثمود کے علاقے حجر سے گذرے تو فرمایا کہ یہاں سے پانی نہ پیو' اور نہ اس سے وضو کرو' اور تم نے جو اس سے آٹا گوندھ لیا ہے' وہ اونٹوں کو کھلا دو' اور تم میں سے کوئی بھی اپنے رفیق کو ہمراہ لئے بغیر باہر نہ نکلے۔

لہٰذا بنی ساعدہ کے دو آدمیوں کے سوا تمام لوگوں نے ایسا ہی کیا' یہ دونوں تنہا نکلے۔ ایک اپنی کسی ضرورت کے باعث' اور دوسرا اپنے اونٹ کی تلاش میں' جو اپنی ضرورت سے نکلا تھا' اس نے خودکشی کی کوشش کی اور جو اپنے اونٹ کی تلاش میں نکلا تھا' اسے ہوا نے اڑا کر بنی طے کے ایک پہاڑ پر ڈال دیا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا' کیا میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا' پھر آپ نے اسے بلوایا' جس نے خودکشی کی کوشش کی تھی تو وہ بالکل شفایاب ہو گیا اور دوسرے کو قبیلہ طے نے آپ کی خدمت میں مدینہ واپس تشریف لانے کے بعد پیش کیا۔

امام زہری کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام حجر میں پہنچے تو آپ نے چہرے کو کپڑے سے ڈھانپ لیا اور سواری کو تیز کر لیا اور فرمایا کہ "ظالموں کے گھروں میں صرف روتے ہوئے داخل ہوا کرو کیونکہ ڈر ہے کہ جو عذاب انہیں لاحق ہوا' تمہیں بھی لاحق ہو جائے"۔

صحیحین میں مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کو بہا دینے کا حکم فرمایا اور یہ ہدایت فرمائی کہ لوگ اس کنویں سے پانی لیں' جس پر حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی جاتی تھی۔

ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ صبح ہوئی تو لوگوں کے پاس پانی نہ تھا۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر شکایت کی' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے ابر بھیجا اور اس قدر بارش ہوئی کہ لوگ سیراب ہو گئے اور حسب ضرورت پانی جمع بھی ہو گیا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ کرنے کا فرمان صادر فرمایا اور کچھ لوگ آگے بڑھے' جب کوئی شخص پیچھے رہ جاتا تو لوگ کہتے کہ فلاں شخص رہ گیا' آپ فرماتے کہ چھوڑ دو' اگر اس میں کوئی خیر ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے تمہارے ساتھ ملا دے گا' اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر تم اس سے آرام پا گئے۔

جب حضرت ابوذر غفاری کو اونٹنی سے شکایت ہوئی تو انہوں نے سامان اتار کر اپنی پیٹھ پر لاد لیا اور پیادہ پا نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش پا پر چل پڑے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک منزل پر اترے تھے کہ کسی شخص نے عرض خدمت کیا : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی آدمی راستہ پر تن تنہا چلا آرہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : وہ ابوذر ہوں گے۔ جب لوگوں نے غور سے دیکھا تو پہچان لیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو واقعی ابوذر ہی ہیں۔ آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ ابوذر پر رحم فرمائے تنہا چلتا ہے' تنہا مرے گا اور تنہا ہی اٹھے گا"۔

صحیح ابن حبان میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا تو ان کی اہلیہ رونے لگیں۔ وہ کہنے لگے 'کیوں روتی ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ کس طرح آنسو نہ بہاؤں جب کہ آپ ایک ویرانے میں فوت ہو رہے ہیں اور میرے پاس اتنا کپڑا بھی نہیں جو آپ کے کفن کے لئے کافی ہو سکے' اور آپ کو دفن کرنے کی میرے اندر ہمت بھی نہیں اور نہ کوئی تعاون کرنے والا ہے' تو انہوں نے جواب دیا کہ خوش ہو جاؤ' اور روؤ نہیں' کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کی ایک جماعت کو جس میں میں بھی شامل تھا' فرماتے سنا ہے کہ "تم میں سے ایک آدمی ویرانے میں فوت ہوگا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے جنازہ میں شریک ہوگی"۔ اب ان میں سے کوئی زندہ باقی نہیں رہا اور تمام کے تمام فوت ہو چکے ہیں۔ اس لئے وہ تنہا فوت ہونے والا میں ہی ہوں۔ اللہ کی قسم میں نے نہ غلط کہا اور نہ تکذیب کی' اس لئے راستہ کی طرف دیکھو۔ ان کی اہلیہ نے عرض کیا کہ حجاج کرام جا چکے ہیں' راستے خالی ہو چکے ہیں' اب کون یہاں ہوگا' انہوں نے کہا جاؤ اور جا کر دیکھو۔ اہلیہ فرماتی ہیں کہ میں ٹیلے کی جانب جا کر دیکھتی اور پھر واپس آکر تیمارداری کرتی' میں اور وہ اس حالت میں تھے کہ کچھ لوگ سواریوں پر نظر آئے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کیا' وہ تیزی سے میری طرف آئے اور قریب آکر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے' اے اللہ کی بندی کیا معاملہ ہے؟ میں نے جواب دیا' ایک مسلمان فوت ہو رہا ہے' کیا تم اسے کفن دو گے؟ انہوں نے پوچھا' وہ کون ہے؟ میں نے جواب دیا' رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابوذر غفاری ہیں۔ کہنے لگے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست اور ساتھی؟

میں نے کہا' ہاں وہی ہیں۔ انہوں نے حضرت ابوذر کے متعلق "ان پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں" جیسے الفاظ میں اظہار عقیدت پیش کیا پھر ان کی خدمت میں تیزی سے بڑھے۔ جب یہ لوگ حضرت ابوذر کے پاس پہنچے تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا : خوش ہو جاؤ (اور پھر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکورہ حدیث بیان کی) اس کے بعد کہا کہ اگر میرے یا میری بیوی کے پاس کفن دینے کے لئے کوئی کپڑا ہوتا تو مجھے اس میں کفنایا جاتا۔ اس لئے میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر درخواست کرتا ہوں کہ تم میں سے وہ شخص مجھے کفن نہ دے جو کسی جگہ کا گورنر' نمائندہ یا حاکم وغیرہ رہ چکا ہو۔ انہوں نے غور کیا تو سب کے سب مذکورہ مناصب میں سے کسی نہ کسی منصب کو اختیار کر چکے تھے۔ صرف ایک انصاری نوجوان حضرت ابوذر کے معیار پر پورا اترا۔ اس نے بڑھ کر عرض کیا' اے چچا جان! میں آپ کو اپنی اس چادر یا ان دو کپڑوں میں کفن دوں گا جو میری والدہ نے کاتے اور بنے تھے۔ انہوں نے فرمایا' ہاں "تم مجھے کفن دینا" چنانچہ اس انصاری نوجوان نے انہیں کفن پہنایا' سب نے نماز جنازہ پڑھی پھر انہیں دفن کیا۔ یہ سب لوگ یمن کے تھے۔

صحیح مسلم میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تبوک پہنچنے سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "کل انشاء اللہ تم لوگ تبوک کے چشمہ پر پہنچو گے لیکن تم چاشت ہونے سے قبل نہیں پہنچ سکتے۔ اگر کوئی جائے تو ہرگز اس کا پانی استعمال نہ کرے' جب تک میں نہ پہنچ جاؤں"۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ دو آدمی پہلے سے پہنچ چکے تھے اور چشمہ کا پانی ذرا ذرا سا رک رک کر بہہ رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے دریافت فرمایا : کیا تم نے اس میں سے کچھ استعمال کیا ہے؟ وہ کہنے لگے' جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر سخت خفا ہوئے اور سخت سست کہا۔ پھر لوگوں نے چلو سے تھوڑا تھوڑا پانی جمع کیا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چہرہ اور ہاتھ دھوئے اور اس استعمال شدہ پانی کو دوبارہ اس چشمہ میں ڈال دیا۔ اچانک کثرت سے پانی کا فوارہ ابلنے لگا اور لوگوں نے خوب پانی پیا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اے معاذ وہ زمانہ قریب ہے' اگر تیری زندگی رہی تم خود بھی دیکھو گے کہ اس پانی سے یہاں کے باغات شاداب و سیراب ہوا کریں گے اور یہ جگہ درختوں سے بھر جائے گی"۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک پہنچے تو ایلہ کا حاکم حاضر خدمت ہوا اور صلح کی درخواست

پیش کی اور جزیہ دینے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اسی موقع پر اہل جرب اور اذرح بھی حاضر ہوئے اور جزیہ دینا منظور کر لیا۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلہ کے حاکم کو ایک تحریری فرمان جاری فرمایا جس کا مضمون یہ تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ یہ تحریر اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یحنہ بن روبہ اور اس کی قوم اہل ایلہ کے لئے پروانہ امن ہے' اہل ایلہ کی کشتیاں اور سواریاں خواہ وہ خشکی میں ہوں یا سمندر میں' اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اور ذمہ میں ہیں' اور اہل شام اور اہل یمن اور اہل بحرین میں سے جو لوگ بھی ان کے ساتھ ہوں گے' وہ قافلے بھی ان کی امان و پناہ میں ہیں۔ اگر کوئی ان کا آدمی خلاف معاہدہ کوئی کام کرے گا تو اس کا مال اس کی جان کو نہ بچا سکے گا' بلکہ وہ کسی بھی مسلمان کے لئے مباح ہو گی۔ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ خشکی یا تری میں کوئی راستہ یا جگہ کام میں آنے سے روکیں۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو دومتہ الجندل کے حاکم اکیدر بن عبدالملک الکندی کے پاس بھیجا اور فرمایا کہ اسے تم نیل گائے کا شکار کرتے دیکھو گے۔ حضرت خالد جب وہاں پہنچے جہاں سے اس کا قلعہ نظر آ رہا تھا اور چاندنی رات تھی تو وہ وہیں ٹھہر گئے۔ دیکھا کہ ایک نیل گائے آئی اور محل کے دروازے پر سینگ رگڑنے شروع کر دئے' اس کی بیوی نے کہا کہ کیا تم نے کبھی ایسی گائے دیکھی ہے وہ بولا نہیں' پھر اکیدر اپنے مصاحبین کی ایک جماعت کے ساتھ باہر نکلا۔ اسی وقت اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر نے گرفتار کر لیا اور اس کے بھائی حسان کو قتل کر دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ نے اکیدر کی جان بخشی کے بعد جزیہ دینے پر صلح کر لی' وہ نصرانی تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت خالد نے اکیدر کو قتل سے بچا لیا تھا۔ حضرت خالد کے ساتھ چار سو بیس شہسوار تھے۔ انہوں نے دو ہزار اونٹ' آٹھ سو بکریوں' چار سو زرہ اور چار سو نیزوں پر صلح کی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ الگ کر کے یہ مال غنیمت تقسیم کیا گیا۔ پہلے خمس نکالا گیا پھر باقی مال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تقسیم کیا گیا۔ ہر صحابی کو پانچ پانچ حصے ملے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس دن سے زیادہ قیام کے بعد تبوک سے واپس تشریف لائے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ غزوہ تبوک میں ایک رات میں اٹھا تو لشکر کی ایک جانب شعلہ نظر آیا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ اچانک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور

حضرت عمر رضی اللہ عنہما نظر آئے اور دیکھا کہ عبداللہ ذوالبجادین فوت ہو گئے ہیں اور ان کے لئے قبر کھودی گئی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں کھڑے ہیں اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم میت کو قبر میں اتار رہے ہیں اور آپ فرما رہے ہیں کہ اپنے بھائی کو میرے قریب کر دو۔ ان دونوں حضرات نے انہیں قریب کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "اے اللہ میں اس سے راضی ہوں' تو بھی اس سے راضی ہو جا"۔ حضرت عبداللہ بن مسعود راوی حدیث فرماتے ہیں کہ کاش وہ صاحب قبر میں ہی ہوتا۔

حضرت ابو امامہ باہلی سے مروی ہے کہ : تبوک میں حضرت جبریل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معاویہ بن معاویہ مزنی کے جنازہ میں شرکت کیجئے۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور حضرت جبریل ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ اترے اور اپنا دایاں پیر پہاڑوں پر رکھا تو وہ پست ہو گئے' اور بایاں پیر زمین پر رکھا تو وہ بھی پست ہو گئی' یہاں تک کہ مکہ و مدینہ کی طرف دیکھ لیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل علیہ السلام اور فرشتوں نے ان کی نماز پڑھی۔ فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل سے پوچھا کہ معاویہ کو یہ مرتبہ کیسے ملا ؟ انہوں نے جواب دیا کہ کھڑے' بیٹھے' سواری پر اور پیدل ہر حال میں ﴿قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ﴾ پڑھنے کی وجہ سے ایسا بلند مرتبہ ملا ہے۔

اس حدیث کو ابن السنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

غزوہ تبوک سے واپسی پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "بے شک مدینہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ تم جہاں چلے اور جو وادی بھی تم نے طے کی' وہ تمہارے ہمراہ تھے"۔ صحابہ نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول' کیا مدینہ میں رہتے ہوئے ؟ آپ نے فرمایا : "ہاں ! انہیں عذر نے روک رکھا تھا"۔

منافقین کی ایک سازش :

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے مدینہ واپس لوٹ رہے تھے تو راستہ میں کچھ منافقین نے آپس میں یہ سازش تیار کی کہ آپ کو راستہ میں ایک پہاڑی سے گھاٹی میں گرا دیں۔ جب قافلہ نبوی اس جگہ پہنچا تو وہ آپ کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتے تھے' لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی سازش سے آپ (صلی

اللہ علیہ وسلم) کو آگاہ فرمادیا' چنانچہ آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ "تم میں سے جو کوئی وادی کے راستہ سے جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ کشادہ ہے" اور یہ کہہ کر آپ نے پہاڑی والا راستہ اختیار فرمایا اور دوسرے صحابہ نے نشیبی راستہ اختیار کیا' البتہ سازشی منافقین نے نقاب پہن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلنے کا ارادہ کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حضرت حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر تھے' آپ نے حضرت عمار کو اونٹنی کی نکیل پکڑنے کا حکم دیا' اور حضرت حذیفہ کو پیچھے سے اونٹنی ہانکنے کے لئے فرمایا۔ یہ لوگ جا رہے تھے کہ ان کے پیچھے سے ایک جماعت کے اچانک حملہ کرنے کی آواز آئی اور اتنے میں انہوں نے آپ کو گھیر لیا تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ میں حضرت حذیفہ کو آواز دی کہ انہیں ہٹا دیں۔ جب حضرت حذیفہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی دیکھی تو اپنا ڈنڈا لے کر مڑے اور ان کی سواریوں کے منہ پر ضربیں لگائیں اور انہیں نقاب پہنے ہوئے دیکھا تو یہ خیال کیا کہ مسافروں کی طرح ان لوگوں نے نقاب پہن لی ہے۔ حضرت حذیفہ کو جب انہوں نے دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر کافی رعب طاری کر دیا' اور وہ یہ سمجھے کہ ان کی سازش کا پردہ فاش ہو گیا ہے' چنانچہ تیزی سے بھاگ کر لوگوں میں خلط ملط ہو گئے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ سے فرمایا کہ تم نے ان میں سے کسی کو پہچانا؟ انہوں نے جواب دیا' سواری فلاں فلاں کی تھی' چونکہ رات اندھیری تھی' اس لئے ان لوگوں کو نہ پہچان سکا۔ آپ نے پوچھا کہ ان کا مقصد کیا تھا۔ حضرت حذیفہ نے بتایا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے میرے ساتھ چلنے کی ایک سازش تیار کی تھی کہ جب میں گھاٹی پر چڑھوں تو وہ مجھے نیچے گرا دیں۔ حضرت حذیفہ نے یہ سن کر کہا کہ آپ ان کی گردن کیوں نہیں مار دیتے؟ آپ نے فرمایا کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں کہ لوگ چرچا کریں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ساتھیوں پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ پھر آپ نے ان تمام منافقین کے نام ان دونوں حضرات کو بتا دیئے اور فرمایا کہ یہ بات پوشیدہ رکھنا۔

مسجد ضرار کی تعمیر:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک تشریف لے جا رہے تھے تو ذی اوان میں اترے' یہاں سے مدینہ ایک گھنٹہ کا راستہ ہے۔ اس وقت مسجد ضرار کے بنانے والے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور آپ تبوک جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انہوں نے عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے بیماروں اور بارش کی رات میں مجبوری کی وجہ سے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ دو رکعت نماز پڑھ کر اسے بابرکت فرما دیں۔ اس وقت آپ نے جواب دیا تھا کہ سفر درپیش ہے' پابرکاب ہو رہا ہوں۔ عدیم الفرصت ہوں' واپس آؤں گا تو یاد دلانا' انشاء اللہ تمہاری مسجد میں تمہاری خاطر نماز پڑھیں گے۔ لیکن واپسی میں مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی وحی الٰہی نے اس مسجد کی حقیقت کھول دی اور آپ نے مالک بن الدخشم اور معن بن عدی کو بلوایا اور حکم فرمایا کہ جلدی جاؤ اور اس مسجد کو منہدم کر ڈالو اور جلا دو' چنانچہ ان حضرات نے حکم کی تعمیل کی اور مسجد والے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یہ آیت نازل فرمائی :

﴿ وَٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُواْ مَسۡجِدٗا ضِرَارٗا وَكُفۡرٗا وَتَفۡرِيقَۢا بَيۡنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ﴾

[التوبة : ۱۰۷]

اور جن لوگوں نے ایک مسجد بنائی ضد پر اور کفر پر اور پھوٹ ڈالنے کے لئے مسلمانوں میں۔

مدینہ میں شاندار استقبال :

غزوہ تبوک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مظفر و منصور واپس ہوئے تھے۔ سفر لمبا تھا' خطرے بے شمار تھے' چنانچہ جب مدینہ منورہ کے قریب پہنچے اور شہر میں خوشخبری پہنچی تو لوگوں میں بے اندازہ مسرت تھی۔ ہر قسم کے مرد' عورتیں' بچے' بوڑھے سب کے سب استقبال کے لئے باہر نکل آئے۔ مدینے کی لڑکیوں نے ان اشعار کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاندار استقبال کیا :

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا   مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا   مَادَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ

بدر نے' ثنیات الوداع سے ہم پر طلوع کیا۔ ہمیشہ کے لئے اللہ کا شکر واجب ہو گیا' جب تک بلائے کوئی بلانے والا۔

ان اشعار کے بارے میں بعض راویوں کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ ان کی روایات میں ہے کہ یہ شعر اس وقت گائے گئے تھے' جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ پہنچے تھے۔ حالانکہ یہ صریح غلطی ہے' کیونکہ مقام "ثنیات الوداع" ملک شام کی طرف ہے نہ کہ مکہ سے مدینہ کے راستے میں۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے قریب ہوئے تو فرمایا کہ "یہ طیبہ ہے اور یہ احد کا پہاڑ ہے جو کہ ہمیں دوست رکھتا ہے اور ہم اسے دوست رکھتے ہیں"۔

داخل ہوتے ہی سب سے پہلے مسجد میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز ادا فرمائی' جو کہ آپ کی سنت طیبہ تھی۔ پھر لوگوں سے ملنے جلنے کے لئے بیٹھ گئے۔ جو لوگ اس غزوہ میں ساتھ نہیں گئے تھے' آ کر معذرت کرنے اور قسمیں کھانے لگے۔ ان لوگوں کی تعداد اسی کے قریب تھی۔ آپ نے بظاہر سب سے عذر قبول کر لئے اور باطن کا معاملہ علام الغیوب کے حوالہ کر دیا۔ ان حضرات کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی :

﴿ يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ ﴾ [التوبة : ٩٤]

آپ کی واپسی کے بعد وہ لوگ آپ کے پاس آ کر معذرت کرتے ہیں۔

فصل (۸۰)

غزوہ تبوک سے مستنبط احکام و مسائل

۱۔ اشہر الحرام میں قتال کرنا جائز ہے۔

۲۔ امام المسلمین کو چاہئے کہ مسلمانوں کو وہ چیزیں بتا دے جس کے چھپانے میں ان کا نقصان ہو' اور باقی مصلحت کے لئے چھپا لے۔

۳۔ جب امام المسلمین لوگوں کو نکلنے کا حکم دے تو سب کا نکلنا ضروری ہے' اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ امام کے اذن کے بغیر پیچھے رہ جائے' اور لشکر کے نکلنے سے متعلق یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو فردا فردا حکم دیا جائے۔ جہاد جن تین موقعوں پر فرض عین ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے' دوسرا جب دشمن شہر کا محاصرہ کرلے۔ تیسرا یہ کہ جب میدان جنگ میں صفیں جم جائیں۔

۴۔ جان کے ساتھ جہاد کرنے کی طرح مال و دولت سے بھی جہاد کرنا واجب ہے' اور یہی درست رائے ہے جس میں کچھ شبہ نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں جہاد بالنفس کے ساتھ ساتھ ہی جہاد بالمال کا ذکر کیا گیا ہے' بلکہ ایک جگہ کے علاوہ تمام مقامات پر جہاد بالمال کا ذکر جہاد بالنفس سے پہلے ہوا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاد بالمال جہاد بالنفس کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اور جب جسمانی طور پر حج سے مجبور شخص پر مالی حج واجب ہوتا ہے تو ایسی صورت میں مالی جہاد کا واجب ہونا اولی ہے۔

۵۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس غزوہ میں عظیم سرمایہ سے لشکر اسلام کی مدد کی اور تمام لوگوں پر سبقت حاصل کی۔

۶۔ غزوہ میں شرکت سے عاجز اور معذور وہ شخص ہے جو کوشش اور جد و جہد کے باوجود مال مہیا کرنے میں ناکام رہے۔ کیونکہ اللہ تعالی نے عاجز لوگوں سے حرج کی نفی اس وقت کی' جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے کہ آپ سواری کا انتظام کریں' پھر وہ روتے ہوئے واپس لوٹے۔

۷۔ جب امام سفر میں نکلے تو اپنا کوئی نائب مقرر کر دے تو اس کا حکم بھی مجاہدین کا ہو گا' کیونکہ دراصل مجاہدین کو اس سے تعاون مل رہا ہے۔

۸۔ قوم ثمود کے علاقہ میں کنوؤں سے پانی پینا' کھانا پکانا' آٹا گوندھنا' اور وضو کرنا جائز نہیں' البتہ بئرناقہ کے سوا دیگر مقامات سے چوپایوں کو پانی پلانا جائز ہے۔ بئرناقہ رسول اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں باقی تھا' اور آج تک صدیاں گذرنے کے بعد بھی معلوم و معروف ہے' سواروں کا قافلہ اس کے علاوہ کسی اور کنویں پر جاتا ہی نہیں۔

۹۔ جو کوئی ان علاقوں سے جہاں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا' گذرے تو وہ اس کے اندر داخل نہ ہو اور نہ وہاں پر قیام کرے۔ کپڑا لپیٹے ہوئے تیزی کے ساتھ اور حالت گریہ و زاری میں اور عبرت اندوز ہوتے ہوئے ایسے علاقہ سے گذر جائے۔

۱۰۔ حالت سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو نمازیں ایک ساتھ ادا فرماتے تھے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی جو حدیث اس واقعہ سے تعلق رکھتی ہے' اس میں ایک نماز کو مقدم کر کے ایک ساتھ دو نمازوں کے پڑھنے کا ذکر ہے۔ ہم اس کا سبب ذکر کر چکے ہیں۔ مقدم کر کے جمع کا ثبوت صرف اسی سفر میں ہے' اس طرح عرفہ میں داخل ہونے سے پہلے بھی جمع تقدیم کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۱۔ ریت سے تیمم کرنا جائز ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مدینہ اور تبوک کے ریگستانی علاقہ میں سفر طے کرتے تھے' اور اپنے ساتھ مٹی نہیں لے گئے تھے' اور پورے میدان میں کہیں پانی نہیں تھا۔ صحابہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیاس کی شدت کی شکایت بھی کی تھی۔

۱۲۔ تبوک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیس دن سے زیادہ قیام رہا اور آپ نمازوں میں قصر کرتے تھے مگر امت کو یہ حکم نہیں دیا کہ جب تم میں سے کوئی اس سے زیادہ قیام کرے تو قصر نہ کرے' بلکہ آپ کی یہ اقامت (اتنی مدت) رہی اور حالت سفر کی یہ اقامت سفر سے خارج نہیں' خواہ طویل ہو یا مختصر بشرطیکہ اس جگہ کو وطن نہ بنائے اور وہیں مقیم ہو جانے کا ارادہ بھی نہ رکھے۔

ابن المنذر فرماتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ مسافر کو اس بات کی اجازت ہے کہ جب تک وہ مدت مخصوص کے لیے اقامت کا ارادہ نہ کر لے قصر کرتا رہے' چاہے اس پر کئی سال گذر جائیں۔

۱۳۔ قسم کھانے والا اگر مصلحت اور بھلائی دیکھے تو اپنی قسم کا توڑنا اسے جائز بلکہ مستحب ہے' اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے۔ یہ بات اس کی صوابدید پر منحصر ہے کہ خواہ قسم توڑنے سے قبل کفارہ ادا کر دے یا

بعد میں، دونوں طرح ادا کر سکتا ہے۔

۱۴۔ حالت غصہ کی قسم معتبر سمجھی جائے گی، بشرطیکہ حالت غضب اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ قسم کھانے والا ہوش و حواس کھو چکا ہو، اور یہ نہ جانتا ہو کہ کیا کہہ رہا ہے تو ایسی شکل میں اس کے کوئی معاملات معتبر نہ سمجھے جائیں گے، اور ایسے شخص کی نہ قسم معتبر ہوگی اور نہ طلاق و عتاق قابل اعتبار ہو گا۔

۱۵۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کہ میں نے تمہاری طرف یہ تعاون سفر نہیں بھیجا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ارسال فرمایا ہے۔ ایسا کلام گاہے گاہے تسکین قلب کے لئے ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "خدا کی قسم میں نہ کسی کو کچھ دیتا ہوں اور نہ کسی سے کچھ روکتا ہوں، بلکہ میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں جہاں مجھے حکم ہوتا ہے وہاں رکھ دیتا ہوں"۔

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے اور حکم کے مطابق امور میں تصرف فرماتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ اگر آپ کو کسی امر کا حکم فرماتا، آپ اس کو نافذ کر دیتے کیونکہ اصل عطا کنندہ اور روکنے والا تو صرف اللہ ہی ہے۔

۱۶۔ اہل معاہدہ اور اہل ذمہ لوگ جب کسی ایسی حرکت کا ارتکاب کریں جس سے اسلام کو ضرر پہنچتا ہو تو ان کے مال و جان کی حفاظت سے متعلق کیا ہوا معاہدہ فوراً ختم ہو جائے گا، اور اگر امام اس کی جان و مال پر غلبہ حاصل کر سکے تو ان کی جان و مال ہر مسلمان کے لئے مباح ہے اور جو بھی اسے پکڑے گا، اس کی ملکیت سمجھی جائے گی۔ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایلہ کے ساتھ مصالحت میں فرمایا تھا۔

۱۷۔ رات کے وقت میت کو دفن کرنا جائز ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ذوالبجادین کو دفن کیا تھا، اگر کوئی ضرورت یا مخصوص مصلحت ہو تو ایسا کیا جائے گا۔

۱۸۔ امام المسلمین جب کوئی لشکر بھیجے اور اسے مال غنیمت یا قیدی حاصل ہوں یا کوئی قلعہ فتح ہو جائے تو خمس نکالنے کے بعد باقی سب کچھ اہل لشکر کا حق ہوگا، لیکن اگر جنگ کے دوران ـــ فوج کا ایک حصہ بطور سریہ بھیجا جائے اور فوج کی پشت پناہی کے بل پر اور اس کی قوت سے اسے کچھ حاصل ہو تو یہ خمس اور نفل نکالنے کے بعد سارا مال غنیمت فوج کا ہوگا، صرف اہل سریہ کا نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت طیبہ تھی۔

۱۹۔ آپ نے فرمایا تھا کہ مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تمہارے سفر اور ہر نقل و حرکت میں ساتھ ہوتے ہیں۔ اس سے قلبی اور ارادی معیت مراد ہے اور یہ جہاد بالقلب ہے۔ جہاد کے چار مراتب میں سے ایک یہ بھی ہے' اور بقیہ تین مراتب جہاد لسانی' جہاد مالی اور جہاد بدنی ہیں۔

۲۰۔ معصیت و گناہ کی جگہوں کو جلا دینا چاہئے۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ضرار کو جلا دینے کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح ہر ایسی جگہ کو جس کی صورت حال مسجد ضرار جیسی ہو' امام پر واجب ہے کہ اسے منہدم اور جلا کر ختم کر دے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم اس جگہ کی شکل و صورت بگاڑ کر ایسا بنا دینا چاہئے کہ وہاں معصیت کا کام انجام نہ پا سکے۔ جب مسجد ضرار کے متعلق یہ طرز عمل روا رکھا گیا تو مقامات شرک' شراب نوشی اور شراب سازی کے گھر' منکرات و فحاشی کے اڈوں کا حکم تو اس سے بھی زیادہ سخت ہونا چاہئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک پورا گاؤں ہی جلا دیا تھا' جس میں شراب کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس طرح رو یشد ثقفی کی شراب کی دوکان کو بھی نظر آتش کرا دیا تھا اور اسے فاسق و بدمعاش کے نام سے موسوم کیا تھا۔ حضرت سعد نے جب اپنے مکان پر عوام الناس سے حجاب اختیار کر لیا تو اسے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جلا دیا تھا۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تارکین جمعہ و جماعت کے گھروں کو جلا دینے کا ارادہ کر لیا تھا' لیکن عورتوں اور بچوں کی وجہ سے رک گئے کیونکہ ان پر مسجد میں جماعت کی حاضری واجب نہیں۔

۲۱۔ مسجد عبادت کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے وقف صحیح نہیں ہوگی۔ اس لئے اگر قبر پر مسجد بنائی جائے تو اسے ڈھا دینا چاہئے۔ اگر مسجد میں مردہ دفن کیا جائے تو اسے وہاں سے منتقل کر دینا چاہئے' کیونکہ اسلام میں مسجد اور قبر دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دونوں میں سے جو چیز بعد میں بنائی جائے' اسے ہٹانا ضروری ہے۔ اگر دونوں ایک ساتھ وجود میں آئیں تو دونوں ناجائز ہیں۔ ایسا وقف نہ صحیح ہے اور نہ جائز' نہ ایسی مسجد میں نماز صحیح ہوگی' کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے' اور قبر کو مسجد بنانے والے پر لعنت بھیجی ہے۔ یہ ہے دین اسلام کی صحیح تعلیمات' جسے اللہ کے رسول لے کر آئے تھے' لیکن آج اس دین کی اجنبیت سب کے سامنے ہے۔

فصل (۸۱)

حضرت کعب بن مالک اور ان کے رفقاء کا واقعہ

غزوہ تبوک سے پیچھے رہنے والے تین صحابیوں' حضرت کعب بن مالک' ہلال بن امیہ' اور مرارہ بن ربیع' جن کے ناموں کے ابتدائی حروف کا مجموعی کلمہ "مکہ" بنتا ہے اور ان کے ناموں کے آخری حروف کا مجموعی کلمہ "عکہ" بنتا ہے' حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی غزوہ فرمایا میں ان میں کبھی پیچھے نہیں رہا' ہاں غزوہ بدر میں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہ ہو سکا اور غزوہ بدر میں جو لوگ شریک نہیں ہوئے' ان پر اللہ اور رسول کا کوئی عتاب نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غزوہ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف قریش کے قافلے کے ارادے سے نکلے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ اور آپ کے دشمنوں کو بغیر کسی وقت اور جگہ کے تعین کئے جمع کر دیا (اس طرح ان میں جنگ واقع ہو گئی) اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقبہ میں شریک ہوا' جب اسلام پر ہم سب نے عہد کیا تھا' غزوہ بدر کو عقبہ پر ترجیح نہیں دیتا تھا' اگرچہ غزوہ بدر نے زیادہ شہرت پائی۔

جس وقت میں غزوہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک غزوہ نہیں ہوا' اس وقت میں مالی طور پر اتنا مستحکم اور فارغ البال تھا کہ اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ اللہ کی قسم! میرے پاس کبھی دو اونٹنیاں نہیں رہیں' مگر اس غزوہ کے وقت میرے پاس ایک ساتھ دو اونٹنیاں تھیں۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپ کسی غزوے کا ارادہ فرماتے تو اسے مخفی رکھ کر دوسرے رخ کا اظہار فرماتے تھے' مگر اس غزوہ میں آپ نے ایسا نہیں کیا' کیونکہ یہ غزوہ آپ نے سخت گرمی میں کرنا چاہا اور ایک طویل سفر درپیش تھا۔ دشمنوں کی کثیر تعداد سے مقابلہ تھا۔ اس لئے آپ نے لوگوں کے سامنے یہ معاملہ واضح طور پر بیان فرما دیا' تاکہ اس کے لئے وہ اچھی طرح تیاری کر لیں اور آپ کو جس رخ پر چلنا تھا' اسے بھی صاف صاف بتا دیا تھا۔ اور جو مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ جا رہے تھے' وہ بے شمار تھے' جن کی فہرست تیار نہیں کی جا سکتی تھی اور جس آدمی نے بھی اس جنگ سے غائب ہو جانے کا ارادہ کیا' وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس میں غیر حاضر ہو جانا ایک امر مخفی ہو گا۔ سوائے اس کے کہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہو جائے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ کا ارادہ اس وقت فرمایا' جب پھل درختوں پر خوب پک چکے تھے' اور لوگوں کو اس کے سائے میں وقت گذارنا مرغوب تھا۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری شروع کی اور آپ کے ساتھ لوگوں نے بھی تیاریاں شروع کر دیں اور میں روزانہ اس ارادہ سے نکلتا کہ سفر کا ضروری سامان لے لوں اور ان کے ساتھ روانہ ہو جاؤں۔ لیکن بغیر کچھ کئے واپس آ جاتا۔ پھر میں اپنے دل میں کہتا کہ مجھے وقت کیا ہے' جب چاہوں گا' لے لوں گا (پیسے میرے پاس ہیں' سامان بازار میں موجود ہے) میں اسی لیت و لعل میں رہا کہ کوچ کی گھڑی آ گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان روانہ ہو گئے اور میں نے ابھی تک کچھ سامان تیار نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا چلو' میں آپ کی روانگی کے ایک دو دن بعد ہی روانہ ہو جاؤں گا اور راستہ میں قافلہ سے جا ملوں گا۔ ان سب کی روانگی کے بعد بھی میں سامان تیار کرنے کے لئے نکلا لیکن پھر بھی کچھ کئے بغیر واپس آ گیا۔ دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ مجھ پر ایسی ہی نیستی طاری رہی اور انہوں نے اپنے قدم تیز کر دیئے اور لڑائی کا معاملہ بہت آگے نکل گیا۔ میں نے اس کے بعد بھی ارادہ کیا کہ اب بھی مدینہ سے روانہ ہو کر ان کو پا لوں گا۔ کاش! میں نے ایسا ہی کیا ہوتا لیکن مجھے اس کی بھی توفیق نہ ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد جب میں باہر نکلتا اور لوگوں میں گھومتا تو مجھے اس بات سے بڑا رنج ہوتا کہ میں یہاں یا تو وہ لوگ دیکھتا ہوں جو نفاق کے لئے مطعون و متہم ہیں یا وہ آدمی دیکھتا ہوں جنہیں معذور سمجھا گیا ہے اور ضعفاء میں سے ہیں۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مجھے اس وقت یاد نہ فرمایا جب تک تبوک نہ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچنے کے بعد آپ لوگوں میں تشریف فرما تھے کہ آپ نے فرمایا : "کعب بن مالک نے کیا کیا"؟ بنو سلمہ کے ایک شخص نے کہا : "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ان دھاری والی چادروں اور خود بینی نے روک لیا"۔ اس پر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بولے : تم نے بہت بری بات کہی! یا رسول اللہ! اللہ کی قسم ہم نے ان سے خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ آپ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لا رہے ہیں تو مجھ پر حزن و ملال

طاری ہونے لگا۔ اب میں اس فکر میں لگ گیا کہ کونسا غلط عذر پیش کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی سے کسی طرح بچ سکوں گا اور اس سلسلہ میں اپنے اہل خانہ کے ذی رائے لوگوں سے بھی مدد لی۔ پھر جب معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بالکل قریب تشریف لا چکے ہیں تو مجھ سے باطل زائل ہو گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ سچائی کے علاوہ کوئی راہ نجات نہیں اور پختہ ارادہ کر لیا کہ میں سچ سچ کہہ دوں گا۔

آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت مدینہ منورہ میں داخل ہو گئے۔ آپ کا معمول تھا کہ آپ سفر سے تشریف لاتے تو پہلے مسجد میں حاضر ہو کر دو رکعت نماز پڑھتے اور اس سے فارغ ہو کر وہیں بیٹھ کر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی آپ نے ایسا ہی کیا' اس نشست کے دوران غزوہ میں پیچھے رہنے والے لوگ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور قسمیں کھا کھا کر آپ سے اپنے لئے عذر بیان کرنے لگے۔ یہ کوئی اسی سے اوپر افراد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ظاہری باتوں کو قبول فرما لیا۔ ان سے بیعت لی اور ان کے لئے مغفرت طلب فرمائی۔ ان کے بھیدوں اور دلی رازوں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا۔

میں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام عرض کیا۔ جب میں نے آپ کو سلام کیا تو آپ نے خفگی کی مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا' پھر فرمایا : آؤ' میں آگے بڑھا اور آپ کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے مجھ سے پوچھا' تم کس وجہ سے پیچھے رہ گئے؟ کیا تم نے اپنی سواری نہیں خریدی تھی۔ میں نے کہا جی ہاں' بخدا ایسا ہی ہے' خدا کی قسم اگر میں آپ کے بجائے اس وقت اہل دنیا میں سے کسی شخص کے پاس ہوتا تو میں سمجھتا کہ کچھ عذر کر کے اس کی ناراضگی سے بچ جاؤں گا۔ میرے اندر بات کرنے اور اپنی بات ثابت کرنے کا سلیقہ بھی ہے' لیکن بخدا مجھے یقین ہے کہ میں اگر آج جھوٹ بول کر آپ کو راضی کر لوں گا تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ سے ناراض کر دے۔ اور اگر میں سچ بول کر آپ کو کسی قدر افسردہ کروں گا تو اس میں مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کی امید ہے۔ خدا کی قسم میرے پاس کوئی عذر نہیں ہے اور خدا کی قسم جس وقت میں پیچھے رہ گیا تھا' اس سے زیادہ میں کبھی صحت مند اور فارغ البال نہ تھا۔

میری گفتگو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے' تم نے سچ کہا' بہر حال اب تم جاؤ اور دیکھو اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہے"۔ پھر میں اٹھ کر چلنے

لگا' میرے ساتھ بنو سلمہ کے کچھ لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے پیچھے پیچھے چلے۔ انہوں نے مجھ سے کہا : خدا کی قسم! ہمیں نہیں معلوم ہوا کہ اس سے پہلے تم نے کوئی گناہ کیا ہے اور تم اس بات سے قاصر رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عذر پیش کر دیتے' جیسا کہ اور پیچھے رہنے والوں نے عذر پیش کیا تھا۔ تمہارے گناہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کافی ہو جاتا۔

بنو سلمہ کے یہ لوگ برابر مجھ سے یہ کہتے رہے' یہاں تک کہ میں نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں۔ پھر اپنے آپ کو جھٹلا دوں' لیکن میں نے ان لوگوں سے پوچھا' کیا میرے علاوہ بھی کوئی آدمی ان حالات سے دوچار ہوا ہے؟ انہوں نے کہا : ہاں دو آدمی تھے' جنہوں نے تمہاری طرح گفتگو کی ہے اور ان سے بھی وہی کہا گیا جو تم سے کہا گیا۔ میں نے پوچھا' وہ دو آدمی کون ہیں' انہوں نے بتایا کہ قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے مرارہ بن ربیع اور ہلال ابن امیہ واقفی ہیں۔ بہرحال انہوں نے مجھ سے ان دو بزرگوں کا ذکر کیا جن کا عمل نمونہ کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ دونوں حضرات غزوہ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے۔ ان کا ذکر سن کر میں خاموش ہو گیا اور اپنی راہ اختیار کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ہم تینوں سے کلام کرنے سے منع فرما دیا تھا' چنانچہ لوگوں نے ہم سے کترانا شروع کر دیا۔ سب ہمارے لئے بدل چکے تھے' یہاں تک کہ ہمارے لئے یہ سرزمین بالکل اجنبی ہو گئی اور میں خود اپنے لئے اجنبی ہو گیا۔ وہ زمین ہی نہ تھی جسے میں جانتا اور پہچانتا تھا۔

اس کیفیت و حالت میں پچاس راتیں گذر گئیں۔ رہے میرے دو اور ساتھی تو وہ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے اور روتے رہے' اور میرا معاملہ یہ تھا کہ میں نسبتاً نوعمر اور جری تھا اس لئے میں باہر نکلتا' مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا اور بازاروں میں گھومتا مگر مجھ سے کوئی بات نہ کرتا تھا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد تشریف فرما ہوتے تھے اور سلام کرتا' دل میں سوچتا اور دیکھتا کہ آیا میرے سلام کا جواب دینے کے لئے آپ نے ہونٹوں کو ہلایا یا نہیں' پھر میں آپ کے قریب ہی نماز پڑھتا اور آپ کی طرف چور نگاہوں سے دیکھتا تھا' جب نماز میں مصروف ہو جاتا تو آپ میری طرف نگاہ ڈالتے تھے اور جب میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا تو اعراض فرما لیتے' یہاں تک کہ جب مسلمانوں کی یہ سرد مہری میرے لئے بہت طویل ہو گئی تو میں گیا اور ابو قتادہ کے باغ کی دیوار پر چڑھ گیا۔ ابو قتادہ میرے چچازاد بھائی اور سب سے زیادہ عزیز تھے' میں نے انہیں سلام کیا مگر واللہ انہوں نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے کہا : ابو قتادہ ! میں تم کو

اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں' کیا تم جانتے ہو کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ اس پر بھی وہ خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ یہی بات کہی اور ان کو اللہ کا واسطہ دیا۔ وہ خاموش رہے۔ پھر اتنا کہا کہ «اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ» یعنی اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔

اس پر میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ میں اسی وقت مڑا اور دیوار پھاند کر واپس چلا گیا۔ پھر میں صبح کے وقت بازار آیا' بازار میں چلا جا رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نبطی جو شامی تھا' اور ان لوگوں میں سے تھا جو مدینہ آکر گندم بیچتے تھے' میرے متعلق پوچھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ کعب بن مالک کا پتہ بتانے والا کوئی ہے۔ تو لوگ میری طرف اشارہ کر کے اسے بتانے لگے' وہ میرے پاس آیا اور شاہ غسان کا ایک خط دیا' جس کا مضمون یہ تھا :

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تمہارے ساتھ جفا کا معاملہ کیا ہے۔ اللہ نے تمہارے لئے ذلت اور ضائع ہونے کی جگہ مقدر نہیں کی ہے۔ تم ہمارے پاس آجاؤ ہم تمہارے ساتھ اچھا معاملہ کریں گے"۔

جب میں نے یہ خط پڑھا تو سوچا کہ یہ بھی ایک مصیبت اور آزمائش ہے۔ میں جس گردش میں پڑا ہوں اس نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا اور اس کے بعد ایک تنور کے پاس گیا اور خط اس میں پھینک دیا۔ بہرحال میں اسی حالت پر قائم رہا تا آنکہ جب پچاس راتوں میں سے چالیس گذر گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد میرے پاس آرہا ہے۔ اس نے آکر کہا : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرلو۔ میں نے پوچھا : بیوی کو طلاق دے دوں۔ کہا : نہیں بلکہ اس سے الگ رہو' اور اس کے قریب مت جاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد نے میرے دونوں ساتھیوں کو بھی یہی پیغام پہنچایا۔ پھر میں نے اپنی بیوی سے جا کر کہا! "تم اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ اور انہی کے پاس اس وقت تک رہو' جب تک اللہ تعالیٰ فیصلہ نہ کردے' جو اس معاملہ میں کرنے والا ہے"۔

حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ : ہلال بن امیہ کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں اور عرض کیا : "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہلال بالکل بوڑھے آدمی ہیں' ان کے پاس کوئی خادم بھی نہیں۔ کیا آپ ناپسند فرمائیں گے کہ میں ان کی خدمت کر دیا کروں۔ آپ نے فرمایا : نہیں نہیں' لیکن وہ تم سے قریب نہ ہوں۔ (خدمت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں)۔ بیوی

بولیں' خدا کی قسم' جب سے ان کا یہ معاملہ ہوا ہے' برابر روتے رہتے ہیں اور آج بھی رو رہے ہیں اور مجھے تو ان کی بصارت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ حضرت کعب بن مالک کا آگے بیان ہے کہ :

پھر مجھ سے میرے بعض اہل خانہ نے کہا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تم بھی اپنی بیوی کے لئے اجازت حاصل کر لیتے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال ابن امیہ کی بیوی کو ان کی خدمت کے لئے اجازت دے دی ہے۔ میں نے کہا' میں آپ سے اپنی بیوی کے لئے اجازت نہیں مانگوں گا۔ نہیں معلوم کہ آپ مجھ سے اس کے بارے میں کیا فرمائیں' پھر میں جوان آدمی ہوں۔ اس کے بعد ہم لوگ دس روز تک اسی حالت پر رہے اور پچاس دن مکمل ہو گئے۔ اس وقت سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ہم سے کلام کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ پھر میں نے اپنے گھر کی چھت پر پچاسویں رات کی صبح کی نماز اس حالت میں پڑھی جس کی کیفیت اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمائی ہے :

﴿ ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ﴾ [التوبة : ١١٨]

زمین باوجود وسیع ہونے کے ان پر تنگ ہو گئی تھی۔

اور میرا دم گھٹ رہا تھا کہ جبل سلع کے اوپر سے آواز لگانے والے کی بھرپور آواز سنی' وہ کہہ رہا تھا' "یا کعب بن مالک ابشر" کعب بن مالک! تیرے لئے خوشخبری ہے۔ یہ آواز سن کر میں سجدے میں گر گیا' کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ کشادگی آگئی ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ مزید بیان کرتے ہیں کہ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت صبح کی نماز پڑھی اس وقت لوگوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم تینوں آدمیوں کی معافی ہو گئی ہے۔

یہ خوشخبری سن کر لوگ' ہمیں بشارت دینے کے لئے دوڑ پڑے' اس طرح بشارت دینے والے دوڑ کر ہمارے دونوں ساتھیوں کی طرف بھی گئے۔ ایک آدمی نے میرے پاس آنے کے لئے اپنا گھوڑا استعمال کیا اور بنو اسلم کے ایک آدمی دوڑتے دوڑتے پہاڑ پر چڑھ گیا (اور وہاں سے آواز دی کہ بخشش ہو گئی ہے) اس لئے اس کی آواز اس کے گھوڑے سے پہلے میرے پاس پہنچ گئی۔ پھر جب وہ شخص جس کی آواز میں نے سنی تھی' بشارت دیتا ہوا میرے پاس پہنچا تو میں مارے خوشی کے اپنے دونوں کپڑے اتارے اور اسے پہنا دیئے۔ خدا کی قسم! اس دن ان دونوں کپڑوں کے سوا اور کوئی کپڑا میری ملکیت میں نہ تھا۔ اس لئے میں نے خود اپنے لئے دو کپڑے مستعار لئے اور پہن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

حاضر ہونے کے ارادے سے چل دیا۔ اس وقت لوگ مجھے معافی کی خوشخبری دے رہے تھے' کہتے تھے' اللہ کی طرف سے معافی مبارک ہو۔ بہرحال میں جاکر مسجد میں داخل ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور آپ کے اردگرد لوگ حاضر تھے۔ مجھے دیکھ کر حضرت طلحہ بن عبداللہ کھڑے ہو گئے' سلام کیا' مبارکباد دی' اور خدا کی قسم! مہاجرین میں ان کے سوا اور کوئی بھی میرے لئے کھڑا نہیں ہوا۔ میں حضرت طلحہ کی یہ بات نہیں بھولتا۔

جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو اس وقت آپ کا چہرہ مبارک خوشی سے چمک رہا تھا۔ آپ نے فرمایا "جب سے تمہاری ماں نے تمہیں جنم دیا ہے اس دن سے جتنے دن گذرے ہیں' ان میں سے سب سے بہتر دن کی خوشخبری تمہیں دیتا ہوں۔ میں نے عرض کیا : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ آپ کی جانب سے ہے یا اللہ کی جانب سے؟ آپ نے فرمایا : اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ بشارت ہے"۔

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دے رہے تھے' اس وقت آپ کا چہرہ مبارک چاند کا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا' اور ہم آپ کی یہ چیز پہچانتے تھے۔ جب میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا تو عرض کیا : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' اللہ سے میری توبہ اور میری معافی کا ایک حصہ یہ ہے کہ میں اللہ اور رسول کے لئے صدقہ کرتے ہوئے اپنے مال و جائداد سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ آپ نے فرمایا : "اپنی کچھ جائداد اپنے لئے روک لو' تمہارے لئے یہی بہتر ہے"۔ میں نے عرض کیا : خیبر میں جو میرا حصہ ہے' اسے میں روک لیتا ہوں یا رسول اللہ سچائی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے نجات دی۔ اللہ سے میری توبہ کا یہ اثر ہونا چاہئے کہ جب تک میں زندہ رہوں' سچ ہی بولتا رہوں۔

حضرت کعب بن مالک مزید فرماتے ہیں کہ : جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس چیز کا ذکر کیا' اس وقت سے خدا کی قسم! کسی بھی ایسے آدمی کو جسے سچائی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آزمائش میں ڈالا ہو' میں نے اپنے سے افضل نہیں پایا۔ خدا کی قسم! جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا' اس وقت سے آج کے دن تک ایک مرتبہ بھی جھوٹ بولنے کا ارادہ نہیں کیا' اور مجھے قوی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ بقیہ زندگی میں بھی مجھے اس (جھوٹ) سے محفوظ رکھے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے متعلق یہ آیات نازل فرمائیں :

﴿ لَقَد تَّابَ ٱللَّهُ عَلَى ٱلنَّبِيِّ وَٱلْمُهَـٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ ٱلْعُسْرَةِ مِنۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّهُۥ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ وَعَلَى ٱلثَّلَـٰثَةِ ٱلَّذِينَ خُلِّفُوا۟ حَتَّىٰٓ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ ٱلْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوٓا۟ أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ ٱللَّهِ إِلَّآ إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوٓا۟ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ۝ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَكُونُوا۟ مَعَ ٱلصَّـٰدِقِينَ ﴾

[التوبة : ۱۱۷-۱۱۹]

بیشک اللہ نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین اور انصار پر جو باوجود اس کے کہ ان میں سے بعضوں کے دل پھر جانے کو تھے مشکل کی گھڑی میں پیغمبر کے ساتھ رہے' پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مہربانی فرمائی' بے شک وہ ان پر نہایت شفقت کرنے والا اور مہربان ہے۔ اور تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا' یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہو گئیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ کے سوا کوئی پناہ نہیں' پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں' بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

حضرت کعب بن مالک مزید فرماتے ہیں کہ : خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے جب سے مجھے اسلام کے سیدھے راستے پر لگایا ہے ایسی نعمت سے کبھی سرفراز نہیں فرمایا جو میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچ بولنے کی نعمت سے بڑی ہو۔ میں اس وقت بالکل جھوٹ نہیں بولا' ورنہ اسی طرح ہلاک ہو جاتا' جس طرح وہ لوگ ہو گئے جنہوں نے جھوٹ بولا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں جو وحی نازل فرمائی تو جھوٹ بولنے والوں کے لئے اتنے سخت الفاظ فرمائے کہ اس سے سخت الفاظ کسی کے لئے نہیں فرمائے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

﴿ سَيَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ لَكُمْ إِذَا ٱنقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا۟ عَنْهُمْ ۖ فَأَعْرِضُوا۟ عَنْهُمْ ۖ إِنَّهُمْ رِجْسٌ ۖ وَمَأْوَىٰهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ۝ يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا۟ عَنْهُمْ ۖ فَإِن تَرْضَوْا۟ عَنْهُمْ فَإِنَّ ٱللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ ٱلْقَوْمِ ٱلْفَـٰسِقِينَ ﴾ [التوبة : ۹۵، ۹۶]

یہ سب تمہارے سامنے آ آکر اللہ کی قسمیں کھائیں گے (کہ ہم معذور تھے) جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے تاکہ تم انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دو۔ یہ لوگ بالکل گندے ہیں (انہوں نے نفاق و خلاف کرکے) جو کرتوت کیئے ہیں' ان کے بدلے میں ان کا ٹھکانا جہنم ہی ہے۔ یہ تمہارے سامنے اس لئے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو گئے تو اللہ تعالیٰ اس سرکش قوم سے راضی نہ ہو گا۔

فصل (۸۲)

واقعہ حضرت کعب سے مستنبط احکام و فوائد

واضح رہے کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ حدیث سے مندرجہ ذیل احکام و فوائد کا علم ہوتا ہے :

۱- کسی مسلمان کی غیبت کرنے والے کی تردید کرنا مستحب ہے' جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کیا۔

۲- سچائی کا دامن نہ چھوڑنا' اگرچہ مشکلات سے دوچار ہونا پڑے' کیونکہ سچائی کا انجام بھلائی اور بہتری ہوتا ہے۔

۳- سفر سے واپسی پر سب سے پہلے مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرنا مستحب ہے۔

۴- سفر سے لوٹ کر واپس آنے والے کے لئے بوقت ضرورت مستحب ہے کہ کسی کھلی جگہ پر یا مسجد میں لوگوں سے ملاقات کرے۔

۵- انسان کی ظاہری حالات کی بنیاد پر احکام شریعت نافذ ہوتے ہیں اور باطنی کیفیات کا حال اللہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

۶- اہل بدعت اور اعلانیہ طور پر گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں سے قطع تعلق کرنا اور ان سے سلام و کلام بند کر دینا جائز ہے' تاکہ دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو۔

۷- کسی گناہ کے ارتکاب کے بعد بطور حسرت و ندامت رونا مستحب بلکہ ضروری ہے۔

۸- مصلحتاً کسی ایسے کاغذ یا مکتوب کا جلا دینا جائز ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا نام ہو' جیسا کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔

۹- طلاق کنایہ' جیسے بیوی سے یہ کہنا کہ اپنے میکے چلی جاؤ بغیر نیت واقع نہیں ہوتی۔

۱۰- عورت اپنے شوہر کی خدمت کر سکتی ہے' لیکن یہ اس کے ذمہ واجب یا لازم نہیں ہے۔

۱۱- کسی نعمت کے حصول کے وقت سجدہ شکر ادا کرنا مستحب ہے' اسی طرح کسی مصیبت کے ٹلنے پر سجدہ

شکر ادا کرنا اور صدقہ و خیرات کرنا بھی مستحب ہے۔

۱۲۔ کسی کو خوشخبری اور مبارکباد پیش کرنا' اور اس کے دینے والے کو بطور انعام کپڑا یا کچھ اور دینا مستحب ہے۔

۱۳۔ کسی معزز و مکرم شخص کی تکریم میں کھڑے ہو کر استقبال کرنا مستحب ہے' اور اس سے کسی کو مسرت و خوشی ہو تو یہ بھی درست ہے' جیسا کہ حضرت کعب کو حضرت طلحہ کے کھڑے ہونے سے ہوئی تھی۔

یہ عمل اس حدیث کے خلاف نہیں کہ "جو لوگوں کے کھڑے ہونے سے خوش ہو' وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے" کیونکہ یہ وعید متکبرین اور ان لوگوں کے لئے ہے جو کھڑے نہ ہونے پر غصہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کو دیکھ کر مارے خوشی کے کھڑے ہو جاتے تھے اور حضرت فاطمہ آپ کو دیکھ کر احتراما کھڑی ہو جایا کرتی تھیں۔

یہی حکم ہر اس قیام کا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور کسی اسلامی بھائی سے اللہ تعالیٰ کی نعمت پر خوشی حاصل ہو۔ اور اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۱۴۔ انسان اپنی خوبیوں کی تعریف کر سکتا ہے' بشرطیکہ فخر و غرور کے لئے نہ ہو۔

۱۵۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں فوج کے لئے کوئی دیوان "دفتر رجسٹر" نہ تھا یہ طریقہ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جاری فرمایا۔

۱۶۔ عقبہ کی حیثیت سارے واقعات سے زیادہ افضل اور اہم ہے۔

۱۷۔ جب کسی شخص کو اگر عبادت اور تقرب الی اللہ کا موقع نصیب ہو تو اسے پورے شوق و ذوق و احتیاط سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے' کیونکہ عزم و ارادہ جلد کمزور پڑ جاتے ہیں اور اس میں استقامت کم ہی میسر ہوتی ہے۔ اگر کسی کو نیکی کا موقع ملے اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے تو بطور سزا کے اللہ تعالیٰ اس کے اور اس کے قلب و ارادہ کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے کہ :

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسْتَجِيبُواْ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ ﴾ [الأنفال: ٢٤]

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو' جب وہ تم کو تمہاری زندگی کے لئے پکارتے ہیں اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔

اور فرمایا :

﴿ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ ﴾ [الأنعام: ١١٠]

ہم ان کے دلوں کو پلٹ دیتے ہیں۔

اس کی وضاحت ایک دوسری آیت میں فرمائی ہے:

﴿ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ ﴾ [الصف: ٥]

پھر جب وہ ٹیڑھے ہوتے گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔

مزید فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ لَهُم مَّا يَتَّقُونَ ﴾

[التوبة: ١١٥]

اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ کسی قوم کو ہدایت کے بعد گمراہ کر دے جب تک ان کو ان امور سے اطلاع نہ دے جن سے ان کو بچنا ہو۔

اس طرح کا مضمون قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے۔

۱۸- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر سے پیچھے وہی لوگ رہ جاتے تھے جو منافق ہوتے یا معذور اور کسی کام پر مامور ہوتے تھے۔

۱۹- امام المسلمین کو چاہئے کہ وہ ایسے لوگوں کو آزاد ہرگز نہ رہنے دے جو اس سے (غزوات) میں پیچھے رہ جائیں' بلکہ ان سے باز پرس اور محاسبہ کرے تاکہ وہ اطاعت کریں' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب کے متعلق پوچھا تھا "کعب کا کیا حال ہے" ان کے متعلق سوال ان کی اصلاح کی غرض سے تھا اور دوسرے منافقین کا ذکر نا قابل التفات سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔

۲۰- اللہ اور رسول کی خاطر گمان غالب اور صوابدید کی بنیاد پر کسی پر طعن و تنقید کیا جا سکتا ہے' محدثین نے اسی کی بنیاد پر راویوں کے متعلق جرح و تعدیل کی ہے' اور علماء اہل سنت نے اہل بدعت پر تنقید و تردید کی ہے۔

۲۱- مذکورہ بالا اصول کی بنیاد پر تنقید کرنے والے کی تردید بھی جائز ہے' جبکہ تردید کرنے والے کو یقین ہو کہ تنقید کرنے والا غلطی پر ہے' جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں تنقید کرنے والے کی تردید کی اور آپ نے اس پر خاموشی اختیار فرمائی اور کوئی نکیر نہیں کی۔

۲۲- سفر سے واپس آنے کے لئے مسنون ہے کہ شہر میں باوضو داخل ہو اور اپنے گھر جانے سے قبل دو

رکعت مسجد میں نماز ادا کرے۔

۲۳۔ امام و حاکم کو چاہئے کہ وہ ایسے شخص کے سلام کا جواب تادیبانہ دے جو اسلام میں کوئی بدعت ایجاد کرے تاکہ دوسروں کو بھی زجر و توبیخ ہو۔

۲۴۔ امام و حاکم اپنے ساتھیوں و عزیزوں سے محاسبہ کر سکتا ہے' چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین صحابہ سے مواخذہ کیا اور ان کے علاوہ اور کسی سے ایسا معاملہ نہیں فرمایا۔ احباب کے عتاب اور اس سے لطف اندوزی کے واقعات بہت ہیں پھر اس عتاب و مواخذہ کے لطف اندوزی و کیف و سرور کا کیا پوچھنا جو کہ حبیب اللہ اور محبوب کائنات کی طرف سے ہو' جو کہ سراسر سبق آموز اور فائدہ مند ہو۔

تینوں صحابہ کو مختلف قسم کی مسرتیں حاصل ہونا رضاء الٰہی کی مسرت ' شرف قبولیت کی لذت اور انعام و اکرام کی خلعتوں سے جس طرح نوازا گیا' اس کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔

۲۵۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کعب اور ان کے دونوں ساتھیوں کو ان کی سچائی کی وجہ سے توفیق دی اور انہیں جھوٹے اور ناحق عذر سے بچالیا کہ ان سے تھوڑی دیر کے لئے دنیا تو سدھر جاتی ہے لیکن عاقبت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی ہے۔ سچے لوگ دنیا میں کچھ تکلیف تو ضرور اٹھاتے ہیں لیکن آخرت سنور جاتی ہے۔ دنیا و آخرت کا معاملہ اسی پر قائم ہے۔ ابتداء کار کی تلخی انتہاء میں حلاوت پیدا کرتی ہے اور ابتداء کی حلاوت سے انجام تلخ ہوتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ ان تمام لوگوں میں سے جو غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے صرف ان تینوں ہی سے ممانعت کلام کا فرمان صادر کیا تھا' اس لئے یہ ان کے صدق و صفا اور باقی لوگوں کے جھوٹ کی دلیل و علامت ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صادقین سے ان کی غلطی کے باعث تادیب کے لئے وقتی علیحدگی اختیار فرمائی اور جو منافقین تھے' ان کے حق میں یہ علاج کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہوں کی سزا پر ایسا ہی کرتا ہے' چنانچہ بندہ مومن جس سے وہ محبت رکھتا ہے' ادنیٰ و معمولی سی غلطی اور لغزش پر گرفت کرتا ہے تاکہ وہ مسلسل ہوشیار اور چوکنا رہے اور اگر کوئی بندہ اس کی نگاہوں سے گر جاتا ہے اور ذلیل ہو جاتا ہے تو پھر اسے گناہوں پر آزاد چھوڑ دیتا ہے اور جیسے جیسے وہ گناہ کرتا ہے' اس پر انعامات میں اضافہ کرتا ہے۔

۲۶۔ حضرت کعب نے فرمایا تھا کہ "میں ابو قتادہ کے باغ کی دیوار پھاند کر اندر گیا تھا" اس سے یہ ثابت

ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ساتھی اور پڑوس کے گھر بغیر اجازت اندر داخل ہو سکتا ہے بشرطیکہ اسے اس کی رضامندی کا علم ہو۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان تینوں صحابیوں کو اپنی بیویوں سے علیحدگی کا حکم فرمایا تو ایک طرح سے کامیابی کی خوشخبری تھی۔ اس بہانے ان سے گفتگو کی گئی اور وقتی علیحدگی کا حکم دیا۔

۲۷۔ حضرت کعب بن مالک کے یہ الفاظ "اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ" اس بات کی دلیل ہیں کہ ان جیسے کنایتی الفاظ سے اس وقت تک طلاق واقع نہیں ہوتی جب تک نیت نہ کی جائے۔

۲۸۔ بشارت دینے والے کی بشارت پر حضرت کعب رضی اللہ علیہ کا سجدہ کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان صحابہ کی عادت جمیلہ تھی اور یہ سجدہ شر کے دور ہونے اور نعمت کے حصول پر بطور سجدہ شکر کے مستحب تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حضرت جبریل نے یہ خوشخبری سنائی کہ جو شخص آپ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ دس مرتبہ رحمت نازل فرمائے گا تو آپ نے سجدہ شکر ادا کیا تھا۔ اسی طرح امت کے حق میں شفاعت کی قبولیت پر بھی آپ نے شکرانہ کا سجدہ کیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی سجدہ شکر ادا کیا جب انہیں مسیلمہ کذاب کے قتل ہونے کی خبر ملی' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا ذوالثدیہ خوارج کے ساتھ جنگ میں مقتولین میں سے ملا ہے تو انہوں نے بھی سجدہ شکر ادا کیا۔

۲۹۔ حضرت کعب بن مالک کو خوشخبری دینے والے کا گھوڑے پر سوار ہو کر جلدی پہنچنا اور دوسرے کا پہاڑی پر جلدی سے چڑھ کر توبہ کی قبولیت کا اعلان مسرت سنانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں اخوت و محبت اور باہمی خیر خواہی بدرجہ اتم موجود تھی اور ایک دوسرے کی مسرتوں میں بھرپور شرکت کرتے تھے اور حقیقی خوشی محسوس کرتے تھے۔

۳۰۔ حضرت کعب بن مالک کا خوشخبری دینے والے کو عطیہ دینا اس بات کی دلیل ہے کہ بشارت دینے والوں کو عطیہ دینا اخلاق کریمانہ کی علامت ہے نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مبشر کو تمام کپڑے دے دینا جائز ہے اور کسی دینی یا دنیوی نعمت کے حصول پر مبارکباد دینا مستحب ہے۔ اس کے استقبال میں اٹھنا اور مصافحہ کرنا بھی سنت ہے۔ مبارکباد دینے والے کو یہ الفاظ کہنا چاہیے۔ اللہ کا عطیہ مبارک ہو' اللہ کا احسان مبارک ہو۔ اس میں نعمت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور ساتھ ہی یہ دعا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے مبارک بنائے۔

۳۱۔ انسان کا سب سے بہترین دن وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرے۔ توبہ کی قبولیت پر نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خوشی اور اطمینان کا اظہار فرمایا اس سے امت پر آپ کے کمال شفقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۲- توبہ کی قبولیت پر بطور شکر حسب استطاعت صدقہ کرنا مستحب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی "کچھ مال اپنے لئے روک لو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کوئی اپنے تمام مال کے صدقہ کر دینے کی نذر مان لے' اس پر تمام مال خرچ کرنا واجب نہیں' بلکہ اس کے لئے کچھ حصہ رکھ لینا جائز ہے۔ اسی طرح اس سے سچائی کی عظمت اور اس پر دونوں جہاں کی سعادت کے دارو مدار کا پتہ چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو صرف دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک سعداء' یعنی مومن اور سچے لوگ' اور دوسرے اشقیاء یعنی جھوٹے لوگ اور یہ تقسیم ہر طرح جامع و مانع ہے۔

۳۳- آیت کریمہ ﴿لَقَد تَّابَ ٱللَّهُ عَلَى ٱلنَّبِيِّ وَٱلْمُهَـٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ﴾ سے بندہ توبہ کے مرتبہ کو سمجھ سکتا ہے اور یہ توبہ بندہ مومن کا منتہائے کمال ہے' اور اللہ تعالیٰ یہ اعلیٰ درجہ غزوات میں قربانیوں کے بعد عطا فرماتا ہے' جب مسلمان اپنی جان و مال اور وطن کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خیرباد کہہ دیتا ہے۔ اس کے پیچھے ان کا عظیم مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے اور ان کی توبہ و انابت کو قبول فرمائے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے توبہ کی قبولیت والے دن کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "آج کا دن تمہارے لئے سب سے زیادہ خوشی کا دن ہے' جب سے تم پیدا ہوئے"۔ اس حقیقت کو صحیح طور پر وہی آدمی سمجھ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات' بندوں پر اس کے حقوق' عبودیت کے استحقاق اور خود اپنی ذات اور اپنے حالات کو سمجھے اور یہ محسوس کرے کہ اس کی بندگی اللہ تعالیٰ کے حقوق کے مقابلہ میں قطرہ کی حیثیت رکھتی ہے جو سمندر بے بیکراں میں ڈالا جائے' بشرطیکہ ریاء اور دیگر آفتوں سے پاک و صاف ہو۔

پاک ہے وہ ذات جس کے عفو و درگذر کے علاوہ بندوں کو کوئی سہارا نہیں۔ اس نے ابتداء میں ان کو توفیق دی اور توبہ قبول فرمائی اور جب انہوں نے توبہ کی تو دوبارہ قبولیت توبہ کی خبر دی۔ اس ذات نے انہیں توفیق بخشی اور پھر توبہ قبول کر کے ان پر فضل فرمایا۔

اسی لئے تمام خیر اور ہر طرح کی بھلائیاں اس کی جانب سے ہیں اس کی توفیق سے ہیں اور اسی کے لئے ہیں۔ اس کے قبضہ قدرت میں ہیں' جس پر چاہتا ہے فضل و کرم فرماتا ہے' اور جسے چاہتا ہے حکمت و عدل کے باعث محروم کر دیتا ہے۔

فصل (۸۴)

غزوہ تبوک سے واپسی پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت میں حج

غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد سنہ ۹ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو مسلمانوں کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر حج بیت اللہ کے لئے روانہ فرمایا' اور آپ نے بیس اونٹ قربانی کے لئے بھیجے اور اپنے دست مبارک سے ان کو قلادے پہنائے اور علامتیں ڈالیں۔ یہ اونٹ حضرت ناجیہ بن جندب اسلمی کے زیر نگرانی تھے' جس میں سے پانچ عدد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے۔

ابن اسحاق کا قول ہے کہ : حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ابھی راستہ میں تھے کہ مشرکین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ ختم کرنے کے لئے سورہ براءت نازل ہوئی' چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی پر سوار ہو کر نکلے اور قافلہ حج سے جا ملے۔

جب حضرت ابوبکر نے حضرت علی کو دیکھا تو دریافت فرمایا : امیر بن کر آئے ہو یا مامور؟ انہوں نے جواب دیا' امیر نہیں بلکہ مامور بن کر آیا ہوں اور مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے بھیجا ہے کہ میں اہل مکہ کے سامنے سورہ براءت پڑھ کر ان کے ساتھ سارے معاہدوں کے خاتمہ کا اعلان کر دوں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حج کرانا شروع کر دیا اور جب دسویں ذی الحجہ کا دن آیا تو حضرت علی کھڑے ہوئے اور جمرہ اولی کے پاس ان ساری باتوں کا اعلان کر دیا' جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہنے کا حکم دیا تھا۔ اس روایت کو حمیدی نے زید بن نفیع کے واسطے سے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ حج کے موقع پر آپ کو کیا پیغام دے کر بھیجا گیا تھا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا' میں جو پیغام لے کر گیا تھا' وہ چار باتوں پر مشتمل تھا :-

۱- برہنہ ہو کر کوئی طواف کعبہ نہ کرے۔

۲۔جنت میں صرف مومن ہی داخل ہوں گے۔
۳۔اس سال کے بعد مسجد حرام میں مسلمان اور کافر جمع نہ ہوں گے۔
۴۔جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معاہدہ ہے وہ اس مدت تک باقی رہے گا۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے فارغ ہوئے اور مکہ فتح ہو گیا اور قبیلہ ثقیف کے لوگ مسلمان ہو گئے تو مختلف اطراف سے آپ کے پاس وفود عرب آنا شروع ہو گئے تاکہ مشرف باسلام ہوں اور امان حاصل کریں' جو مندرجہ ذیل ہیں۔

وفد بنی تمیم' وفد طئی' وفد بنی عامر' وفد عبد قیس' وفد بنی حنیفہ' وفد کندہ' وفد اشعرین' وفد آزد' وفد اہل نجران' وفد ہمدان' وفد نصاری نجران۔ اور ان کے علاوہ دوسرے وفود بھی حاضر ہوئے تھے۔

فصل (۸۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ جسمانی علاج میں

ہم نے گذشتہ صفحات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور سنت حسنہ کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے' اب ہم طب نبوی کے متعلق کچھ چیزوں کا ذکر کرتے ہیں کہ آپ نے کیا کہا اور کیا طریقے اختیار فرمائے ہیں' اور کس مرض کا کیا علاج تجویز فرمایا ہے' ہم اس میں اس حکمت کا تذکرہ کریں گے کہ جس تک پہنچنے میں اطباء عاجز ہو چکے ہیں کیونکہ اطباء کے مقابلہ میں طب نبوی معجزات پر مشتمل ہے۔

چنانچہ ہم اللہ تعالیٰ سے استعانت کرتے ہوئے یہاں صرف ان مفردات و مرکبات روحانی اور قدرتی دواؤں کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ علاج کا ذکر کریں گے جو کہ آپ سے مروی اور ثابت ہے۔

نظربد کا علاج :

صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "نظر حق ہے' اگر کوئی چیز قضاء و قدر سے بھی بڑھ جاتی تو وہ نظر ہی ہو سکتی تھی"۔ نیز صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ : "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نظربد' بخار' اور پھوڑے پھنسی کے امراض میں جھاڑ پھونک کی اجازت دی ہے"۔

امام مالک نے حضرت ابن شہاب سے' انہوں نے ابوامامہ بن سہل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ عامر بن ربیعہ نے حضرت سہل بن حنیف کو غسل کرتے دیکھا تو کہا کہ بخدا میں نے آج تک ایسا بانکا شخص نہیں دیکھا اور نہ ایسی خوبصورت جلد دیکھی۔ راوی کہتے ہیں کہ اس پر حضرت سہل کو نظر لگ گئی اور وہ زمین پر گر گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر حضرت عامر کے پاس آئے اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے۔ تم نے برکت کی دعا کیوں نہیں کی۔ اب ان کے لئے غسل

کرو۔ یہ سن کر عامر نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھ ' دونوں کہنیاں ' دونوں گھٹنے ' پیروں کی انگلیاں اور مستورہ جسم ایک برتن میں دھوئے پھر اسے سہل پر بہا دیا تو وہ اچھے ہو کر لوگوں کے ساتھ چلے گئے۔

عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے طاوس سے انہوں نے اپنے والد سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ "نظر کا لگنا برحق ہے اور جب تم میں سے کسی سے غسل کرنا طلب کیا جائے تو اسے غسل کر لینا چاہئے"۔

اس حدیث کا موصول ہونا صحیح ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ نظر لگانے والے کو حکم دیا جائے گا کہ ایک برتن میں وہ اپنا ہاتھ ڈالے ' پھر اس میں کلی کرے ' چہرہ دھوئے ' پھر بایاں ہاتھ دھوئے ' پھر اپنے دائیں گھٹنے پر پانی ڈالے ' پھر دایاں ہاتھ برتن میں ڈالے اور بائیں گھٹنے پر سے پانی انڈیلے ' پھر جسم کا باقی حصہ دھوئے اور برتن زمین پر نہ رکھا جائے۔ اب یہ پانی یکبارگی نظر لگنے والے کے اوپر پیچھے سے ڈال دیا جائے۔

نظر بد کی دو قسمیں ہوتی ہے : ایک انسانی ' دوسری جناتی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ : " نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر میں ایک باندی دیکھی ' جس کے چہرہ پر پھوڑے پھنسیاں تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی جھاڑ پھونک کراؤ کیونکہ اسے نظر لگ گئی ہے" امام بغوی فرماتے ہیں کہ حدیث میں "سعفہ" سے مراد جناتی نظر ہے ' اور جناتی نظر اس قدر تیز ہوتی ہے کہ نیزوں کی نوک سے بھی زیادہ تیز۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنوں اور انسانوں کی نظر بد سے پناہ مانگتے تھے ' ایک گروہ نے عقل و فہم کی کمی کے باعث نظر بد کا انکار کیا ہے۔ حالانکہ مختلف مذاہب کے عقلاء اور فلاسفہ نہ تو نظر بد کا انکار کرتے ہیں اور نہ اسے محض اوہام و خرافات سمجھتے ہیں۔ ہاں اس کے اسباب اور تاثیرات کے سلسلہ میں خیالات مختلف ہیں۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسموں اور روحوں میں مختلف قوتوں اور طبیعتوں کو پیدا فرمایا ہے ' اور ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات و کیفیات رکھی ہیں۔ اس لئے کوئی بھی عقلمند اور صاحب بصیرت جسموں میں ان روحوں کی تاثیر کا انکار نہیں کر سکتا ' کیوں کہ یہ چیز محسوس اور مشاہدہ کی جا سکتی

آنکھ کی خود کوئی تاثیر نہیں بلکہ تاثیر روح کی ہوتی ہے اور روحیں اپنی طبیعت ' کیفیت ' قوت ' خاصیت میں مختلف تاثیروں کی ہوتی ہیں ' اور آنکھ سے چونکہ روح کا ایک خاص قسم کا تعلق زیادہ ہوتا

ہے' اس لئے اس فعل کو اس کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

چنانچہ حاسد کی روح محسود پر بین طور پر ضرر رساں اثر کرتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ اس کے شر سے پناہ مانگیں۔ محسود کے ضرر پہنچنے کے سلسلہ میں حاسد کی نگاہوں کی تاثیر کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو انسانیت کی حقیقت اور اس کی صفات و تاثیرات کی معرفت سے بالکل کورے اور ناواقف ہوتے ہیں۔ محسوسات میں سانپ کے ذریعہ اس کی مثال دی جاسکتی ہے' کیونکہ اس کے اندر زہر چھپا رہتا ہے۔ جب اپنے دشمنوں کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک غضبی قوت بیدار ہوتی ہے اور نفس پر ایک خبیث اور موذی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس میں بعض کیفیات اتنی شدید اور قوی ہوتی ہیں کہ حمل کو گرا دیتیں ہیں' اور بعض سے آنکھ کی بینائی زائل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض زہریلے چھوٹے سانپوں کے بارے میں فرمایا کہ نگاہ کو ڈھونڈتے ہیں اور اسقاط حمل کرا دیتے ہیں۔

اس طرح تاثیر اتصال بدن پر موقوف نہیں' جیسا کہ بعض کم علم اور طبیعت و شریعت سے ناواقف لوگوں کا خیال ہے' بلکہ یہ تاثیر کبھی اتصال بدن سے ہوتی ہے اور کبھی سامنا ہونے سے' کبھی محض دیکھ لینے سے اور کبھی صرف روحانی توجہ سے اور کبھی دعاؤں اور تعویذ گنڈوں سے اور کبھی محض وہم و تخیل سے بھی اثر ہو جاتا ہے۔

اسی طرح نظر بد لگانے والے شخص کی نگاہوں کی وجہ سے صرف نظر بد لگنا موقوف نہیں' بلکہ بسا اوقات نابینا شخص کے سامنے کسی چیز کی تعریف و توصیف کی جائے' تو وہ اسے دیکھے بغیر متاثر کر دیتا ہے۔ اور بہت سے لوگ کسی چیز کا خاکہ سن کر ہی اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہر نظر لگانے والا حاسد ہوتا ہے' اور ہر حاسد نظر لگانے والا نہیں ہوتا' اور چونکہ حسد عام ہے اس لئے نظر کے مقابلہ میں اس سے پناہ مانگنے کا حکم زیادہ عام ہے۔ یہ تاثیر اصل میں تیر ہوتے ہیں جو حاسد اور نظر لگانے والے کے مزاج و طبیعت سے نکلتے اور خارج ہوتے ہیں اور محسود کی طرف جاتے ہیں۔ کبھی تو یہ تیر نشانے پر لگ جاتے ہیں اور کبھی خطا ہو جاتے ہیں۔ اگر انسان کا جسم انہیں کسی بچاؤ کے بغیر کھلا مل جاتا ہے تو یہ اس میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر محتاط و مسلم ہوتا ہے تو اثر نہیں کر پاتے۔ یہ تیر کبھی کبھی خود اس شخص کی طرف واپس لوٹ آتے ہیں' جہاں سے چلے تھے' جیسا کہ ہم تیراندازی میں محسوس و مشاہدہ کرتے ہیں۔

کبھی کبھی انسان کو خود اپنی نظر لگ جاتی ہے' اور کبھی وہ بغیر ارادہ بھی نظر لگا دیتا ہے' اس میں صرف

طبیعت و مزاج کا دخل ہوتا ہے اور یہ سب سے بدتر صورت ہے۔

نظر بد کا علاج :

سنن ابوداود میں حضرت سہل بن حنیف سے مروی ہے کہ ہم ایک سیلابی علاقے سے گذرے ' میں نے اس میں داخل ہو کر غسل کیا' لیکن باہر آتے آتے مجھے بخار آگیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی گئی۔ آپ نے فرمایا : ابو ثابت سے کہو کہ وہ اعوذباللہ پڑھیں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا' اے میرے آقا! کیا دم کرانا اچھی بات ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جھاڑ پھونک صرف نظر' بخار اور ڈنک لگنے میں ہوتا ہے۔

تعوذ اور دم کی صورت یہ ہے کہ آدمی معوذتین اد سورہ فاتحہ ' آیتہ الکرسی اور پناہ مانگنے والی دعائیں پڑھے جس میں سے بعض یہ ہیں :

«أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ، وَهَامَّةٍ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لاَمَّةٍ»

میں اللہ تعالیٰ کے کلمات تامہ کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں' ہر شیطان اور زہریلے ہلاک کرنے والے جانور سے اور ہر نظر لگانے والی آنکھ سے۔

«أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لاَيُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلاَفاَجِرٌ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ»

اللہ کے پورے کلموں کے ذریعہ جن کو کوئی نیک و بد تجاوز نہیں کر سکتا مخلوق کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

«أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ وَمِنْ شَرِّ مَايَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ، وَمِنْ شَرِّ مَايَعْرُجُ فِيْهَا، وَمِنْ شَرِّ مَاذَرَأَ فِي الأَرْضِ وَمِنْ شَرِّ مَايَخْرُجُ مِنْهَا، وَمِنْ شَرِّ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمِنْ شَرِّ طَوَارِقِ اللَّيْلِ إِلاَّ طَارِقًا يَطْرُقُ بِخَيْرٍ يَارَحْمٰنُ»

اللہ کے پورے کلموں کے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں ' اس چیز کے شر سے جسے اس نے پیدا کیا اور پھیلا دیا اور ان چیزوں کی برائی سے جو آسمان سے اترتی ہے اور چڑھتی ہے اور اس سے بھی جس کو زمین میں پھیلایا اور جو زمین سے نکلتی ہے' اور رات و دن کے فتنوں سے اور رات کے ہر آنے والے کی برائی سے مگر وہ نہیں جو بھلائی کے ساتھ آئے' اے بڑی مہربانی والے۔

«أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَنْ يَحْضُرُوْنِ»

میں اللہ کے کلمات تامہ کے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں' اس کے غضب' اس کے عذاب سے اور اس کے بندوں کے شر سے اور شیطانوں کے وسوسے سے اور ان کے میرے پاس حاضر ہونے سے۔

«اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ، وَكَلِمَاتِكَ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ مَاأَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، اللّٰهُمَّ أَنْتَ تَكْشِفُ الْمَأْثَمَ وَالْمَغْرَمَ، اللّٰهُمَّ لَايُهْزَمُ جُنْدُكَ وَلَايُخْلَفُ وَعْدُكَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ»

اے اللہ میں تیرے باعزت چہرے اور تیرے پورے کلموں کے ذریعہ ان چیزوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں' جن کی پیشانی تو پکڑے ہوئے ہے' اے اللہ! تو ہی قرض اور خطاؤں کو دور کرتا ہے۔ تیرا لشکر شکست نہیں کھا سکتا' تیرا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا' تو پاک ہے' ہم تیری ہی حمد کرتے ہیں۔

«أَعُوْذُ بِوَجْهِ اللهِ الْعَظِيْمِ الَّذِي لَاشَيْءَ أَعْظَمُ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَايُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَافَاجِرٌ وَأَسْمَاءِ اللهِ الْحُسْنَى، مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ أَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ، وَمِنْ شَرِّ كُلِّ ذِيْ شَرٍّ لَاأُطِيْقُ شَرَّهُ، وَمِنْ شَرِّ كُلِّ ذِيْ شَرٍّ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ»

میں خدائے برتر کی ذات پاک کے ذریعہ پناہ چاہتا ہوں' جس سے بڑا کوئی نہیں۔ اور ان پورے کلموں کے ذریعہ جن سے کوئی نیک و بد تجاوز نہیں کر سکتا' اور اللہ کے اسماء حسنیٰ کے ذریعہ جن کو میں جانتا ہوں اور جنہیں نہیں جانتا' ان چیزوں کے شر سے جنہیں اس نے پیدا کیا اور پھیلایا اور ہر شر والی چیز کے شر سے جس کی مجھے طاقت نہیں' اور جس کی پیشانی تیری گرفت میں ہے۔ بیشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔

«تَحَصَّنْتُ بِاللهِ الَّذِي لَاإِلٰهَ إِلَّا هُوَ إِلٰهِي وَإِلٰهُ كُلِّ شَيْءٍ، وَاعْتَصَمْتُ بِرَبِّي وَرَبِّ كُلِّ شَيْءٍ وَتَوَكَّلْتُ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَايَمُوْتُ، وَاسْتَدْفَعْتُ الشَّرَّ بِلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ، حَسْبِيَ اللهُ، وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ، حَسْبِيَ الرَّبُّ مِنَ

الْعِبَادِ، حَسْبِيَ الْخَالِقُ مِنَ الْمَخْلُوْقِ، حَسْبِيَ الرَّازِقُ مِنَ الْمَرْزُوْقِ، حَسْبِيَ الَّذِي هُوَ حَسْبِيْ، حَسْبِيَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ، حَسْبِيَ اللهُ وَكَفَى، سَمِعَ اللهُ لِمَنْ دَعَا، لَيْسَ وَرَآءَ اللهِ مَرْمًى، حَسْبِيَ اللهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ»

میں اس اللہ کی حفاظت میں داخل ہوا' جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی میرا اور ہر چیز کا معبود ہے میں نے اپنے اور ہر چیز کے پروردگار کی حفاظت اختیار کی اور اس ذات پر بھروسہ کیا جو زندہ ہے' مر نہیں سکتا۔ اور لاحول کے ذریعے شر کو دفع کیا' مجھے اللہ کافی ہے اور اچھا کارساز ہے' بندوں سے رب کافی ہے' مخلوق سے خالق کافی ہے' مرزوق سے رازق کافی ہے۔ مجھے وہی ذات کافی ہے جو کافی ہے' وہ اللہ کافی ہے جس کی قبضہ میں ہر چیز کی حکومت ہے' وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا اور اللہ کافی ہے اور بس دعا کرنے والے کی دعا سنتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی مقصد نہیں۔ مجھے اللہ کافی ہے' اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں' اس پر میرا بھروسہ ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

جس نے بھی ان دعاؤں اور تعویذات کا تجربہ کیا' وہ سمجھ لے گا کہ یہ کس قدر فوائد و نفع سے بھری ہیں' اور ان کی کس قدر اہمیت ہے۔ ان سے نظربد سے بچاؤ ہو سکتا ہے' اور کہنے والی قوت ایمانی کے مطابق ان سے دفاع ہو سکتا ہے' اور اس کی قوت توکل و ثبات قلب کے مطابق تحفظ ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ایک ہتھیار ہے اور ہتھیار چلانے والے کے فائدہ کے لئے ہی ہوتا ہے جو اس کی قوت و طاقت پر موقوف ہے۔

خود اپنی نظر لگنے کا علاج :

جب نظر لگانے والے کو خود اپنی نظر لگ جانے کا اندیشہ ہو تو اسے یہ دعا پڑھ کر اس سے محفوظ ہونا چاہئے :

«اللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلَيْهِ»

اے اللہ اس پر برکت فرما۔

جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر بن ربیعہ سے فرمایا جب کہ سہل بن حنیف نے انہیں نظر

لگائی: کیا تم نے دعائے برکت نہیں کی' یعنی اللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلَيْهِ نہیں پڑھا۔ نیز مَاشَآءَ اللهُ لَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ پڑھنے سے نظر دور ہو جاتی ہے۔

ہشام بن عروہ اپنے والد بزرگوار سے روایت کرتے ہیں کہ جب وہ کوئی تعجب خیز چیز دیکھتے یا کسی باغ میں داخل ہوتے تو «مَا شَآءَ اللهُ لَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ» پڑھا کرتے تھے۔

اسی قبیل سے حضرت جبریل علیہ السلام کا دم وہ دعاء ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا' جو صحیح مسلم میں اس طرح سے مروی ہے :

«بِسْمِ اللهِ أَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيْكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ، اللهُ يَشْفِيْكَ، بِسْمِ اللهِ أَرْقِيْكَ.»

اللہ کے نام سے آپ پر دم کرتا ہوں ہر مرض سے جو آپ کو تکلیف دے ہر نظر بد یا حاسد کی نظر شر سے' اللہ آپ کو شفا دے۔ اللہ کے نام سے آپ پر دم کرتا ہوں۔

پھر مصنف نے ہر تکلیف کے علاج کے لئے خدائی رقیہ اور معالجہ کا ذکر کیا ہے' جس کو ہم طب نبوی یا دستور محمدی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سنن ابو داود میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مرفوع کو مصنف نے ہر مرض سے شفاء کے لئے ذکر کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم میں سے جس کو کوئی تکلیف ہو' یا اس کا بھائی کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو اسے چاہئے کہ یہ دعا پڑھے:

«رَبُّنَا اللهُ الَّذِي فِي السَّمَآءِ، تَقَدَّسَ اَسْمُكَ أَمْرُكَ فِي السَّمَآءِ وَالأَرْضِ كَمَارَحْمَتُكَ فِي السَّمَآءِ فَاجْعَل رَحْمَتَكَ فِي الأَرْضِ، اَغْفِرْ لَنَا حُوْبَنَا وَخَطَايَانَا، أَنْتَ رَبُّ الطَّيِّبِيْنَ، أَنْزِلْ رَحْمَةً مِنْ رَحْمَتِكَ وَشِفَاءً مِنْ شِفَآئِكَ عَلَى هٰذَاالْوَجْعِ»

اے ہمارے پروردگار (اللہ) جو آسمان میں ہے' تیرا نام مقدس ہے۔ تیرا حکم آسمان اور زمین میں ہے۔ جس طرح تیری رحمت آسمان میں ہے (اسی طرح) زمین میں اپنی رحمت نازل فرما اور ہمارے گناہوں اور لغزشوں کو معاف فرما دے۔ تو ہی پاک لوگوں کا پروردگار ہے۔ اپنے پاس سے رحمت نازل فرما' اور اپنی شفاء سے شفاء نازل فرما' اس درد پر۔

چنانچہ یہ دعاء پڑھتے ہی وہ وہ مرض سے شفاء یاب ہو جائے گا۔ پھوڑے' چوٹ اور زخم کے علاج کے متعلق صحیحین میں مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جب انسان کو تکلیف ہو' پھوڑا یا زخم وغیرہ ہو تو شہادت کی انگلی زمین پر رکھے' پھر اٹھائے اور یہ دعا پڑھے :

«بِسْمِ اللهِ، تُرْبَةُ أَرْضِنَا بِرِيْقَةِ بَعْضِنَا يُشْفَى سَقِيْمُنَا بِإِذْنِ رَبِّنَا»

اللہ کے نام سے یہ ہماری زمین کی مٹی ہے اور ہم میں سے ایک کا تھوک ہے' ہمارا بیمار ہمارے پروردگار کے حکم سے شفایاب ہو جائے۔

اس دعا میں ہر زمین کی مٹی مراد ہے یا صرف سرزمین مدینہ کی مٹی؟ اس سلسلہ میں دو قول ہیں۔

فصل (۸۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شدت مصیبت کے وقت علاج کا طریقہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ وَبَشِّرِ الصَّـٰبِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَآ أَصَـٰبَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓا۟ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ ۝ أُو۟لَـٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُهْتَدُونَ ﴾ [البقرة: ١٥٥-١٥٧]

اور خوشخبری دے دیجئے ان صبر کرنے والوں کو کہ جب پہنچے ان کو کچھ مصیبت تو کہیں ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی' اور مہربانی' اور وہی سیدھی راہ پر ہیں۔

صحیح میں حضرت ام سلمہ سے مرفوعا روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی شخص اگر مبتلائے مصیبت ہو جائے تو یوں کہا کرے :

«إِنَّا للهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اللَّهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيْبَتِي وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا»

ہم اللہ کے ہی ہیں اور اسی کی طرف واپس جانا ہے' اے اللہ میری مصیبت میں مجھے پناہ دے اور مجھے اس سے بہتر بدل عطا فرما۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ اسے اس مصیبت میں پناہ دے گا اور بہتر بدل عطا فرمائے گا۔ یہ کلام مصیبت کا سب سے بہترین علاج اور دنیا و آخرت میں سب سے زیادہ فائدہ بخش ہے' کیونکہ یہ دو عظیم اصولوں پر مشتمل ہے کہ اگر بندے کو ان کی معرفت حاصل ہو جائے تو مصیبت میں اسے اطمینان و سکون حاصل ہو گا۔ وہ دو اصول یہ ہیں :

پہلا اصول : بندہ اور اس کے اہل و عیال اور مال و دولت یہ سب کی سب چیزیں دراصل اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور بندے کے پاس بطور امانت اور عاریتا ہیں۔

دوسرا اصول : بندے کا انجام کار اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا اور دنیا کو چھوڑ کر تن تنہا چلے جانا ہے۔

جب بندے کی یہ ابتداء اور انتہاء ہے تو اس میں غور و فکر مصیبت کا سب سے بڑا علاج ہے۔ پھر نعمت کے حصول پر فرحت کیوں؟ اور مصیبت کے نزول پر رنج و غم کیوں؟

نیز ایک علاج یہ بھی ہے کہ اسے اس بات کا یقینی علم ہو کہ جو تکلیف پہنچی ہے، وہ ٹلنے والی نہ تھی، اور جو ٹل گئی، وہ پہنچنے والی نہ تھی۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ مصیبت پر صبر کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اجر و ثواب ہے وہ یقیناً فوت شدہ چیز سے زیادہ ہے۔ نیز بندہ کو چاہیے کہ وہ دائیں بائیں کے دوسرے مصیبت زدگان کو بھی دیکھے۔ اسے ہر طرف آزمائش اور حسرت کا ایک سلسلہ نظر آئے گا۔ دنیا کی مسرتیں خواب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے انسان تھوڑا ہنستا ہے تو بہت زیادہ روتا ہے۔ بندہ کو یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ بے چینی اور گریہ و زاری سے مفقود چیز واپس نہیں لوٹ سکتی بلکہ پریشانی اور گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

بندہ یہ بھی سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں اور انا للہ پڑھنے والوں سے جن نعمتوں کا وعدہ کیا ہے وہ فوت شدہ چیز سے کہیں زیادہ اعلیٰ و اعظم ہے۔ بندہ اس کو بھی ملحوظ رکھے کہ ضرورت سے زائد گریہ و زاری اور اظہار پریشانی، دشمنوں کو خوش اور دوستوں کو رنجیدہ اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرے گی۔ بندے کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ صبر و احتساب کے بعد جو لذت حاصل ہوگی وہ فوت ہونے والی چیز اگر باقی رہتی اس سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔ اور بندہ یہ بھی سوچ کر تسلی حاصل کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ضرور نعم البدل عطا فرمائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ ہر چیز کا بدل موجود ہے۔ اور بندے کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ نعمت کا جتنا حصہ اس کے حق میں مقدر تھا اسے مل چکا ہے۔ اب اتنے پر راضی اور مطمئن ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوگی، اور اگر اس سے ناراض ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگا۔ اور یہ کہ بندہ کو ہر چند جزع و فزع سے تھک ہار کر صبر و سکون کرنا ہی ہوگا اور ایسی صورت میں نہ تو ثواب ملے گا اور نہ وہ قابل تعریف ہوگا۔ نیز بندہ کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ بیماریوں کا بہترین علاج رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم ہو جانا ہے، اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کی رضا و رغبت کا خیال رکھا جائے اور اس کی مخالفت نہ کی جائے۔

بندہ مومن کو چاہیے کہ دونوں نعمتوں اور لذتوں کے درمیان مقابلہ کرے کہ فوت شدہ چیز زیادہ فائدہ مند تھی یا اس کے فوت ہونے کے بعد صبر کرنے کے صلہ میں حاصل شدہ اجر و ثواب کی نعمت زیادہ نفع بخش ہے۔ بندہ کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ مصیبت کے ذریعہ آزمائش میں ڈالنے والی ذات احکم الحاکمین اور

ارحم الراحمین ہے۔ اس ذات پاک نے اسے ہلاک کرنے کے لئے بتلائے مصیبت نہیں کیا ہے' بلکہ اس کا مقصد اس کے ایمان و یقین و صبرواستقامت کاامتحان ہے' تاکہ اس کے خوف و خشیت الٰہی اور تضرع و زاری کو سنے اور اپنے دروازہ رحمت پر پڑا ہوا دیکھے۔

بندہ مومن کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ یہ مصیبتیں مہلک اور خطرناک بیماریوں کو روکنے اور دور کرنے کا بہترین وسیلہ ہیں' جیسے تکبر' خودپسندی اور سنگ دلی۔ اور یہ بھی سوچے کہ دنیا کی تلخی ہی دراصل آخرت کی حلاوت اور ثمر شیریں ثابت ہو گا' اگر سمجھ میں نہ آئے تو نبی صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی پر غور و فکر کرے۔ "جنت کو ناپسندیدہ چیزوں سے گھیر دیا گیا ہے اور دوزخ کو شہوتوں اور مرغوبات سے گھیر دیا گیا ہے"۔ اسی مقام پر مخلوقات کی عقل کا تفاوت ظاہر ہوتا ہے اور لوگوں کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔

فصل (۸۶)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حزن و غم کے علاج کا طریقہ

صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے چینی کے موقع پر یہ دعا پڑھا کرتے تھے :

«لَاإِلٰهَ إِلَّااللهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ، لَاإِلٰهَ إِلَّااللهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَرَبُّ الأَرْضِ، رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ»

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو بزرگ اور حلیم ہے' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو عرش عظیم کا پروردگار ہے' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو ساتوں آسمانوں کا رب اور زمین کا رب اور عرش کریم کا رب ہے۔

نیز جامع ترمذی میں حضرت انس سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی رنج و غم لاحق ہوتا تو یہ دعا فرماتے :

«يَاحَيُّ يَاقَيُّوْمُ، بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيْثُ»

اے زندہ اے ہر چیز کو قائم رکھنے والے تیری رحمت کے طفیل مدد مانگتا ہوں۔

نیز حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی بات کا صدمہ ہوتا تو آپ آسمان کی جانب سر مبارک اٹھاتے اور «سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ» پڑھتے اور دعا میں خوب سعی فرماتے اور «يَاحَيُّ يَاقَيُّوْمُ» پڑھتے۔

سنن ابوداود میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پریشان اور مصیبت زدہ آدمی کی دعائیں یہ ہیں :

«اللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ أَرْجُوْ، فَلَاتَكِلْنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ، وَأَصْلِحْ لِي

شَأْنِي كُلَّهُ، لَاإِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ»

اے اللہ میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں۔ اس لئے مجھے چشم زدن کے لئے بھی میرے سپرد نہ کر' اور میری حالت درست فرما' تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

نیز حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مجھے فرمایا : کیا میں تمہیں ایسے کلمات نہ بتاؤں جنہیں تکلیف اور پریشانی کے وقت میں کہہ لیا کرو وہ یہ ہیں :

«اللهُ رَبِّي لاَ أُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا»

اللہ میرا پروردگار ہے' میں اس کا کسی کو شریک نہیں بناتا۔

ایک روایت میں ہے کہ اسے سات بار کہا جائے۔

مسند امام احمد رحمتہ اللہ علیہ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جب بندے کو غم اور دکھ پہنچے تو وہ یہ دعا کرے :

«اللَّهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ، وَابْنُ عَبْدِكَ، وَابْنُ أَمَتِكَ نَاصِيَتِي بِيَدِكَ، مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِيَّ قَضَاءُكَ، أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ، أَوْأَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ، أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ، أَوِاسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِي عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ، أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ الْعَظِيمَ، رَبِيْعَ قَلْبِي، وَنُوْرَ صَدْرِي وَجَلاَءَ حُزْنِي وَذَهَابَ هَمِّي»

اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں' تیرے بندے کا بیٹا ہوں' تیری بندی کا بیٹا ہوں' میری پیشانی تیرے قبضہ میں ہے۔ مجھ پر تیرا حکم جاری ہے۔ مجھ پر تیرا فیصلہ ہی کارفرما ہے۔ میں تیرے اس نام کے طفیل سوال کرتا ہوں جسے تو نے اپنے لئے اختیار کیا ہے' یا تو نے اسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا یا تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا یا تو نے اسے اپنے پاس علم غیب (مخفی) میں رکھا کہ تو قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار' میرے سینے کا نور' میرے غم کا مداوا اور میرے غم کو دور کرنے کا ذریعہ بنا دے۔

جو بھی اسے پڑھے گا' اللہ تعالیٰ اس کا رنج و غم دور کردے گا اور اس کی جگہ فرحت عطا فرمائے گا۔

جامع ترمذی میں حضرت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : حضرت ذوالنون علیہ السلام کی دعا جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں کی تھی یہ ہے :

﴿ لَّآ إِلَـٰهَ إِلَّآ أَنتَ سُبۡحَـٰنَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴾

تیرے سوا کوئی معبود نہیں ' تو پاک ہے ' بے شک میں ظالموں میں سے ہوں۔

کوئی مسلمان بھی ان الفاظ سے دعا کرے تو اس کی دعا (ضرور) قبول کی جائے گی۔ ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ "میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ کوئی مصیبت زدہ ایسا نہیں جو اسے کہے اور اس کی تکلیف دور نہ ہو جائے ' وہ میرے بھائی یونس (علیہ السلام) کی دعا ہے"۔

سنن ابوداود میں حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوامامہ سے فرمایا : میں تمہیں ایسا کلام نہ بتاؤں کہ جب تم اسے پڑھو تو اللہ عزوجل تمہارا غم دور کر دے اور تمہارا قرض ادا فرما دے۔ راوی کہتے ہیں ' میں نے عرض کیا ' ہاں ضرور اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے فرمایا جب صبح ہو اور جب شام ہو تو یہ دعا پڑھ لیا کرو :

«اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ وَقَهْرِ الرِّجَالِ»

اے اللہ میں غم و حزن سے تیری پناہ مانگتا ہوں ' اور میں عجز اور سستی سے تیری پناہ مانگتا ہوں ' اور میں بزدلی اور کنجوسی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں غلبہ قرض اور آدمیوں کے قہر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

راوی کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا ' چنانچہ اللہ عزوجل نے تمام رنج و غم دور فرما دیئے اور میرے سارے قرضے ادا کر دئے۔

سنن ابوداود میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ' جو استغفار لازم کر لے ' اللہ تعالیٰ نے گویا اسے ہر غم سے نجات عطا کی ' وہ اسے ہر تنگی سے نکال دے گا ' اور اسے ایسی جگہ سے رزق ملے گا جہاں کا اسے وہم و گمان کبھی نہ ہو گا۔ اور سنن میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : تم پر جہاد واجب ہے ' کیونکہ یہ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو رنج و غم سے نجات دیتا ہے۔

مسند میں مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی غم ہوتا تو آپ نماز کی طرف رجوع فرماتے اور کہتے 'اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿وَٱسْتَعِينُوا۟ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ﴾ [البقرة: ٤٥]

صبر کر کے اور نماز پڑھ کر اللہ سے مدد مانگو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعا مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
جس پر رنج و غم کی کثرت ہو' اسے کثرت سے «لاَحَوْلَ وَلاَقُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ» پڑھنا چاہئے۔ صحیحین سے ثابت ہے کہ یہ کلمات جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہیں۔

اور یہ مذکورہ طریقہ علاج پندرہ قسموں پر مشتمل ہے۔ اگر ان سے رنج و غم زائل نہ ہو سکے تو مطلب یہ ہے کہ بیماریاں جڑ پکڑ چکی ہیں اور اس کے اسباب مستحکم ہو گئے ہیں اور اب مکمل استفراغ کی ضرورت ہے۔ وہ پندرہ قسمیں یہ ہیں :

۱۔ توحید ربوبیت پر ایمان کامل رکھنا۔

۲۔ توحید الوہیت پر ایمان کامل رکھنا۔

۳۔ توحید علمی پر یقین کامل رکھنا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کو اس سے پاک جاننا کہ وہ کسی بندے پر ظلم کرتا اور بندے کا بغیر سبب کے مواخذہ کرتا ہے۔

۵۔ بندہ کا اعتراف ظلم و خطا۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین چیز کے ذریعہ اس تک پہنچنا اور یہ درجہ اس کے اسماء و صفات کو حاصل ہے اور ان اسماء و صفات کے معانی کے بہترین جامع یہ دونوں نام ہیں : "الحی القیوم"۔

۷۔ صرف خدائے واحد سے استعانت چاہنا۔

۸۔ ذات ربوبیت سے بندے کی آس اور امید کا اقرار۔

۹۔ اللہ تعالیٰ پر توکل کامل اور ہر کام اس کے سپرد کرنا اور اس کے لئے اعتراف کہ بندہ کی پیشانی اس کے ہاتھ میں ہے' جس طرح چاہتا ہے اسے پھیرتا ہے' اس کا حکم بندہ کے حق میں جاری ہے اور اس کا فیصلہ عادلانہ ہے۔

۱۰۔ باغ قرآن سے اس کا قلب شمیم انگیزیاں حاصل کرے جو اس کے قلب کے لئے موسم بہاراں بن

جائے گا' جس کے باعث وہ شبہات و شہوات کے ظلمات میں روشنی لے کر چل سکے' اور جس کی وجہ سے ہر فوت شدہ چیز پر صبر و سکون اور تسلی حاصل کرے۔ ہر مصیبت کو برداشت کر سکے اور دل کے روگ دور کر سکے جو اس کے حزن و ملال کو دور کر دے اور صدمہ و غم و الم سے شفایاب ہو سکے۔

۱۱۔ اللہ تعالیٰ کی جناب میں استغفار و انابت اور رجوع کرے۔

۱۲۔ خدائے بزرگ و برتر کی جناب میں توبہ کرے۔

۱۳۔ خدا کے راستے میں جہاد کرے۔

۱۴۔ نماز کو بصد ذوق و شوق و اہتمام سے ادا کرے۔

۱۵۔ لاحول ولا قوۃ کے سہارے براءت اور تمام آلام و ہموم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف معاملات کی سپردگی کر دے۔

فصل (۸۷)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بے خوابی اور گھبراہٹ کے علاج کا طریقہ

جامع ترمذی میں حضرت بریدہ سے مروی ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ شکایت عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! میں گھبراہٹ کے باعث رات کو سو نہیں پاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بستر پر جاؤ تو یہ دعا پڑھ لیا کرو :

«اللَّهُمَّ رَبَّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَمَاأَظَلَّتْ، وَرَبَّ الأَرْضِيْنَ السَّبْعِ وَمَا أَقَلَّتْ وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنِ وَمَا أَضَلَّتْ، كُنْ لِي جَارًا مِن شَرِّ خَلْقِكَ كُلِّهِمْ جَمِيْعًا أَنْ يَفْرُطَ عَلَيَّ أَحَدٌ مِنْهُمْ، أَوْ يَبْغَى عَلَيَّ، عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ، وَلَاإِلٰهَ غَيْرُكَ»

اے ساتوں آسمانوں کے پروردگار اور ان چیزوں کے جن پر ان کا سایہ ہے' اور اے ساتوں زمینوں کے پروردگار اور ان چیزوں کے جن کو انہوں نے چھپا رکھا ہے اور شیاطین کے پروردگار اور ان کے جن کو انہوں نے گمراہ کیا' اپنی ساری مخلوق کے شر سے مجھے پناہ دینے والا بن جا۔ اس بات سے کہ ان میں سے کوئی مجھ پر افراط کرے یا مجھ پر زیادتی کرے' تیرا پڑوسی غالب اور تیری ثناء بڑی ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

اسی کتاب میں حضرت عمرو بن شعیب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھبراہٹ کے موقع پر یہ دعا سکھلایا کرتے تھے :

«أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّآمَّاتِ مِنْ غَضَبِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ، وَأَعُوْذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُوْنِ»

اللہ کے پورے کلمات کے ذریعہ میں پناہ چاہتا ہوں' اس کے غضب سے' بندوں کے شر سے' شیطانوں کے وسوسے سے' اور اس بات سے کہ میرے پاس وہ آئیں۔

روای کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو اپنے باشعور بچوں کو یہ دعا سکھلایا کرتے تھے اور جو چھوٹے تھے' اسے لکھ کر ان کے گلے میں لٹکا دیا کرتے تھے۔

حضرت عمرو بن شعیب سے مرفوعا مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :"جب تم آگ لگی ہوئی دیکھو تو تکبیر کہو کیونکہ تکبیر (اللہ اکبر) آگ کو بجھا دے گی"۔

چونکہ آگ کا سبب شیطان ہوتا ہے اور وہ اس سے پیدا ہوا ہے اور اسی سے اس کا خمیر ہے' اس لئے آگ سے شیطان کو مدد ملتی ہے' اور آگ فطرتا بلندی اور فساد پسندی پر مبنی ہے۔ یہ دونوں عادتیں شیطانی صفات میں سے ہیں۔ وہ انہی کی طرف دعوت دیتا ہے اور اس کے سبب انسان ہلاکت میں پڑتا ہے۔

آگ کے شعلے اور شیطان دونوں ہی دنیا میں فساد اور تعلی کے طالب ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی لہٰذا جب مسلمان "اللہ اکبر" کہتا ہے تو تکبیر کا اثر آگ کو بجھا دیتا ہے' اور شیطان کو بھی بھگا دیتا ہے جو آگ کا اصل مادہ ہے۔ ہم نے اور ہمارے دوستوں نے بار بار اس کا تجربہ کیا اور ایسا ہی پایا۔

فصل (۸۸)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حفظان صحت کے سلسلہ میں اسوہ حسنہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ﴾ [الأعراف : ۳۱]

کھاؤ اور پیو اور اسراف نہ کرو۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی رہنمائی فرمائی کہ بدن میں تحلیل ہونے والے اجزاء کے مطابق کھانا اور پانی داخل کرنا چاہئے تاکہ اس سے بدن کی کمیت اور کیفیت میں فائدہ مند حد تک استفادہ ہو ' لیکن جب یہ مقدار بڑھ جائے گی تو یہ اسراف میں داخل ہوگی۔ اس لئے دونوں باتیں صحت کے لئے مضر اور مرض کی ذمہ دار ہیں۔ یعنی خورد و نوش بند کر دینا یا اس میں اسراف سے کام لینا۔
پس اللہ تعالیٰ کے ان دو کلمات طیبہ میں حفظان صحت کی تمام باتیں مکمل طور پر پائی جاتی ہیں اور چونکہ صحت و سلامتی بندہ پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمتوں اور بے پایاں عطیات میں سے ہے بلکہ مطلقاً سب سے بڑی نعمت ہے اس لئے جسے توفیق ملے اس کی حفاظت و قدر کرنی چاہئے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "دو نعمتیں ایسی ہیں جو بہت سارے لوگوں کے حق میں قابل رشک ہیں۔ ایک صحت ' دوسرے فارغ البالی"۔ امام ترمذی نے مرفوعا روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو صبح اس حالت میں کرے کہ اس کا جسم بعافیت ہو اور گھر بحفاظت ہو' اور اس کے پاس اس دن کی روزی موجود ہو تو گویا اسے ساری دنیا دے دی گئی ہے"۔
اور ترمذی ہی میں مرفوعا مذکور ہے کہ : "قیامت کے دن انعامات میں سے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے بندہ سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تجھے جسمانی صحت نہیں دی تھی اور تجھے ٹھنڈے پانی سے سیراب نہیں کیا تھا"۔

اسی وجہ سے اسلاف میں سے بعض نے آیت کریمہ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ ٱلنَّعِيمِ پھر البتہ ضرور

تم سے انعامات الٰہی کے متعلق پوچھا جائے گا۔ (التکاثر : ۸) میں نعمت کی تفسیر صحت سے کی ہے۔

امام احمد نے مرفوعا بیان کیا ہے کہ "اللہ سے یقین اور عافیت طلب کرو' کیونکہ یقین کے بعد عافیت سے بہتر کوئی چیز نہیں"۔ اس میں آپ نے دنیا اور آخرت کی عافیت جمع فرما دی ہے اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ دارین میں بندے کے حالات یقین اور عافیت کے بغیر اصلاح پذیر نہیں ہو سکتے' چنانچہ یقین سے آخرت کی سزائیں دور ہوتی ہیں اور عافیت سے قلب و جسم امراض دنیا سے نجات پاتے ہیں۔

سنن نسائی میں مرفوعا مذکور ہے کہ : "اللہ تعالیٰ سے عافیت اور معافی طلب کرو کیونکہ کسی کو یقین کے بعد عافیت سے بہتر کوئی چیز نہیں دی گئی ہے"۔

دعا میں جو تین الفاظ مذکور ہیں' ان میں عفو کے ذریعہ گذری ہوئی برائیوں کا ازالہ ہو جائے گا اور عافیت کے ذریعہ موجودہ برائیوں کا اور معافات کے ذریعہ آئندہ برائیوں کا۔

فصل (۸۹)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانے پینے میں اسوہ حسنہ

خورد و نوش میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت طیبہ یہ نہ تھی کہ ایک ہی قسم کی غذاؤں پر قائم رہتے۔ ان کے علاوہ دوسری استعمال نہ فرماتے کیونکہ یہ طریقہ صحت کے لئے بہت نقصان دہ ہے خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہل وطن کی عادت و معمول کے مطابق تناول فرماتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کھانے میں عیب نہیں نکالا' جی چاہا تو تناول فرمالیا ورنہ چھوڑ دیا۔ اور جب طبیعت راغب نہ ہو تو کھانا نہ کھایا جائے اور زبردستی پیٹ میں بھرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ حفظان صحت کے معاملہ میں یہ ایک مرکزی اصول ہے۔ کیونکہ خواہش کے برعکس کھانا کھانے سے نفع کم اور نقصان زیادہ ہو گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم گوشت پسند فرماتے تھے۔ دست کا حصہ اور اگلے حصے کا گوشت زیادہ مرغوب تھا' کیونکہ یہ ہلکا اور زود ہضم ہوتا ہے۔ نیز آپ میٹھی چیز اور شہد پسند کرتے تھے۔ یہ تینوں چیزیں یعنی گوشت' حلوا' اور شہد بدن' جگر اور اعضاء رئیسہ کے لئے غیر معمولی مفید ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم علاقے کے تازہ پھل بھی استعمال فرماتے اور ان سے پرہیز نہ کرتے۔ یہ طریقہ بھی اصول غذائیت کے مطابق ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ' ہر علاقہ میں ایسے ایسے پھل پیدا فرمائے ہیں جو وہاں کے لوگوں کے لئے فائدہ مند ہوں اور ان کی صحت و عافیت میں اضافہ کا سبب بنیں۔ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ جو شخص علاقائی پھلوں اور غذاؤں سے پرہیز کرتا ہے وہ جسمانی طور پر بیمار اور کمزور رہتا ہے۔

کھانے پینے کے آداب :

صحیح روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں ٹیک لگا کر نہیں

کھاتا' بلکہ اس طرح بیٹھتا ہوں کہ جیسے بندہ بیٹھتا ہے اور اس طرح کھاتا ہوں جس طرح بندہ کھاتا ہے"۔

اس کی تشریح میں چار زانو بیٹھنا' ٹیک لگانا اور پہلو کے بل بیٹھنا بھی شامل ہے' اور تینوں طرح کی ٹیک مضر صحت ہے۔ آپ تین انگلیوں سے کھانا تناول فرماتے تھے اور یہ صورت سب سے زیادہ فائدہ بخش ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہد میں ٹھنڈا پانی ملا کر پیتے تھے' اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر پینے والے کو قے کرنے کا حکم فرمایا' اور یہ بھی ثابت ہے کہ ضرورت کے وقت آپ نے کھڑے ہو کر پانی نوش فرمایا ہے۔ نیز آپ پانی پینے کے دوران تین مرتبہ سانس لیتے تھے' اور فرماتے تھے کہ اس سے سیرابی ہوتی ہے اور پانی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ اس سے شفایابی بھی حاصل ہوتی ہے۔

جامع ترمذی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا : "اونٹ کی طرح ایک ہی سانس میں پانی مت پیو بلکہ دو یا تین دفعہ کر کے پیو اور جب پیو تو بسم اللہ کہو اور جب پینے سے فارغ ہو جاؤ تو الحمد للہ کہو"۔

برتنوں کو ڈھانکنے کی ہدایت :

صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا "برتنوں کو ڈھانک دو پینے کے برتنوں کا منہ بند کر دو' کیوں کہ سال میں ایک ایسی بھی شب آتی ہے جب وباء نازل ہوتی ہے اور وہ کسی ایسے برتن کے پاس سے گذرتی ہے جس پر ڈھکنا نہ ہو یا پانی کے برتن کے پاس سے گذرتی ہے جو کھلا ہوا ہو تو یہ وباء اس میں گر پڑتی ہے"۔

اس حدیث کے ایک راوی لیث بن سعد کا بیان ہے کہ عجمی لوگ ہمارے یہاں سال میں ایک بار کانون الاول (دسمبر) کے ماہ میں ایک شب کو احتیاط کرتے ہیں۔ برتن کو ڈھانکنے سے متعلق ایک روایت صحیح میں منقول ہے کہ آپ نے برتن ڈھانک دینے کا حکم دیا اگرچہ ایک لکڑی کا تختہ ہی رکھ دیا جائے۔ برتن کو ڈھانکنے یا منہ بند کرتے ہوئے اللہ کا ذکر کرنے کا بھی حکم ہے نیز آپ نے کھڑے ہو کر منہ لگا کر پینے' برتن میں سانس لینے اور اس میں پھونکنے سے منع فرمایا ہے' اور پیالہ کے سوراخ سے بھی پینے کی ممانعت ہے۔

فصل (۹۰)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خوشبو کے استعمال میں اسوہ حسنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو پسند فرماتے تھے اور اسے ملنے پر واپس نہیں لوٹاتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ "جسے ریحان پیش کیا جائے وہ اسے واپس نہ کرے کیونکہ اس کی خوشبو اچھی اور اٹھانے میں سبک ہے"۔ ابوداؤد اور نسائی میں بجائے ریحان کے طیب "خوشبو" کے الفاظ مذکور ہیں۔

مسند بزار میں آپ سے مروی ہے کہ : "بے شک اللہ تعالیٰ پاکیزہ ہے اور پاکیزہ چیزوں کو پسند فرماتا ہے اور صاف ستھرا ہے اور صاف ستھری چیزوں کو پسند فرماتا ہے۔ کریم ہے اور کرم کو پسند فرماتا ہے۔ سخی ہے اور جود و سخاوت کو پسند فرماتا ہے۔ لہٰذا اپنے صحنوں اور گھروں کو صاف ستھرا رکھو یہود جیسے نہ بنو جو کوڑا کرکٹ گھروں میں جمع رکھتے ہیں"۔

خوشبو میں ایسی خاصیت ہے کہ اسے فرشتے پسند کرتے ہیں اور شیاطین اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی لئے پاکیزہ روحیں بھی خوشبو کو پسند کرتی ہیں اور خبیث روحیں بدبو کو پسند کرتی ہیں۔ ہر روح کو اپنی مناسب چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ ﴾

[النور : ٢٦]

پلید اور گندی عورتیں پلید اور گندے مردوں کے لئے ہیں۔ پلید مرد پلید عورتوں کے لئے ہیں۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں' اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اگرچہ تذکرہ مردوں اور عورتوں کا ہے لیکن یہ اصول تمام اعمال و اقوال' کھانے پینے' پہننے' اوڑھنے اور سونگھنے کی چیزوں پر مشتمل ہے۔ خواہ لفظ کو عام مان لیا جائے یا معنی میں وسعت دے دی جائے۔

فصل (۹۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلوں اور احکام میں اسوہ حسنہ

اس باب میں ہم عام قوانین کا ذکر نہیں کریں گے اگرچہ آپ کے مخصوص فیصلے بھی عام قانون ہی کی حیثیت رکھتے ہیں تاہم یہاں صرف وہ جزوی احکام بیان کئے جائیں گے جن کے ذریعہ آپ نے لوگوں کے درمیان فیصلے فرمائے ہیں اور اسی کے ضمن میں کچھ اصولی احکام و قضایا کا بھی ذکر کریں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہمت لگانے والے کو قید کی سزا دی ہے۔ حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے والد اور دادا کے واسطے سے روایت کی ہے کہ "ایک آدمی نے جان بوجھ کر اپنے غلام کو قتل کر دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سو کوڑے لگوائے' سال بھر کے لئے جلاوطن کر دیا' مزید حکم دیا کہ ایک غلام آزاد کرے لیکن قصاص نہیں لیا"۔

امام احمد نے حضرت سمرہ سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ "جو اپنے غلام کو قتل کرتا ہے ہم اسے قتل کی سزا دیتے ہیں"۔ اگر یہ حدیث محفوظ مان لی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ امام بطور تعزیر بوقت مصلحت ایسا کر سکتا ہے۔

ایک شخص کو آپ نے یہ حکم فرمایا کہ وہ اپنے قرضدار کو پکڑے رہے جیسا کہ ابو داؤد نے ذکر کیا ہے۔

ابو عبید نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قاتل کے قتل کا اور باندھنے والے کو باندھنے کا حکم فرمایا' یعنی اسے موت تک روکے رکھے۔

محدث عبدالرزاق نے مصنف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ بخیل کو تاحیات قید رکھا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عرینہ والوں کو قصاص میں یہ سزا دی کہ ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیئے اور آنکھوں میں سلائی ڈالی' کیوں کہ انہوں نے چرواہے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ پھر انہیں چھوڑ دیا گیا اور وہ بھوک پیاس سے مر گئے۔

صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے دوسرے پر دعویٰ کیا کہ اس نے اس کے بھائی کو قتل کیا ہے' چنانچہ مدعیٰ علیہ نے اقبال جرم کرلیا' تو آپ نے فرمایا کہ قاتل کو گرفتار کرلو۔ جب لوگ اس کو پکڑ کر لے جانے لگے تو آپ نے فرمایا کہ اگر اس نے اس کو قتل کردیا تو وہ بھی اسی کی طرح ہو جائے گا۔ چنانچہ اس شخص نے واپس آکر عرض کیا کہ میں نے آپ کے حکم ہی سے گرفتار کیا ہے' تو آپ نے فرمایا' کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ وہ تمہارے اور تمہارے ساتھی کے گناہوں کا ذمہ دار ہو؟ اس نے کہا' کیوں نہیں؟ پھر اسے چھوڑ دیا۔

مذکورہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "وہ بھی اسی طرح ہو جائے گا" اس کی تشریح دو طرح سے کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ جب قاتل سے قصاص لے لیا جائے گا' تو اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے اور اس طرح قاتل اور قصاص لینے والا ایک طرح کے ہو جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قصاص لینے والا قتل ہونے سے قبل قاتل کی طرح گناہ گار ہو جائے گا۔ آپ کا ارشاد یوں تھا "اگر قتل کرے تو اس جیسا ہوگا" اس سے قتل ہو جانے کے بعد کی مماثلت لازم آتی ہے۔ اس طرح حدیث میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ صاحب حق کو عفو و درگذر سے کام لینا چاہئے۔

ایک قول یہ ہے کہ اگر اس نے قتل کا ارادہ کئے بغیر قتل کردیا تو ایسی صورت میں بھی زیادتی میں دونوں یکساں ہوں گے۔ قاتل تو اپنے جرم کے سبب زیادتی کا مرتکب ہوگا اور انتقام لینے والا اس لئے زیادتی کا مرتکب ہوگا کہ اس نے جان بوجھ کر قتل نہ کرنے والے کو قتل کردیا۔

اس تشریح پر امام احمد کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے' جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اس میں وارد ہے کہ "یا رسول اللہ! میں نے اس کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولی سے فرمایا کہ : اگر وہ سچا ہے اور پھر تم نے اسے قتل کر دیا تو تم جہنم میں داخل ہوگے۔ یہ سن کر ولی نے قاتل کو چھوڑ دیا"۔

ایک یہودی نے ایک پڑوسی عورت کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر قتل کر ڈالا تھا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کا سر بھی اسی طرح توڑا جائے۔

اس سے مندرجہ ذیل چیزیں ثابت ہوتی ہیں :

عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل کیا جائے۔

مجرم کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جس میں وہ ماخوذ ہے۔

قتل کی سزا میں ولی کی اجازت کی ضرورت نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مقتول کے اولیاء کے حوالے نہیں کیا نہ ان سے یہ فرمایا کہ اگر چاہو تو اسے قتل کر دو' چاہو تو معاف کر دو' بلکہ اسے قتل کروایا۔ امام مالک کا یہی مسلک ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ آپ نے اس طرح سے قصاص عہد شکنی کی وجہ سے کیا تھا' تو یہ بات صحیح نہیں' کیوں کہ عہد شکنی کرنے والے کا سر پتھر سے کچلا نہیں جاتا بلکہ اس کا سر تلوار سے قلم کیا جاتا ہے۔

ایک عورت نے دوسری عورت پر سنگ باری کی نتیجتاً وہ ہلاک ہو گئی' اور اس کا بچہ جو ابھی پیٹ میں تھا' وہ بھی مر گیا۔ اس مقدمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ کے لئے تاوان کا حکم دیا' اور مقتولہ کی دیت قاتلہ کے عصبہ سے دلوائی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کے پیٹ میں بچہ کے قتل کے بدلہ میں ایک غلام یا ایک باندی کا فیصلہ فرمایا۔ پھر جس عورت کے خلاف آپ نے فیصلہ فرمایا تھا' وہ وفات پا گئی' تو آپ نے فرمایا کہ اس کی میراث اس کے لڑکوں اور شوہر کو ملے گی اور دیت کی ادائیگی عصبہ پر ہو گی۔

اس فیصلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل شبہ عمد میں قصاص نہیں ہے' اور عصبہ کے ذمہ دیت یا تاوان کی ادائیگی ہو گی' اور قاتلہ کے شوہر اور اولاد کے ذمہ دیت کی ادائیگی نہیں ہو گی۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے قتل کر دینے کا فیصلہ فرمایا جس نے اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کیا تھا' اور اس کے مال و متاع کو چھین لینے کا حکم دیا۔ امام احمد کا یہی مذہب ہے اور یہی صحیح ہے' لیکن ائمہ ثلاثہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسے شخص پر زانی کی حد جاری کی جائے گی' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ زیادہ برحق اور لائق اتباع ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ "اگر بغیر اجازت کوئی تمہیں جھانکے اور تم اس کی آنکھ پھوڑ ڈالو تو تم پر کوئی الزام نہیں" دوسری روایت میں ہے کہ "کوئی کسی کے گھر میں جھانکے اور وہ اس کی آنکھ پھوڑ ڈالے تو اس پر نہ دیت ہے نہ قصاص" یہ بغیر اجازت گھر میں جھانکنے والے کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ ایک ایسی لونڈی کے قتل کر دیئے جانے پر جو آپ کو

گالیاں دیتی تھی' اس کا خون رائیگاں فرمایا۔ اسی طرح یہودیوں کی جماعت کو ان کے گالیاں دینے اور ایذا رسائی کی وجہ سے آپ نے قتل کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ابو برزہ سے سب و شتم کرنے والے کو قتل کرنے کا ارادہ کرنے پر فرمایا " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو اس کا حق حاصل نہیں "۔ اس موضوع سے متعلق دس سے زیادہ صحیح اور حسن اور مشہور حدیثیں مروی ہیں۔

حضرت مجاہد نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ : جو مسلمان اللہ کو یا انبیاء میں سے کسی ایک کو سب و شتم کرتا ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر رہا ہے' یہ ارتداد ہے۔ اس سے توبہ کرائی جائے' اگر وہ رجوع کرے تو خیر' ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔ صحیحین میں مذکور ہے کہ آپ نے زہر دینے والے کو معاف کر دیا تھا۔ یہ بھی ثابت ہے کہ یہودیوں میں سے جس نے آپ پر سحر کیا' اسے آپ نے قتل نہیں کیا۔ اور حضرت عمر' حضرت حفصہ اور حضرت جندب رضی اللہ عنہم سے جادوگر کا قتل ثابت ہے۔

اسیران جنگ کے بارے میں آپ نے بعض لوگوں کے قتل کا حکم صادر فرمایا' اور بعض کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا' اور بعض کو احسان کرتے ہوئے ویسے ہی رہا کر دیا۔ اور بعض کو غلام بنا لیا' لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے کبھی کسی بالغ شخص کو غلام نہیں بنایا اور یہ احکام منسوخ نہیں ہوئے ہیں' حسب مصلحت امام المسلمین کو اس میں اختیار ہے۔

یہود کے ساتھ آپ کے متعدد قضایا اور فیصلے وابستہ ہیں۔ پہلے پہل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود مدینہ سے معاہدہ صلح و امن فرمایا' بعد میں بنی قینقاع سے جنگ فرمائی۔ آپ کامیاب ہوئے' اور از راہ احسان چھوڑ دیا۔ پھر بنو نضیر نے آپ سے (خلاف عہد) جنگ کی۔ آپ فتح یاب ہوئے اور انہیں جلاوطن فرما دیا۔ کچھ عرصہ بعد بنو قریظہ نے آپ سے جنگ کی' آپ کو فتح نصیب ہوئی' آپ نے ان کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ پھر خیبر کے یہود نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کی' آپ ان پر غالب ہوئے۔ آپ نے انہیں ارض خیبر میں بود و باش کی اجازت دے دی اور بعض کو قتل کی سزا دی۔

فصل (۹۲)

نبی کریم صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تقسیم غنائم سے متعلق فیصلہ اور طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہسوار کو تین حصے اور پیدل کو ایک حصہ دینے کا فیصلہ فرمایا' اور مقتول کا سارا ساز و سامان قاتل کو دینے کا حکم دیا۔

حضرت طلحہ اور حضرت سعید بن زید غزوہ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے' لیکن آپ نے ان دونوں کا بھی حصہ لگایا۔ انہوں نے عرض کیا' ہمیں اجر و ثواب بھی ملے گا؟ تو آپ نے فرمایا ہاں تمہیں اجر و ثواب بھی ملے گا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں' ان کی تیمارداری کی وجہ سے غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے' لیکن بایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بھی حصہ لگایا۔ انہوں نے عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا اجر؟ تو آپ نے فرمایا کہ تمہیں اجر و ثواب بھی ملے گا' اور آپ کے اس طرح کے عمل پر سارے علماء کا اتفاق ہے۔

ابن حبیب فرماتے ہیں کہ: اس طرح کی تقسیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھی۔ علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جنگ میں غیر حاضر رہنے والے کا حصہ نہیں لگایا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ: امام احمد اور امام مالک اور متقدمین اور متاخرین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ جب امام المسلمین فوجی مصلحت کی خاطر کسی شخص کو میدان جنگ کے علاوہ کسی دوسری جگہ بھیج دے' تو اس کا بھی حصہ لگایا جائے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول سے حاصل شدہ ساز و سامان پر خمس نہیں لگایا' بلکہ اسے اصل مال غنیمت قرار دیا ہے اور ایک شخص کی شہادت کی بنیاد پر اس کا فیصلہ فرما دیا ہے۔

فصل (۹۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہدایا و تحائف قبول کرنے کا طریقہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی خدمت میں ہدایا و تحائف پیش کیا کرتے تھے اور آپ قبول فرما لیتے تھے۔ بادشاہوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں ہدایا اور تحائف آتے تھے۔ آپ ان کے ہدایا قبول فرمالیا کرتے تھے اور اس کو اپنے اصحاب کے مابین تقسیم کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ ابوسفیان نے بھی آپ کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا اور آپ نے اسے قبول فرمالیا۔

ابو عبید نے ذکر کیا ہے کہ عامر بن مالک نے آپ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا لیکن آپ نے اسے واپس کر دیا اور فرمایا: ہم کسی مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ حالت شرک میں ابو سفیان کا ہدیہ آپ نے اس لئے قبول فرمایا تھا کہ اس زمانہ میں آپ کے اور اہل مکہ کے مابین معاہدہ و مصالحت تھی۔

اسی طرح مقوقس (حاکم مصر) کا ہدیہ بھی قبول فرمالیا تھا کیونکہ اس نے آپ کے قاصد حضرت حاطب کا بڑا اکرام کیا تھا اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے قبول اسلام سے مایوس نہیں کیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی برسرپیکار مشرک کا ہدیہ کبھی اور کسی زمانہ میں قبول نہیں فرمایا۔

امام سحنون کا قول ہے کہ: اگر رومی حاکم امام المسلمین کو ہدیہ و تحفہ پیش کرے تو اسے قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ ذاتی ہدیہ تصور کیا جائے گا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ اس ہدیہ میں سارے مسلمانوں کا حق ہوگا' اور بیت المال سے اس کے عوض میں ہدیہ دیا جائے گا۔ امام احمد کا قول ہے کہ اس کا حکم مال غنیمت کا ہے۔

فصل (۹۴)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اموال واملاک کے تقسیم کا طریقہ

اموال کی تین قسمیں ہیں :

مال زکاۃ وصدقات۔

مال غنیمت۔

مال فئی (بغیر لڑائی کے دشمنوں سے حاصل کردہ مال)۔

اموال زکاۃ اور غنیمت اور ان کے تقسیم کے طریقہ کار کا ذکر پہلے ہو چکا ہے' اور جیسا کہ پہلے واضح کر چکے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکاۃ کے آٹھوں صنفوں کو دینے کا التزام نہیں فرمایا ہے بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی صنف کو آپ نے دے دیا ہے۔

جہاں تک مال فئی کا تعلق ہے تو آپ نے غزوہ حنین کے دن اس میں سے مولفتہ القلوب کو دیا اور انصار کو کچھ نہیں دیا جس پر وہ لوگ قدرے ناراض ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا : "کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے کر واپس جائیں اور تم لوگ اپنے خیموں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر جاؤ۔ بخدا تم جس چیز کو لے کر لوٹو گے وہ ان کی چیزوں سے کہیں بہتر ہے"۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے آپ کی خدمت میں کچھ سونا بھیجا تو اسے آپ نے چار افراد کے درمیان تقسیم فرما دیا۔

سنن میں مذکور ہے کہ رشتہ داروں کا حصہ بنی مطلب اور بنی ہاشم کو دیا۔ بنی نوفل اور بنی عبد شمس کو چھوڑ دیا اور فرمایا کہ ہم اور بنی مطلب دور جاہلیت یا عہد اسلام میں کبھی الگ نہیں ہوئے ہم دونوں ایک ہیں اور اپنے دست مبارک کی انگلیوں کو ایک ساتھ ملا لیا۔ اور آپ نے ان کے اغنیاء و فقراء کے مابین برابر تقسیم نہیں کیا' اور نہ ہی تقسیم میراث کی طرح مرد کو عورت کا دوگنا دیا' بلکہ آپ نے حسب مصلحت اور لوگوں کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر عطا فرمایا۔ چنانچہ آپ نے اس مال سے غیر شادی شدہ کو دیا تاکہ وہ

شادی کر لے' اور قرضدار کو دیا تا کہ اپنا قرض ادا کر لے' اور فقیروں کو دیا تا کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر لیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور اسوہ حسنہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے خمس کے مصارف وہی رکھے جو کہ زکاۃ کے مصارف ہیں' اور ان مذکورہ مصارف اور اصناف کے علاوہ کہیں اور نہیں تقسیم فرماتے تھے اور نہ اسے میراث کی طرح تقسیم فرماتے تھے' آپ کے اسوہ حسنہ اور سیرت طیبہ کے مطالعہ کرنے والے اس سلسلہ میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں رکھتے۔

علماء کرام کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا مال فئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت ہوتا تھا' جس میں آپ آزادی سے جیسے چاہتے تصرف فرماتے تھے' یا آپ کی ملکیت نہیں ہوتا تھا۔

اس سلسلہ میں دو قول ہیں جو کہ امام احمد وغیرہ کے مذہب میں مذکور ہیں۔ آپ کے اسوہ و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس طرح تصرف فرماتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ آپ کو حکم فرماتا تھا' اور اس کی ہدایات کے مطابق تقسیم فرماتے تھے' اور اس میں اپنی مشیئت اور ارادے کو دخل نہیں دیتے تھے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا اختیار دیا تھا کہ رسالت کے ساتھ عبدیت کو پسند کرتے ہیں یا بادشاہیت کو چنانچہ آپ نے مقام عبدیت کو اختیار فرمالیا تھا۔

ان دونوں میں فرق اس طرح ہے کہ بندگی والا رسول اپنے مالک اور مرسل کے حکم و اجازت سے تصرف کرتا ہے اور بادشاہی والے رسول کو اختیار ہوتا ہے جس کو چاہے عطا کرے جس کو چاہے محروم کر دے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق جو کہ بادشاہ اور رسول دونوں تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

﴿ هَٰذَا عَطَآؤُنَا فَٱمۡنُنۡ أَوۡ أَمۡسِكۡ بِغَيۡرِ حِسَابٖ ﴾ [ص : ٣٩]

یہ ہمارا عطیہ ہے' آپ جسے چاہئے عطا کیجئے اور جسے چاہئے محروم کر دیجئے' ہم حساب نہ لیں گے۔

یعنی جس کو چاہئے دیجئے اور جس کو چاہئے نہ دیجئے ہم آپ سے حساب و کتاب نہ لیں گے۔ یہ مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے اسے چھوڑ کر اس سے اعلیٰ اور بلند مرتبہ اختیار فرمالیا جس کو ہم مقام عبودیت خالصہ جانتے ہیں اور یہ فرمایا کہ : "خدا کی قسم میں کسی کو نہ تو دیتا ہوں اور نہ کسی سے روکتا ہوں۔ صرف اسی کو دیتا ہوں' جس کو دینے کا حکم ملتا ہے"۔

اسی وجہ سے آپ اس مال سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا ایک سال کا خرچ لیتے تھے' اور باقی ماندہ سے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے فوجی ساز و سامان اور ہتھیاروں کا انتظام فرماتے تھے۔ اسی قسم کے اموال کے سلسلہ میں اختلافات پیدا ہوئے جو آج تک چل رہے ہیں۔

جہاں تک اموال زکاۃ' غنیمت' اور میراث کی تقسیم کا مسئلہ ہے تو ان کے مصارف متعین ہیں' جس میں کسی اور کی شرکت نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے حکام کو آپ کے بعد اس کی تقسیم میں وہ دشواری اور پریشانی نہیں پیش آئی جو مال فئی کی تقسیم میں پیدا ہوئی' اور مال فئی میں اختلاف ہی کی وجہ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے ترکہ سے طلب کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

﴿ مَّآ أَفَآءَ ٱللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ مِنْ أَهْلِ ٱلْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَـٰمَىٰ وَٱلْمَسَـٰكِينِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ كَىْ لَا يَكُونَ دُولَةًۢ بَيْنَ ٱلْأَغْنِيَآءِ مِنكُمْ ۚ وَمَآ ءَاتَىٰكُمُ ٱلرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَىٰكُمْ عَنْهُ فَٱنتَهُوا۟ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ ﴾ [الحشر : ۷]

جو کچھ اللہ اپنے رسول کو (دوسری) بستیوں والوں سے بطور فئی دلوا دے سو وہ اللہ ہی کا حق ہے اور رسول کا اور رسول کے عزیزوں کا' یتیموں کا اور مسکینوں کا اور مسافروں کا تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے قبضہ میں نہ آجائے تو رسول جو کچھ تمہیں دے دیا کریں' وہ لے لیا کرو اور جس سے روک دیں رک جایا کرو۔ اللہ سے ڈرو' بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ جو مال بطور فئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کو عطا فرمایا ہے اس کے وہ سارے لوگ مستحق ہیں جن کا ذکر ان آیات میں ہوا اور اس کا خمس مذکورہ لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس کو عام اور مطلق بیان کیا ہے تاکہ سب کو شامل ہو جائے چنانچہ یہ مصارف خاصہ یعنی خمس والوں پر اور مصارف عامہ یعنی مہاجرین و انصار اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں پر صرف کیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اور آپ کے بعد خلفاء راشدین کا عمل مذکورہ آیات کی تفسیر و تشریح سمجھی جائے گی۔ اسی بنا پر امام احمد کی روایت کے مطابق حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا تھا : اس مال کا کوئی بھی زیادہ مستحق نہیں ہے اور خود میں بھی کسی سے زیادہ اس کا حقدار نہیں ہوں اور مسلمانوں کے ہر

فرد کا اس میں حق ہے۔ سوائے غلام کے لیکن ہمارے حصے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف سے متعین ہوئے ہیں، جس کی تقسیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے فرمائی ہے۔ چنانچہ اسلام میں آدمی کی قربانی اور بہادری کا اعتبار ہو گا اور اس کی قدامت کا اعتبار ہو گا اس کی مالداری کا اعتبار ہو گا اور اس کی ضرورت کا اعتبار ہو گا بخدا اگر میں زندہ رہا تو صنعاء کی پہاڑی میں رہنے والے چرواہے کو بھی اس میں سے اس کا حصہ ملے گا۔

جن مسلمانوں کو فئی کی آیت کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے ان ہی مسلمانوں کا خمس کی آیت کے ذیل میں ذکر ہوا ہے لیکن مہاجرین اور انصار اور ان کے اتباع کو خمس کی آیت میں دخل نہیں کیونکہ وہ فئی کے مستحق بنائے گئے ہیں اور خمس پانے والوں کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک خمس کا خاص حصہ دوسرا فئی کا عام حصہ۔ اس طرح یہ دونوں حصوں میں دخل رکھتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فئی کو جن لوگوں میں تقسیم فرمایا، اس میں ان کی ضرورت منفعت قدامت اور قربانی وغیرہ کو مد نظر رکھا، اور اس کی تقسیم میں میراث، وصیت اور دوسری املاک کی تقسیم کا انداز و طریقہ کار نہیں اختیار فرمایا۔ اسی طرح مال خمس کو ان کے مستحقین میں تقسیم کیا جائے گا کیونکہ کتاب اللہ میں دونوں کا مصرف ایک ہی ہے چنانچہ خمس کو ان کے مستحقین کو دیا جائے گا اور فئی کو بھی صرف اسی کے حق داروں کو دیا جائے گا جس کا سورہ حشر کی آیت میں تذکرہ ہو چکا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خمس اور فئی کے مستحقین کو ایک ہی بتایا ہے، اور ان کو خاص اہمیت اور فوقیت دی ہے اور چونکہ مال غنیمت ان کے مستحقین کے ساتھ خاص ہے، اور دوسرے اس میں شریک نہیں ہو سکتے اس لئے خمس کو خمس کے مستحقین کے ساتھ مخصوص فرما دیا، اور مال فئی چونکہ خاص نہیں ہے اس کے مستحقین کے ساتھ ساتھ مہاجرین اور انصار اور انکے اتباع کو بھی اس میں حقدار قرار دے دیا ہے۔ اس طرح سے فئی اور خمس کے مصرف میں برابری ہو گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ذاتی حصہ اسلام کی مصالح میں خرچ کرتے تھے اور خمس کے پانچ حصوں میں سے چار حصے اس کے مستحقین میں حسب ضرورت و اہمیت تقسیم فرماتے تھے۔

فصل (۹۵)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایفائے عہد اور قاصدوں کے ساتھ معاملہ کا طریقہ

جب مسیلمہ کذاب کے قاصد آئے اور کہنے لگے ہم مسیلمہ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " اگر قاصد قتل کئے جاتے ہوتے تو میں تمہیں قتل کر دیتا"۔

یہ بھی ثابت ہے کہ جب قریش نے ابو رافع کو اپنا قاصد بنا کر آپ کے پاس بھیجا اور ابو رافع نے آپ ہی کے پاس رہ جانا چاہا اور قریش کے پاس واپس جانے سے انکار کر دیا تو آپ نے ان سے فرمایا :" میں عہد شکنی کرنا نہیں چاہتا اور نہ قاصدوں کو روک سکتا ہوں۔ (اب) تم اپنی قوم کے پاس واپس جاؤ اور اگر وہ بات (اسلام) جو اب تمہارے دل میں ہے قائم رہے تو واپس آجاؤ۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ معاہدہ حدیبیہ کی پابندی کرتے ہوئے آپ نے ابوجندل کو قریش کے حوالہ کر دیا تھا۔ لیکن جب عورتیں آئیں تو ان کے دینے سے آپ نے انکار کر دیا۔ چنانچہ جب ایک عورت سبیعہ اسلمی مسلمان ہو کر آئیں تو ان کا شوہر واپس لینے آیا اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی :

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا جَآءَكُمُ ٱلْمُؤْمِنَٰتُ مُهَٰجِرَٰتٍ فَٱمْتَحِنُوهُنَّ ٱللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَٰنِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى ٱلْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ وَءَاتُوهُم مَّآ أَنفَقُواْ ﴾ [الممتحنة : ۱۰]

مسلمانو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آجائیں تو تم ان کے ایمان کی جانچ کر لو (یوں تو) اللہ ان کے ایمان کو بہتر جانتا ہے' پس اگر تم ان کو مومن سمجھو تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو کیونکہ یہ عورتیں نہ ان کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ ان کے لئے حلال ہیں اور جو کچھ کافروں نے ان پر خرچ کیا ہے وہ ان کو ادا کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے قسم لی کہ صرف اسلام کی وجہ سے انہوں نے گھر چھوڑا ہے اور خاندان میں کسی جرم اور شوہر سے عداوت وغیرہ کی وجہ سے انہوں نے ہجرت نہیں کی ہے۔ ان باتوں پر انہوں نے قسم کھالی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شوہر کو ان کا مہر واپس کر دیا اور اس

خاتون کو واپس نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ﴾

[الأنفال: ۵۸]

اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو آپ (وہ عہد) ان کی طرف اسی طرح واپس کر دیں، بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جس شخص کا کسی قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو تو اس کی کوئی گرہ نہ کھولے اور نہ بند کرے یہاں تک کہ اس کی مدت پوری کر لے یا برابری میں اس معاہدہ کو ختم کر دے"۔ امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔ نیز آپ نے ارشاد فرمایا، "مسلمانوں کی جان برابر ہے، ان کے معاہدوں کی طرفداری ان کے ہر فرد پر ہے"۔

فصل (۹۶)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر مسلموں کو امان اور پناہ دینے میں اسوہ حسنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ان دو آدمیوں کو امان عطا فرمائی جنہیں آپ کی چچازاد بہن ام ہانی نے پناہ دی تھی۔

نیز آپ سے ثابت ہے کہ : "آپ نے ابوالعاص بن ربیع کو امان عطا فرمائی جب آپ کی صاحبزادی حضرت زینب نے انہیں پناہ دی تھی' اور فرمایا کہ مسلمانوں کا ادنیٰ آدمی پناہ دے سکتا ہے"۔ دوسری حدیث میں یہ اضافہ ہے "اور دور والا بھی ان کا شریک ہوگا"۔

یہ کل چار مسئلے ہیں : ان میں ایک یہ ہے کہ :

"مسلمان بحیثیت مجموعی ایک جسم کی طرح دوسروں کے مقابلہ میں متحد اور متفق ہیں" اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کو کسی طرح کا اہم عہدہ وغیرہ نہیں دیا جا سکتا۔

حدیث کے ان لفظوں "دور والا بھی ان کا شریک ہوگا" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمانوں کا لشکر اپنی طاقت و قوت کی وجہ سے فتحیاب ہو کر مال غنیمت حاصل کرے تو دوسرے دور پڑاؤ ڈالے ہوئے فوجیوں کو بھی اس میں حصہ ملے گا' کیونکہ اس میں ان کی بھی قربانیوں کا دخل ہے۔ اسی طرح فئی کا وہ مال جو بیت المال میں آئے گا' اس میں بھی دور والے فوجیوں کا حصہ لگایا جائے گا' اگرچہ وہ قریب والے فوجیوں کی فتوحات کی وجہ سے حاصل ہوا ہو۔

فصل (۹۷)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران اور ایلہ کے باشندوں سے جزیہ لیا جو نسلاً عرب اور مذہباً عیسائی تھے' اور اہل دومتہ الجندل سے جزیہ لیا جن میں اکثر عرب تھے' نیز مجوسیوں اور یمن کے یہودیوں سے بھی جزیہ قبول کیا لیکن عرب کے مشرکوں سے جزیہ لینا ثابت نہیں۔

امام احمد اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ جزیہ سوائے مذکورہ تین گروہوں کے کسی اور سے قبول نہیں کیا جاسکتا یعنی یہود' نصاریٰ' اور مجوس ان تین کے علاوہ جو لوگ ہیں ان سے یا اسلام قبول کیا جائے گا یا قتل کردئے جائیں گے۔

ایک دوسری جماعت کا قول ہے کہ جو قوم بھی جزیہ دے اسے قبول کرلیا جائے گا۔ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے اس لئے کہ قرآن کا حکم ہے۔ مجوس سے اس لئے کہ سنت سے ثابت ہے اور دوسری قوموں سے اس لئے کہ وہ بھی ان سے ملحق مانی جائیں گی' کیونکہ مجوسی مشرک ہیں۔ ان کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے اگر ان سے جزیہ لینا جائز ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمام مشرکوں سے خواہ وہ مجوسی ہوں یا کوئی اور' جزیہ قبول کرلیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے بت پرستوں سے جزیہ اس لئے نہیں لیا کہ وہ سب کے سب آیت جزیہ کے نزول سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔

بعض گروہوں کے کفر کا دوسرے گروہ کے مقابہ میں زیادہ سخت اور سنگین ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا' بلکہ بت پرستوں کا کفر اگر دیکھا جائے تو مجوسیوں کے مقابلہ میں ہلکا ہے اور غور کیجئے تو بت پرستوں اور آتش پرستوں کے درمیان فرق بھی کیا ہے' اور اگر ہے تو مجوسیوں کا کفر بت پرستوں کے مقابلہ میں زیادہ غلیظ اور سخت ہے۔ اور بت پرست توحید ربوبیت کا اقرار کرتے ہیں' وہ مانتے ہیں کہ خالق کائنات خدائے واحد کے سوا کوئی نہیں' وہ دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا تقرب الٰہی کے لئے کرتے ہیں' انہیں خالق کائنات

نہیں مانتے' نہ یہ مانتے ہیں کہ عالم کے دو خدا ہیں۔ ایک خالق خیر ہے' دوسرا خالق شر ہے' جیسا مجوسی عقیدہ رکھتے ہیں۔

اسی طرح نہ وہ ماؤں' بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ شادی جائز سمجھتے ہیں بلکہ وہ بقیہ دین ابراہیمی پر قائم ہیں' اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس صحیفے اور شریعت تھی' لیکن مجوسی ان کے پاس سرے سے کوئی آسمانی کتاب ہی نہیں' نہ وہ انبیاء میں سے کسی نبی کے دین کے پیروکار ہیں۔ ان کے عقائد و شرائع میں کوئی ایسا اثر نہین پایا جاتا جس سے معلوم ہو کہ ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب یا شریعت تھی جو اٹھالی گئی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ہجر اور دوسرے بادشاہوں کے پاس خطوط لکھ کر انہیں اسلام یا جزیہ کی دعوت دی۔ اس میں عرب اور غیر عرب کی کوئی تفریق نہیں فرمائی تھی۔

اب رہی جزیہ کی رقم کی مقدار اور تعداد تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو حکم فرمایا کہ "ہر بالغ سے ایک دینار یا اس کی قیمت کی یمنی چادر جزیہ میں لیں"۔

بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مقدار میں اضافہ کر کے چار دینار سونے والوں پر اور چالیس درہم چاندی والوں پر سالانہ مقرر کر دیا۔ یہ فرق یا اضافہ اس لئے ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل یمن کی معیشت کی کمزوری کا علم تھا' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اہل شام کی مالداری سے واقف تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے معاہدہ کو ختم کئے بغیر قریش کے ساتھ جنگ کو جائز قرار دیا' کیونکہ خود قریش نے عہد شکنی کرتے ہوئے اپنے ان حلیفوں کا ساتھ دیا جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیفوں پر حملہ کر دیا تھا اور ان پر ظلم و زیادتی کی تھی۔ ایسی صورت حال میں آپ نے ان کی مدد کرنے والے قریش کو جنگجو تصور کر کے معاہدہ توڑ دیا تھا اور ان سے جنگ آزما ہوئے تھے۔

فصل (۹۸)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح کے متعلق اسوہ حسنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی شدہ زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا : " نکاح کرو کیونکہ کثرت امت سے میں قوموں پر فخر کروں گا"۔ مزید فرمایا : " نکاح میری سنت ہے جو کوئی میری سنت سے اعراض کرے' وہ میری جماعت سے نہیں"۔

فرمایا : "اے نوجوانو! جو تم میں نکاح کر سکتا ہے' نکاح کرے' کیونکہ نکاح نظر اور نفس دونوں کو محفوظ رکھتا ہے اور جسے اس کی قدرت نہ ہو اسے چاہئے کہ وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ اس کے لئے ڈھال ہے" اور فرمایا : "دنیا سراسر عیش ہے اور دنیا کی سب سے بڑی عیش صالح بیوی ہے"۔

صحیحین میں ہے کہ "عورت سے شادی یا تو اس کے مال کی وجہ سے کی جاتی ہے' یا عزت و جاہ کی وجہ سے یا حسن و جمال کی وجہ سے یا دین کی وجہ سے' تم دیندار بیوی پا کر بازی لے جاؤ"۔

حدیث میں ہے کہ : " آپ سے سوال کیا گیا' سب سے بہترین عورت سی کون ہے؟ فرمایا "وہ جو اپنے شوہر کی نظر میں بھلی معلوم ہو۔ اس کے حکم کی تعمیل کرتی ہو' اور اپنے مال و نفس میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کرتی ہو"۔ آپ کا دستور تھا کہ اولاد پیدا کرنے والی عورتوں سے نکاح کرنے کی ترغیب دیتے۔ فرمایا : "محبت کرنے والی اور بچے پیدا کرنے والی عورتوں سے نکاح کرو"۔

عورت کی اجازت : یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شادی شدہ عورت کا نکاح باطل کر دیا تھا جس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف نکاح کر دیا تھا۔ سنن میں ہے کہ :

"ایک کنواری لڑکی کے باپ نے لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی کر دی' وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ نے اسے اختیار دے دیا کہ چاہے تو نکاح رکھے یا رد کر دے"۔

حدیث میں ہے کہ : "کنواری عورت کا نکاح بغیر اس کی اجازت کے نہ کیا جائے۔ اور اس کی اجازت خاموشی ہے"۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ : "یتیم لڑکی کا عقد اس کی مرضی کے بغیر نہ کیا جائے' اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد یتیمی کا اعتبار نہیں" اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یتیم لڑکی کا نکاح جائز ہے' اسی کا قرآن سے بھی پتہ چلتا ہے۔

ولی کی اجازت : سنن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ "جو عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر خود نکاح کرلے' اس کا نکاح باطل ہے"۔

صحیح حدیث میں ہے کہ : "ولی کے بغیر نکاح نہیں"۔ مزید فرمایا : "عورت خود اپنا نکاح نہ کرے کیونکہ زانی عورتیں اپنا نکاح خود کیا کرتی ہیں"۔ آپ کا ارشاد ہے "جب کسی عورت کا نکاح دو ولی کردیں تو پہلے ولی کے نکاح کا اعتبار ہوگا"۔

مہر کی تعین : ایک شخص نے بغیر مہر مقرر کیئے نکاح کرلیا اور خلوت سے پہلے ہی وفات پاگیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ عورت کو ہم عصر رشتہ دار عورتوں کے برابر مہر دیا جائے' اور میراث دی جائے' اور وہ خود چار مہینے دس دن عدت میں بیٹھے۔

ترمذی میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے دریافت فرمایا : کیا تم پسند کروگے کہ تمہاری شادی فلاں عورت سے کردوں؟ اس نے کہا۔ ہاں' پھر عورت سے پوچھا : کیا تم پسند کروگی کہ تجھے فلاں شخص سے بیاہ دوں؟ اس نے بھی رضامندی ظاہر کی' چنانچہ دونوں کا عقد آپ نے کردیا' اور دونوں میں خلوت بھی ہوئی' مگر چونکہ کوئی مہر مقرر نہ کیا گیا تھا' اور نہ مرد نے عورت کو کچھ دیا تھا' اس لئے جب اس کا وصال ہونے لگا تو آپ نے خیبر کے حصوں میں سے ایک حصہ عورت کو مہر کے عوض دے دیا۔

ان مذکورہ احادیث اور روایات سے مندرجہ ذیل احکام و مسائل کا علم ہوتا ہے :

۱۔ بغیر مہر مقرر کیئے ہوئے نکاح جائز ہے۔

۲۔ بغیر مہر مقرر کیئے ہوئے صحبت و خلوت جائز ہے۔

۳۔ مہر مثل کا تعین موت سے بھی ہوگا خواہ دخول ہو یا نہ ہو۔

۴۔ وفات کے بعد عدت میں بیٹھنا ضروری ہے خواہ دخول ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علماء عراق کا مسلک ہے۔

۵۔ طرفین کی جانب سے ایک ہی شخص ولی بن سکتا ہے اور صرف یہ کہنا کافی ہے کہ میں نے فلاں مرد کا فلاں عورت سے نکاح کر دیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار سے زائد بیویاں رکھنے والوں کو' جب وہ اسلام لے آئے' حکم فرمایا کہ ان میں سے صرف چار عورتوں کا انتخاب کر لیں اور بقیہ کو چھوڑ دیں۔ اسی طرح ایک شخص اسلام لایا اور اس کے تصرف میں دو بہنیں تھیں۔ اس سے آپ نے فرمایا کہ دونوں میں سے ایک کو جسے چاہو رکھ لو اور دوسری کو علیحدہ کر دو۔

ان دونوں روایتوں سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ حالت کفر و شرک کا نکاح صحیح ہے' اور مسلمان ہونے والے شخص کو اختیار ہے کہ ان بیویوں میں سے کسی کو بھی اختیار کر لے چاہے وہ پہلی ہو یا بعد کی ہو' اور یہی جمہور کا قول ہے۔

امام ترمذی نے حدیث کو ذکر کر کے حسن کہا ہے جس میں یہ ہے کہ : "جب کوئی غلام اپنے آقا کی مرضی کے بغیر شادی کر لے تو وہ بدکردار ہے"۔

«وَاللهُ أَعْلَمُ وَأَحْكَمُ وَالْحَمْدُ لله رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ»

من مطبوعات وزارة الشؤون الإسلامية
والأوقاف والدعوة والإرشاد
بالتعاون مع مؤسسة إبراهيم بن عبدالعزيز البراهيم الخيرية

تأليف

شيخ الإسلام

محمد بن عبد الوهاب

رحمه الله تعالى

ترجمه

سعید احمد قمر الزمان الندوی